Scanned and PDF by Qamar Abbas

وطن کی مٹی گواہ رہنا

طارق اسماعیل ساگر

Scanned & PDF By: Qamar Abbas
Email:qamarabbas277@gmail.com

Scanned and PDF by Qamar Abbas

پیش لفظ

یقین مانیں :

ہم آج اپنی ملی تاریخ کے نہایت حساس موڑ پر کھڑے ہیں۔

—— ایسے موڑ پر، جہاں ہم سے چند ہی قدموں پر موت کی دیوی اپنا دامن پھیلائے بڑی بیقراری سے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ: آخر ہم اس مقام تک کیسے پہنچے ؟

اس لیے کہ:

ہم نے یہ بات یکسر فراموش کر دی کہ ہمارے وطنِ عزیز —— پاکستان کو انگریزوں اور ہندوؤں نے ایک تھالی میں رکھ کر ہمیں پیش نہیں کیا تھا بلکہ اس کے حصول —— ہمارے ازلی دشمن نے ہم سے ہماری ہزاروں بہو بیٹیاں چھین لیں اور ہمارے لاکھوں مسلمان بھائیوں کو جامِ شہادت پلایا۔

اور —— سچی بات تو یہ ہے کہ:

وہ قوم جس نے ایک طویل اور اعصاب شکن لڑائی لڑ کر، یہ قطعۂ زمین حاصل کیا۔

—— وہ اس کی بقا کے لیے اپنے گھوڑوں کو ہر دم تیار اور اپنی تلواروں کو تیز رکھتی۔

بن —— اس کے برعکس :

ہم نے اپنی غیرت کو داؤ پر لگا دیا —— : اپنے ازلی دشمن کی طرف ہمیشہ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے۔

—— اپنے گھوڑوں کو عوامی اُمنگوں کے کچلنے میں مصروف رکھا اور اپنی تلواروں کو زنگ آلود ہونے کے لیے مستقل طور پر نیاموں میں بند کر دیا۔ —— کیا زندہ قوموں کا یہی شعار ہے؟

ہم نے سمجھا کہ شاید کسی وقت اقوام متحدہ کے ارباب بست و کشاد کے سامنے اپنا دامن پھیلانے سے ہم اُن کے دل پگھلا دیں۔ مگر —— یہ کیسے ممکن ہے کہ جس مُنہ کو ہمارے خون کی چاٹ لگی ہو، اُس کے نزدیک بھی ہماری التجائیں کبھی بار آور ثابت ہوں؟

○

"وطن کی مٹی! گواہ رہنا" میں اِنہی خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے —— قابل مصنف نے اپنی گزشتہ تحریروں کی طرح ایک مرتبہ پھر قوم کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے:

اُنہوں نے نہایت پُرکشش پیرائے میں سفّاک اور کینہ پرور دُشمن کے چہرے پر پڑے نقاب کو تھوڑا سا سرکا کر آپ کو ماضی قریب میں اُس کے رویّوں سے آگاہ کیا ہے اور —— حقیقت تو یہ ہے کہ ماضی قریب میں وطنِ عزیز کے دولخت ہونے کی داستان کو جس اچھوتے انداز میں اُنہوں نے پیش کیا، یہ یقیناً اُنہی کا حصّہ ہے۔

"را" کے کرداروں کو جس خوبی سے اُنہوں نے نوکِ قلم میں پرویا وہ تو قابلِ تحسین ہے ہی لیکن بطور "را" کی سرپرست، بھارت کی وزیرِ اعظم نے جو کردار ادا کیا اُس کی خبر بھی وہی پہلی بار ہمیں دے رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اس "کتاب" کو لکھ کر فاضل مصنف نے احمقوں کی جنت میں بسنے والوں کی آنکھوں سے پٹی اُتار کر اُنہیں تصویر کے ایسے رُخ سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے جو واضح بھی ہے اور بھیانک بھی۔

—— لیکن تصویر کا اصلی روپ یہی ہے!

مجھے یقین ہے کہ مصنف کی مساعی رنگ لائیں گی:

ہم صورتِ سحر سمجھ کر آگے قدم بڑھائیں گے، اس لیے کہ مومن ایک شُوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا ——

"وطن کی مٹی! گواہ رہنا" ایک کہانی بھی ہے اور وطنِ عزیز کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کا ایک پیام بھی —— یہ دراصل ایک شمع ہے جو راہوں کا تعین کرتی ہے۔

—— ایسی راہوں کا:

جہاں سے قافلے گزرتے ہیں اور آخر اپنی منزلوں تک جا پہنچتے ہیں۔

شیخ محمد احسن

مارچ ۱۹۸۶ء

Scanned and PDF

انتساب

میں اپنی یہ حقیر کاوش
مرحوم مقبول جہانگیر کے نام منسوب کرتا ہوں
جنہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔

ڈبل کراس

مسٹر خان! کل سے تین دنوں میں کسی بھی روز تمہیں پھانسی دے دی جائے گی!!
مجھے افسوس ہے لیکن یہ سب کچھ تمہاری ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔" ایسا ایک روز ہونا ہی تھا۔۔۔ جیل سپرنٹنڈنٹ ڈوبے نے جذبات سے عاری لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

رات کو اُس کی جیل میں آمد کوئی نئی بات تو نہیں تھی لیکن اس طرح اچانک پھانسی کوٹھڑیوں کی طرف وہ کسی خاص مقصد ہی سے آیا کرتا تھا۔ چکر حوالدار اور دیگر عملہ اُس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا یہاں تک آیا تھا اور اب سب دست بستہ صاحب دان اُس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ اُن کی نظریں سپرنٹنڈنٹ ڈوبے کی خان پر جمی تھیں۔ جس کے ہونٹ ڈوبے پر نظر پڑتے ہی پھیل گئے تھے اور اُس کی مسکراہٹ جوں کی توں برقرار تھی۔ حالانکہ اُن کے خیال میں ابھی تک خان کو خوش کیا کر دینا چاہیئے تھا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی آہنی چٹان کی طرح اُن کے سامنے ڈٹ کر کھڑا اُن کے عزائم کا تمسخر اُڑا رہا تھا۔

"آپ کا شکریہ ڈوبے صاحب۔ میں بھی روز روز کی بک بک سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ سلسلہ ختم ہی ہو جانا چاہیئے۔ آپ لوگوں کو کبھی میری بے گناہی کا یقین نہیں آئے گا۔ پھانسی تو ایک روز ہونی ہی ہے۔۔۔"

ڈوبے اس کے برجستہ جواب سے تلملا کر رہ گیا۔

"خان تم ابھی بچے ہو! تم نے مرنے کی صرف باتیں سُنی ہیں کسی کو مرتے دیکھا نہیں خصوصاً پھانسی کے کسی مجرم کو ـــــ بڑی اذیت ناک موت ہوتی ہے۔ بڑی دیر میں تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر جان نکلتی ہے اکثر مجرم تو تین تین گھنٹے تک لٹکے رہتے ہیں سولی پر۔ یہ جو تم چوک رہے ہے اس غبارے کی ہوا بس اب نکلنے ہی والی ہے....." اُسے باقاعدہ غصہ آگیا تھا۔ اُس کی توقعات کے برعکس خان ابھی تک اپنے قدموں پر جو کھڑا تھا۔

"مسٹر دوبے! اگر تم اپنے ان پالتو کتوں کے سامنے ذلیل نہیں ہونا چاہتے تو یہاں سے دفع ہو جاؤ ـــــ اور اپنے اُن آقاؤں کو جن کے اشارے پہ تم دم ہلاتے ہوئے یہاں چلے آئے ہو جا کر صرف یہ بتا دو کہ خان مر جائے گا مگر اُس کا بیان نہیں بدلے گا۔ ـــــ نہیں بدلے گا۔ خواہ مخواہ وہ لوگ تمہاری بھی رات کی نیندیں حرام کر رہے ہیں! پچھلے آٹھ ماہ تک مجھے مسلسل ذہنی اور روحانی عذاب دے کر بھی وہ لوگ مجھ سے منہ مانگا سکے تو اب کیا لے لیں گے وہ مجھ سے ـــــ؟ اول تو میں "پاک سپائی" ہوں ہی نہیں اور ـــــ اگر ہوں بھی تو اُن سے کہہ دینا کہ وہ مجھ سے مزید آٹھ سال بلکہ آٹھ صدیوں تک کچھ نہیں اگلوا سکتے ـــــ کچھ نہیں....." اُس کے ہونٹ غصے سے کپکپا رہے تھے اور جبڑوں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔

دوبے جیل ڈیپارٹمنٹ میں حوالدار سے ترقی کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچا تھا۔ وہ بھارتی جیلوں کا مانا ہوا افسر تھا۔ بڑے بڑے بدمعاش اس کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ جس جیل میں غنڈہ گردی کا خطرہ ہوتا حکومت اُس کا تبادلہ اُسی جیل میں کر دیا کرتی تھی۔ اُس نے زندگی میں ہارنا تو کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن اس پچیس چھبیس سال کے "پاکستانی جاسوس" نے اُسے اپنے نظریات بدلنے پر مجبور کر دیا تھا ـــــ وہ مسلسل آٹھ مہینے "ٹارچر سنٹروں" میں تفتیش کاٹنے

کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ اُس کی آمد سے ایک روز پہلے ہی "سی آئی بی" کے تین اعلیٰ افسروں نے جیل کے سامنے اُس کا مکمل کچا چٹھا جو صرف اُن کی "اطلاعات" کی حد تک تھا، بیان کر چکے تھے اور یہ بھی بتا چکے تھے کہ وہ "ان اطلاعات" میں سے کسی ایک کی بھی تصدیق اُس کی زبانی نہیں کروا سکے۔

انہوں نے دوبے کو بطور خاص یہ بات سمجھا دی تھی کہ یہ چھوکرہ، بک کر بیٹھنے والا نہیں اگر اُسے ذرا سی بھی سہولت مل گئی تو وہ اپنی سی کر گزرے گا۔

"نندن صاحب!" ـــــ خان کے "کیس انچارج" کی بات پر دوبے نے قہقہہ لگا کر خان کی تصویر پر بڑی حقارت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا ـــــ "میں نے بڑے بڑے "خاص" سیدھے کر دیے: یہ دو ٹکے کا "ملا" اس کی مجال ہی کیا ہے کہ ایک جھٹکا بھی برداشت کر سکے ـــــ جیل کی مار بڑی بُری شے ہے۔ بڑے بڑوں کے کس بل نکل جاتے ہیں، یہ تو اناڑی ہے!" ـــــ

نندن نے بے یقینی کی سی کیفیت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "دوبے صاحب! اگر آپ ہماری کوئی بھی مدد کر سکیں تو یہ سرکار کی بڑی مہان خدمت ہو گی۔"

○

اگلے روز پولیس گارد کی سخت نگرانی میں جب آٹھ ماہ کی چیرہ دستیوں کا شکار خان اس کمرے میں پہنچا تو اس ادھ موئے انسان پر ایک نظر حقارت ڈال کر دوبے نے بڑے غصے سے کہا۔ "میں ہے وہ سورما ـــــ ابھی دیکھتا ہوں سالے کو ـــــ"

لمحہ بھر تو اپنی ترنگ میں جو بھی میں آیا وہ کہہ گیا لیکن جواب میں خان نے مکمل طور پر خاموش اختیار کیے رکھا۔ اُس نے دوبے کو تو پاگل ہی کر دیا تھا ـــــ وہ وحشی درندوں کی طرح اُس وقت اُس پر پیدیر ساتا رہا جب تک کہ اس کے بازو شل نہ ہو گئے۔ ہر ضرب پر اُس کو نئی گالی سے نوازا جاتا ـــــ اور آخر بے بس ہو کر اُس نے

Scanned and PDF by Qamar Abbas

"پھر حوالدار" منگا مل کو بلایا اور حکم دیا۔

"لے جاؤ اس لونڈے کو اور اس کا دماغ ٹھیک کر کے میرے سامنے پیش کرو۔"

منگا مل اُسے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گھسیٹتا ہوا "چکر" میں لے گیا ——

ڈیوڑھی سے خان کے "پھانسی کوٹھڑی" میں پہنچنے تک اُسے تین "پھینٹیاں" مل چکی تھیں، لیکن منگا مل چکرا کر ہی تو رہ گیا۔

"بھگوان جانے یہ شخص کس مٹی کا بنا ہے مہاراج جی!" اُس نے تن کر سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے ڈوبے کے سامنے اپنی بے بسی ظاہر کرتے ہوئے کہا "ہم نے اس کے منہ پر گندگی مل کر، ہاتھ پیر باندھ کر کوٹھڑی میں پھینک دیا ہے ——"

اُس نے اپنی کارروائی سے اپنے افسر اعلیٰ کو مطلع کیا۔

"دفع ہو جاؤ! ——" اُس نے غصّے سے مٹھیاں بھینچیں۔ "گئے تم سے ایک معمولی مسلمان کو چکرا قابو نہیں آرہا —— جاؤ اور ریٹائرمنٹ لے کر کوئی مندر سنبھال لو پنڈت جی!" غصّے سے کھولتے ہوئے اس نے پنڈت منگا مل چکر حوالدار کو حکم دیا: "اُسے کھول کر ڈنڈا بیڑی لگا دو ——"

آٹھ دن تک تو خان کو اُن لوگوں نے "ڈنڈا بیڑی" لگا کر بند کر رکھا تھا۔ یہ اُن کے نزدیک جیل کی سخت ترین سزا تھی۔ لیکن کیا مجال جو اُس کے پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغزش آئی ہو۔

آٹھویں دن جب روایت کے مطابق "صاحب کا دورہ" آیا تو پھانسی کوٹھڑیوں میں بند سکھ قیدیوں نے سوال اٹھایا کہ اگر خان کی بیڑی نہ کھولی گئی تو وہ بھوک ہڑتال کر دیں گے

کم از کم اس "حساس" احاطے میں انہوں نے انسانی درندگی اور بربریت کا اس سے زیادہ بدترین مظاہرہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اور سپرنٹنڈنٹ کے لیے یہ کوئی "معمولی" ذمّہ نہ تھی۔ یوں بھی وہ آٹھ دن سے زیادہ مسلسل بیڑی لگا بھی نہیں سکتا تھا! اُس نے انہی قدموں پر کھڑے کھڑے پنڈت منگا مل کو حکم دیا کہ وہ خان کا ڈنڈا بیڑی اُتار کر اُسے ہتھ بیڑی پہنا دے!!

خود اُس نے خان والی کوٹھڑی کے سامنے رُکنے کی ہمت بھی نہیں کی تھی اور جوتوں سے اپنا راؤنڈ مکمل کر کے "پھانسی احاطے" سے باہر نکل گیا تھا۔

○

چکر حوالدار منگا مل جب اپنے ساتھ مشقتی "لوہار پنجے" والے کو لے کر اس کی بیڑیاں اُتارنے آیا تو خان کے ہونٹوں پر ہمیشہ جیسی طنزیہ مسکراہٹ حسب معمول چپکی ہوئی تھی۔

"بس....." اُس نے حوالدار کا تمسخر اُڑایا۔

خان کے منہ سے نکلے صرف ایک لفظ نے ہی اُس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی! اس طرح تو کبھی بڑے سے بڑے بدمعاش نے بھی اُس کا مضحکہ نہیں اُڑایا تھا۔ منگا مل چکا کھڑا رہا۔ وہ "پرانا ملازم" تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ معاملہ اس سے کس آگے جا سکتا ہے۔ جب کوئی قیدی اپنی سی کرنے پر آجائے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ خان کی نہ صرف بیڑی بدلی گئی بلکہ پھانسی احاطے میں بند سزائے موت کے قیدیوں کی دھمکی پر جو اب خان کو "ہیرو" کا درجہ دینے لگے تھے جیل حکام کو خان کے لیے جیل نے سپیشل ڈائیٹ منگوانی پڑی۔

○

پہلی مرتبہ وہ آج خان کے روبرو کھڑا ہو کر رات کی تاریکی میں اُس سے ٹکرا تھا۔ اُس نے یہ ڈرامہ انتظامی جنس "حکام" کی ہدایت پر کھیلا تھا لیکن اب ندامت سے اُسے اپنی نسبی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ بڑی تیزی سے بغیر کچھ کہے سنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے دفتر میں آ گیا تھا۔
سے اُس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ رات کے گیارہ بج چلے تھے اور ساری جیل پر
موت کا سناٹا طاری تھا۔ کچھ سوچ کر اُس نے فون اٹھایا اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ
افسر ٹنڈن کا نمبر ڈائل کیا۔

ٹنڈن پچھلے اٹھائیس گھنٹے سے ایک خصوصی کیس کے سلسلے میں مسلسل جاگ رہا تھا اور ابھی اُس کی آنکھ لگے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اچانک گھنٹی کی کرخت آواز نے اُسے نیند سے بیدار کر دیا! پہلے تو اُسے کچھ سمجھ ہی نہ آئی، آنکھوں میں گھس آنے والی تیز جلن نے اُس کا دماغ ماؤف کر دیا اور جب وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو اُس کا جی چاہا کہ فون اٹھا کر دیوار سے دے مارے لیکن سوچ کر کہ کہیں کسی بڑے افسر کا نہ ہو، وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

"ہیلو ــــ" وہ فون کان سے لگاتے ہی دھاڑا۔

"میں دُوبے بول رہا ہوں ــــ" دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز اتنی اُونچی تھی کہ ٹنڈن کو بالکل لاشعوری طور فون کو کان سے پرے کرنا پڑا۔

"کیا بات ہے ــــ اتنی رات گئے کیا مصیبت آ گئی ؟" اُس نے پہاڑ کھانے والے لہجے میں دُوبے کو جواب دیا۔

"بات وات کچھ نہیں ــــ تم سب لوگ جاؤ جہنم میں۔ میں تمہارا ماتحت نہیں کہ تمہارے اشاروں پر ناچتا رہوں۔ سمجھے تم....."

اُس کے انداز تخاطب اور باتوں نے ٹنڈن کو پاگل ہی تو کر دیا تھا ــــ "شٹ اپ" چلا کر اُس نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

دوسری طرف دُوبے نے بھی اُسے باقاعدہ گالیوں سے نوازتے ہوئے اپنا فون بند کر دیا تھا۔

Scanned by CamScanner

رات وقت کے سینے پر پاؤں دھرتی ہولے ہولے اپنے انجام کی طرف رینگ رہی تھی۔ بادلوں کے وہ منتشر ٹکڑے جنہوں نے سرِشام ہی آسمان کو ڈھکنا شروع کر دیا تھا اب اجتماعی شکل میں چاند کے گرداگرد آہنی فصیل کی طرح تن گئے تھے۔ ایک زوردار دھاڑا چانک ہی آسمان کے سینے سے بلند ہوئی اور ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ جلد ہی ان بوندوں نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی ــــ بوڑھا آسمان شاید پھانسی کوٹھڑیوں میں بند اس جواں مرد کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہا تھا، یا پھر اُس سے خان کی یہ بے بسی دیکھی نہ گئی اور اب وہ گرج گرج اور برس برس کر اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہا تھا۔

خان اپنی کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے سے آن لگا تھا۔ اُس کے سامنے مختصر سے احاطے پر موسلا دھار بارش کا رقص اُسے خاصی لطافت فراہم کر رہا تھا:

"وہ بھی تو ایک ایسی ہی رات تھی جب آج سے قریباً اڑھائی سال پہلے اُس نے موت کی اس طویل اور اندھی شاہراہ پر پہلا قدم رکھا تھا۔"

اپنی ٹریننگ کے خاتمے پر جب وہ پہلی مرتبہ اہم مشن پر روانہ ہو رہا تھا تو اُس بوڑھے صوبیدار میجر نے جو اُس کا انسٹرکٹر بھی تھا اُسے کہا تھا۔

"بیٹا! اصل میں ایک ہی بات یاد رکھنا چاہیے۔"

"وہ کیا سر؟" نجانے اُس نے کیوں خلافِ اصول اُس سے یہ سوال کیا۔

"دیکھو بچے! یہ جسم تو ہے نا ــــ یہ کچھ بھی نہیں، کچھ حیثیت نہیں اس کی۔ رہنے والی چیز تو روح ہے بچے! اگر زندگی میں کبھی دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو کبھی اولیت نہ دینا۔ اس پر لگے داغ اور اذیت تمام نشانات کبھی نہ کبھی اپنی موت مر جاتے ہیں۔ لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ

Scanned and Proofed by Qamar Abbas

ہے۔ بالکل جُدا ـــــ اُسے کبھی وفادار نہ ہونے دینا ورنہ ساری زندگی جہنم کا ایندھن بنے رہو گے۔ کیونکہ تمہارا ضمیر خوش قسمتی سے زندہ ہے۔"

بوڑھے صوبیدار میجر نے کتنے آسان لفظوں میں عابد خان کو یہ نقطہ سمجھا دیا تھا ـــــ اور اُس نے کبھی اپنے انسٹرکٹر کی اس بات کو نہ بھلایا۔

○

دونوں سویلین لباس ہی میں اُس سرحدی اسٹیشن تک آئے تھے ـــــ اُن کے ساتھ یہاں بمشکل آٹھ دس سواریاں اُتری تھیں۔

بوڑھے انسٹرکٹر نے اسٹیشن کے ایک کونے میں لگے نل پر منہ ہاتھ دھونے کے بہانے اُس وقت تک انتظار کیا جب تک تمام سولریوں نے اپنا راستہ نہ ناپ لیا۔

"آؤ چلیں ـــــ" اُس نے اپنی بوڑھی اور جہاندیدہ نظروں سے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اُسے مخاطب کیا۔

دونوں ریلوے لائن عبور کر کے شہر کی متضاد سمت میں چلنے لگے۔ بوڑھا انسٹرکٹر اُسے دو تین میل کھیتوں کے بیچوں بیچ پیدل چلاتا اُس ڈاک بنگلے تک لے آیا جو اُنہی مقاصد کے لیے عموماً زیرِ رہتا تھا۔

ڈاک بنگلے پر اُن کا استقبال ایک درمیانی عمر کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک کرنل نے کیا۔ صوبیدار کی دونوں ایڑیاں کسی میکانکی عمل کے تحت اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی آپس میں جُڑ گئی تھیں۔

"کم آن مائی بوائے! ویل کم ٹو یو ـــــ" انہوں نے گرم جوشی سے پہلے عابد خان سے مصافحہ کیا پھر اُسے گلے لگا کر اس کی کمر پر تھپکی دے کر خود سے الگ کرتے

"کیسا لگتا ہے صوبیدار صاحب! ٹھیک ہے نا؟"

"ایک دم ٹھیک ہے سر!" ـــــ صوبیدار کی ایڑیاں پھر آپس میں مل گئیں۔

"ویل ڈن ـــــ ویل ڈن" ـــــ انہوں نے عابد خان کے بازوؤں کی مچھلیاں ٹٹولتے ہوئے صوبیدار کو شاباش دی۔

جب وہ کرنل صاحب کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو صوبیدار باہر ہی رک گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں رکھے میز پر ایک نقشہ پہلے سے بچھا تھا اور چھت سے لٹکتے بلب کی زرد روشنی دن کے وقت بڑے عجیب اور بے ڈھنگے طریقے سے اس کا احاطہ کر رہی تھی۔ سالوں پہلے کے تعمیر شدہ ڈاک بنگلے کی اُونچی چھت اور کمرے کے ماحول کا جائزہ عابد خان نے اپنی ٹریننگ کے مطابق اندر داخل ہوتے ہی لے لیا تھا۔

کرنل صاحب نے اُسے ایک کونے میں بڑے سلیقے سے سجائے گئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُن کے کمرے میں داخل ہونے کے چند ہی منٹ بعد ایک باوردی بیرا چائے کے برتن بڑے سلیقے سے سجا کر لے آیا تھا۔ چائے نوشی کے دوران کرنل اُس سے بڑے دوستانہ ماحول میں بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ عابد خان کو امید تھی کہ وہ اُس کی ٹریننگ سے متعلق سوالات کر کے اس کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہر ملاقات پر یہی ہوا تھا۔ لیکن آج خلافِ توقع کرنل نے اس موضوع کو بالکل نہیں چھیڑا تھا۔

"آپ نے مسٹر اذکار پوری! چائے کا دور ختم ہوتے ہی انہوں نے خان کو اُس کی شناخت سے مخاطب کیا ـــــ "اب کچھ باتیں آپ کے کام سے متعلق بھی ہو جائیں۔"

دونوں نے اسی میز کا ایک ایک کونہ سنبھال لیا تھا جس پر بچھے ایک بڑے سے نیلے رنگ کے نقشے پر مختلف جگہ سُرخ پنسل سے دائرے لگائے گئے تھے۔

Scanned and PDF by Qamar Abbas

وہ بڑی تیزی سے بغیر کچھ کہے سنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے دفتر میں آگیا۔ غصے سے اُس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ رات کے گیارہ بج چلے تھے اور ساری جیل پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ کچھ سوچ کر اُس نے فون اٹھایا اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر ٹنڈن کا نمبر ڈائل کیا۔

ٹنڈن پچھلے اٹھائیس گھنٹے سے ایک خصوصی کیس کے سلسلے میں مسلسل جاگ رہا تھا اور ابھی اُس کی آنکھ لگے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اچانک گھنٹی کی کرخت آواز نے اُسے نیند سے بیدار کر دیا! پہلے تو اُسے کچھ سمجھ ہی نہ آئی، آنکھوں میں گھس آنے والی تیز جلن نے اُس کا دماغ ماؤف کر دیا اور جب وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہُوا تو اُس کا جی چاہا کہ فون اٹھا کر دیوار سے دے مارے لیکن سوچ کر کہ کہیں کسی بڑے افسر کا نہ ہو، وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

"ہیلو ــــ" وہ فون کان سے لگاتے ہی دھاڑا۔

"مَیں دُوبے بول رہا ہُوں" ــــ دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز اتنی اُونچی تھی کہ ٹنڈن کو بالکل لاشعوری طور فون کو کان سے پرے کرنا پڑا۔

"کیا بات ہے ــــ اتنی رات گئے کیا مصیبت آگئی ہے؟" اُس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں دُوبے کو جواب دیا۔

"بات وات کچھ نہیں ــــ تم سب لوگ جاؤ جہنم میں۔ مَیں تمہارا ماتحت نہیں کہ تمہارے اشاروں پر ناچتا رہوں۔ سمجھے تم....."

اُس کے انداز تخاطب اور باتوں نے ٹنڈن کو پاگل ہی تو کر دیا تھا ــــ "شٹ اپ" چلا کر اُس نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

دوسری طرف دُوبے نے بھی اُسے باقاعدہ گالیوں سے نوازتے ہُوئے اپنا فون بند کر دیا تھا۔

رات وقت کے سینے پر پاؤں دھرتی ہولے ہولے اپنے انجام کی طرف رینگ رہی تھی۔ بادلوں کے وہ منتشر ٹکڑے جنہوں نے سرِشام ہی آسمان کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا اب اجتماعی شکل میں چاند کے گرداگرد آہنی فصیل کی طرح تن گئے تھے۔ ایک زوردار دھماکا چانک ہی آسمان کے سینے سے بلند ہوئی اور ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ جلد ہی ان بوندوں نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی ــــ بوڑھا آسمان شاید پھانسی کو ٹھٹھریوں میں بند اس جواں مرد کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہا تھا، یا پھر اُس سے خان کی یہ بے بسی دیکھی نہ گئی اور اب وہ گرج گرج اور برس برس کر اپنے غم و غصے کا اظہار کر رہا تھا۔

خان اپنی کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے سے آن لگا تھا۔ اُس کے سامنے فقط سے احاطے پر موسلا دھار بارش کا رقص اُسے خاصی لطافت فراہم کر رہا تھا:

"وہ بھی تو ایک ایسی ہی رات تھی جب آج سے قریباً اڑھائی سال پہلے اُس نے موت کی اس طویل اور اندھی شاہراہ پر پہلا قدم رکھا تھا۔"

اپنی ٹریننگ کے خاتمے پر جب وہ پہلی مرتبہ اہم مشن پر روانہ ہو رہا تھا تو اُس بوڑھے صوبیدار میجر نے جو اُس کا انسٹرکٹر بھی تھا اُسے کہا تھا۔

"بیٹا! اصل میں ایک ہی بات یاد رکھنا چاہیے۔"

"وہ کیا سر؟" نجانے اُس نے کیوں خلاف اصول اُس سے یہ سوال کیا۔

"دیکھو بچے! یہ جسم جو ہے نا ــــ یہ کچھ بھی نہیں، کچھ حیثیت نہیں اس کی۔ مرنے والی چیز تو روح ہے بچے! اگر زندگی میں کبھی دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو کبھی اولیت نہ دینا۔ اس پر لگے داغ اور اذیت ناک تجربات کبھی نہ کبھی اپنی موت مر جاتے ہیں۔ لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ

Scanned and PDF by Qamar Abbas

ہے۔ بالکل جُدا ـــــ اُسے کبھی وفادار نہ ہونے دینا ورنہ ساری زندگی جہنم بنی رہو گے۔ کیونکہ تمہارا ضمیر خوش قسمتی سے زندہ ہے۔"

بوڑھے صوبیدار میجر نے کتنے آسان لفظوں میں عابد خان کو یہ نقطہ سمجھا دیا تھا ـــــ اور اُس نے کبھی اپنے انسٹرکٹر کی اس بات کو نہ بھلایا۔

○

دونوں سویلین لباس ہی میں اُس سرحدی اسٹیشن تک آئے تھے ـــــ اُن کے ساتھ یہاں بمشکل آٹھ دس سواریاں اُتری تھیں۔

بوڑھے انسٹرکٹر نے اسٹیشن کے ایک کونے میں لگے نل پر منہ ہاتھ دھونے کے بہانے اُس وقت تک انتظار کیا جب تک تمام سواریوں نے اپنا راستہ نہ ناپ لیا۔

"آؤ چلیں ـــــ" اُس نے اپنی بوڑھی اور جہاندیدہ نظروں سے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اُسے مخاطب کیا۔

دونوں ریلوے لائن عبور کر کے شہر کی متضاد سمت میں چلنے لگے۔ بوڑھا انسٹرکٹر اُسے دو تین میل کھیتوں کے بیچوں بیچ پیدل چلاتا اُس "ڈاک بنگلے" تک لے آیا جو انہی مقاصد کے لیے ہمہ وقت زیرِ استعمال رہتا تھا۔

ڈاک بنگلے پر اُن کا استقبال ایک درمیانی عمر کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک کرنل نے کیا۔ صوبیدار کی دونوں ایڑیاں کسی میکانکی عمل کے تحت اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی آپس میں جُڑ گئی تھیں۔

"کم آن مائی بوائے! ویل کم ٹو یو ـــــ" انہوں نے گرم جوشی سے پہلے عابد خان سے مصافحہ کیا پھر اُسے گلے لگا کر اس کی کمر پر تھپکی دے کر خود سے الگ کرتے

"کیسا پٹھا ہے صوبیدار صاحب! ٹھیک ہے نا؟"

"ایک دم ٹھیک ہے سر!" ـــــ صوبیدار کی ایڑیاں پھر آپس میں مِل گئیں۔

"ویل ڈن ـــــ ویل ڈن" ـــــ انہوں نے عابد خان کے بازوؤں کی مچھلیاں ٹٹولتے ہوئے صوبیدار کو شاباش دی۔

جب وہ کرنل صاحب کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو صوبیدار باہر ہی رک گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں رکھے میز پر ایک نقشہ پہلے سے بچھا تھا اور چھت سے لٹکتے بلب کی زرد روشنی دن کے وقت بڑے عجیب اور بے ڈھنگے طریقے سے اس کا احاطہ کر رہی تھی۔ سالوں پہلے کے تعمیر شدہ ڈاک بنگلے کی اُونچی چھت اور کمرے کے ماحول کا جائزہ عابد خان نے اپنی ٹریننگ کے مطابق اندر داخل ہوتے ہی لے لیا تھا۔

کرنل صاحب نے اُسے ایک کونے میں بڑے سلیقے سے سجائے گئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُن کے کمرے میں داخل ہونے کے چند ہی منٹ بعد ایک مؤدب بیرا چائے کے برتن بڑے سلیقے سے سجا کر لے آیا تھا۔ چائے نوشی کے دوران کرنل اُس سے بڑے دوستانہ ماحول میں بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ عابد کو تو یہ اُمید تھی کہ وہ اُس کی ٹریننگ سے متعلق سوالات کر کے اس کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہر ملاقات پر یہی ہوا تھا۔ لیکن آج خلافِ توقع انہوں نے اس موضوع کو بالکل نہیں چھیڑا تھا۔

"آیئے مسٹر اونکار پوری! چائے کا دَور ختم ہوتے ہی انہوں نے خان کو اُس کی اُس شناخت سے مخاطب کیا ـــــ "اب کچھ باتیں آپ کے کام سے متعلق بھی ہو جائیں!"

دونوں نے اُسی میز کا ایک ایک کونہ سنبھال لیا تھا جس پر بچھے ایک بڑے سے نیلے رنگ کے نقشے پر مختلف جگہ سُرخ پنسل سے دائرے لگائے گئے تھے۔

"مسٹر پوری!" ــــ کرنل نے ایک نشان زدہ جگہ پر انگلی لگائی ــــ "یہاں سے تمہیں سرحد عبور کرنا ہے اور یہ ہیں وہ گاؤں جو اس راستے پر آئیں گے۔" انہوں نے یکے بعد دیگرے چار پانچ مزید نشان زدہ جگہوں کی نشاندہی کی ــــ "تمہارا گائیڈ کوشش کرے گا کہ تمہیں ہنگامے اور شور شرابے سے محفوظ رکھ کر ہی "مکسر" تک پہنچا دے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کی فورسز راستے پر کہیں ڈیپلائے ہو گئی ہوں اور تمہیں راستہ بدلنا پڑے، یا ان دیہاتوں میں سے ہو کر گزرنا پڑے۔" انہوں نے رک کر ایک نظر مابد خان کے متجسس چہرے پر ڈالی جس کی آنکھیں نقشے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"یہ سارا ایریا بڑا "حساس" ہے" ــــ انہوں نے انگلی کو یکے بعد دیگرے تین چار جگہ رکھ کر "حساس ایریا" کی نشاندہی کی۔ "مائی بوائے! لانچنگ پیڈ سے "لانچنگ اسٹیشن" تک تمہاری راہنمائی تمہارا گائیڈ کرے گا، لیکن اپنی حیثیت کو کبھی نہ بھلانا۔ خدا کے بعد تمہارا بہترین ساتھی تمہارا اپنا اعتماد ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو ہمیشہ جگائے رکھنا۔ راستے میں یا دورانِ قیام ایک لمحے کی غفلت بھی تمہیں کہاں سے کہاں لے جا سکتی ہے۔ اس کا شاید تمہیں اندازہ بھی نہ کر سکو۔"

ایک مرتبہ پھر سلسلہ گفتگو روک کر انہوں نے سگار سلگایا اور اس کا دھواں منہ اوپر کر کے کمرے کی چھت کی طرف پھینکنے کے بعد دوبارہ اس سے مخاطب ہوئے۔

"تھوڑی دیر کے بعد تمہاری ملاقات تمہارے گائیڈ نتھا سنگھ سے کروا دی جائے گی۔ میرا خیال ہے ٹریننگ کی کسی بات کو اب دہرانا اچھا نہیں لگتا۔" وہ مسکرائے اور اُسے تھپکی دے کر اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ دوسرے کمرے میں صوبیدار کے ساتھ ایک اکہرے بدن اور درمیانی عمر

[illegible] بیٹھا تھا۔

"اس کا نام نتھا سنگھ ہے۔" اُنہوں نے اُس کا تعارف نتھا سنگھ سے کروایا۔ "اور یہ ہے اُونکار پوری۔" اُنہوں نے نتھا سنگھ کو اُس کی طرف متوجہ کیا۔

"ست سری اکال جی۔" نتھا سنگھ نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔

"ست سری اکال۔" ــــ خان نے بھی وہی عمل دہرایا۔

وہ جانتا تھا: جس طرح اُس کے صحیح نام کا علم نتھا سنگھ کو نہیں ہے اُسی طرح اُسے بھی نتھا سنگھ کا نام غلط بتایا گیا ہے۔

اُس کے بڑے انسٹرکٹر نے اُسے یہی بتایا تھا: "بچے! ہمیشہ خود کو چھپا کر دوسروں کی اصلیت کو جاننے کی کوشش کرو! یہی ہے ہمارے کھیل کا اوّلین اُصول۔"ــــ

"تم لوگ گپ شپ لگاؤ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی ہیں۔" کہہ کر کرنل صاحب صوبیدار کے ساتھ باہر نکل گئے۔

"ہم کب تک مکسر پہنچ جائیں گے؟" خان نے خود ہی سلسلہ گفتگو جاری کرنے کی تمہید باندھی۔

"اگر پرماتما نے خیر رکھی اور کوئی مشکل راستے میں نہ پڑ گئی۔ تو صبح پہلی بس پر ہم "ہندول کوٹ" سے مکسر چلے جائیں گے۔" نتھا سنگھ نے بات مکمل ہوتے ہی اپنی قمیص کی اوپر والی جیب سے بیڑیوں کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی باہر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ خان سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن وہ اپنی شخصیت کے کسی بھی پہلو سے نتھا سنگھ کی آگاہی کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے اطمینان سے بیڑی نکال کر عادی بیڑی نوشوں کی طرح اُس کے ایک کنارے کو دانتوں سے توڑا اور اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھونک کر دونوں انگلیوں میں پھنسا لیا۔

ماچس کی جس تیلی سے نتھا سنگھ نے بیڑی سلگائی تھی۔ اُسی تیلی نے اُس نے خان کی بیڑی کے مُنہ پر شعلہ سجا دیا۔ خان کی عقابی نظروں نے بخوبی جائزہ لے لیا تھا کہ بیڑی کا بنڈل بھارت کا بنا ہُوا ہے۔

نتھا سنگھ اس کھیل کا شاید پرانا کھلاڑی تھا کہ اُس کی کوئی بات "خلاف اصول" نہیں تھی۔ اب تک زیادہ باتیں اُسی نے کی تھیں۔ خان تو صرف سوالات کرتا رہا تھا۔ اُس سرحدی علاقے کے متعلق جہاں سے انہوں نے سرحد پر نقب لگانی تھی۔ راستے میں آنے والے دیہات، نہریں، ریلوے لائن، لیٹر بکس، کچے پکے راستے، سب ہی کچھ تو اُس نے نتھا سنگھ سے پوچھ لیا تھا۔

اُس کے گائیڈ نے ابھی تک کوئی سوال اُس کی ذات سے متعلق نہیں کیا تھا۔ خان اُس کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ دو آدمی جب پہلی مرتبہ ملیں تو عموماً سلسلہ گفتگو تعارف ہی سے شروع ہوتا ہے جبکہ یہاں تعارف شجر ممنوعہ تھا۔

○

تھوڑی دیر بعد کرنل صاحب دوبارہ آ گئے اس مرتبہ انہوں نے دونوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر چائے "کا کپ" شیئر" کیا۔ پھر نتھا سنگھ تو وہیں رہ گیا جبکہ خان کو کرنل صاحب دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہاں اُسے کپڑے تبدیل کرنا تھے اور اب وہ روپ دھارنا تھا جس رُوپ میں اُسے سرحد عبور کرنی تھی۔

صوبیدار کی موجودگی میں کرنل صاحب نے اُس کے تمام کپڑے اُتروا دیے تھے اُس کے جسم پر صرف ایک زیر جامہ رہ گیا تھا۔ دونوں نے باری باری اُن کپڑوں کو چیک کیا جو خان نے پہننے تھے۔ کپڑوں پر خصوصی طور سے بھارتی علاقے کی لانڈری کی مہر لگائی گئی تھی اور دونوں نے اس بات کا سخت تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا تھا کہ ان کپڑوں میں سے کسی پر کوئی ایسی معمولی سی نشانی بھی باقی نہ رہے جو خان

Scanned at 5 by CamScanner

کے پاکستانی ہونے پر دلالت کرے۔

اُسے پہننے کے لیے جو جنیان دی گئی تھی اُس میں مختلف خانے بنا کر بھارتی کرنسی نوٹ سلے ہُوئے تھے۔ زادِ راہ کے لیے الگ سے کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے گئے دس پندرہ منٹ بعد جب عابد خان اُس کمرے سے برآمد ہُوا تو وہ مکمل "اونکار لوہری" بن چکا تھا۔

ہاتھ میں پکڑے کپڑے کے تھیلے میں اُس نے کچھ افیون رکھی ہوئی تھی بطور احتیاط اُسے فی الوقت "سمگلر" کے روپ میں سرحد عبور کروائی جا رہی تھی تاکہ خدانخواستہ گرفتاری کی صورت میں اُسے "جاسوس" کے بجائے سمگلر سمجھا جائے۔

کرنل صاحب اُسے ایک کونے میں لے گئے اور انہوں نے دوبارہ اُس سے وہ "سیف سگنل" دھرائے جو اُس نے اپنے گائیڈ کے ہاتھ اپنے "سیف اسٹیشن" پہنچنے پر اُن کی طرف بھیجنے تھے۔ اچانک خطرے کی صورت میں اپنائی جانے والی تیار شدہ پلاننگ پر بھی اور وہ کور سٹوری جس کے ساتھ عابد خان عرف اونکار لوہری کو سرحد عبور کروائی جا رہی تھی۔

اپنی تشفی کرنے پر انہوں نے صوبے دار صاحب کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور "ایجنٹ" کی کامیاب ٹریننگ پر انہیں مبارکباد دے کر انہوں نے گرم جوشی سے عابد خان سے معانقہ کیا: "او۔ کے برائے! مَیں تمہاری کامیابی کے لیے خدا سے دعاگو ہوں ـــــ گڈ لک" ـــــ انہوں نے مُسکرا کر خان کی پیٹھ تھپتھپائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اُس "واکسی" کی طرف چل دیے۔ جس کے باہر ایک مستعد سفید پوش اُن کے لیے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

○

جب وہ نتھا سنگھ کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر جسے صوبیدار خود چلا رہا تھا، میں

Scanned with CamScanner by Qamar Abbas

سرحدی پوسٹ کی طرف روانہ ہوا تو سورج اُن کے دائیں ہاتھ دُور تک پھیلے درختوں کے جھنڈ میں ڈوب رہا تھا۔ عابد خان قریباً گردن موڑے درختوں کے اُس سلسلے کے پیچھے جھانک رہا تھا جہاں سرمئی شام پر اچانک سیاہی غالب آنے لگی تھی۔

بادل اچانک ہی پورب کی سمت سے آئے اور انہوں نے بڑی تیزی سے سارے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ دیکھتے دیکھتے جیپ کی ونڈسکرین دھندلا گئی۔ بونٹ پر بارش کے قطروں کا رقص اور اُس سے بلند ہوتی آوازوں نے عابد خان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"بہت خوش قسمت ہو بچے!" ــــ صوبیدار نے وائپر مشین کا بٹن دباتے ہوئے اُس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا ــــ "ایک تو یوں بھی دیوالی کی رات ہے تمہارے یار شراب کے نشے میں بدمست اوندھے پڑے ہوں گے اور اُس پر یہ بارش ــــ عطیۂ خداوندی ہے بچے! خدا تجھے اپنی امان میں رکھے۔"

ڈاک بنگلے سے سرحدی پوسٹ تک کا فاصلہ انہوں نے قریباً دو گھنٹے میں طے کیا! بارش برس برسا کر اب تھم چکی تھی۔ نتھا سنگھ پچھلی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس دوران اُس نے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا تھا جبکہ عابد خان اور صوبیدار صاحب آپس میں ایک آدھ بات کبھی کبھی کرتے آئے تھے۔

جیپ چوکی سے قریباً آدھا میل دُور ہی روک کر صوبیدار نیچے اُتر آیا۔ اُس نے عابد کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ جیپ سے اُتر کر اُس نے پکٹ کی سمت ٹارچ جلا بجھا کر اُن لوگوں کو اپنی آمد سے مطلع کیا۔

چند ہی منٹ بعد پکٹ انچارج اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ کسی اجنبی کو اُس طرف آتے دیکھ کر عابد خان نے اپنے کندھے پر رکھی چادر سے اپنا چہرہ قریباً ڈھانپ لیا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ "ریجرز" کو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مُلک کی

سلامتی کے لیے سرحد عبور کرنے والے ایجنٹوں سے غائبانہ عشق ہوتا ہے اور وہ اپنے کسی بھی ایجنٹ کی شکل دیکھنا یا اُس سے مصافحہ کرنا اپنے لیے باعثِ عزت جانتے ہیں۔

اس کی شخصیت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اُس کے انسٹرکٹر نے انتہائی احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پکٹ پر بھی نہیں گیا تھا۔ پکٹ انچارج اپنے متیقد تمندانہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور وہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر بھی چلتا ہوا جیپ تک آ گیا تھا۔ عابد خان نے اپنا چہرہ ننگا کیے بغیر اپنا ہاتھ اُس سے مصافحہ کے لیے باہر نکال دیا۔ جسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پکٹ انچارج نے پہلے گرم جوشی سے دبایا پھر اُن پر بے اختیار جُھک کر بوسہ دیا۔

"تم جو کوئی بھی ہو میرے بیٹے اس مُلک کی آنکھیں ہو ــــ خدا ان آنکھوں کی حفاظت کرے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ سرحد تک چلنے کا اعزاز مجھے میسر آ رہا ہے۔ اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔"

وہ عابد کا ہاتھ چھوڑ کر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ عابد کے ہونٹ لرزے اور اُس نے "شکریہ" کا لفظ کہہ کر اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا نتھا سنگھ ماحول سے بالکل بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے بھی عابد خان کی طرح اپنا چہرہ پگڑی کے پلّو سے ڈھانپ رکھا تھا۔

"باہر آؤ بچے!" ــــ صوبیدار نے اُس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

عابد اپنے کپڑے کے تھیلے سمیت باہر آ گیا۔ اُن کے سفر کا آغاز ہونے والا تھا اب اُس کا بوڑھا انسٹرکٹر جس نے جی جان سے چھ ماہ تک اُسے تربیت کے مراحل سے گزارا تھا۔ اُس سے الوداعی کلمات کہنے جا رہا تھا۔ عابد خان ڈاک بنگلے سے یہاں تک صرف یہی ایک بات سوچتا آ رہا تھا کہ اس "الوداعی لمحے" پر اس

Scanned with CamScanner by Qamar Abbas

کا رقبہ کیا ہوگا؟

اُس کا محترم اُستاد اُسے کیا کہے گا؟ وہ خود اس سے کیا باتیں کرے گا؟

دونوں ایک دوسرے سے کیا کہہ سُن کر الگ ہوں گے ـــــ اور اب وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ نتھا سنگھ ابھی تک جیپ کے اندر ہی بیٹھا تھا۔ صوبیدار اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے جیپ سے چند فٹ دُور لے گیا۔ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا۔ ایک جگہ رُک کر اُس نے خان پر پھُونک ماری، پھر دوبارہ کچھ پڑھا اور شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہُوئے اُس پر پھر پھونکا:

"میرے بچے! ہمیں اب الگ ہونا ہے میرا دل و جان خدا سے تمہاری کامیابی اور واپسی کے لیے دعا گو ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہ سعادت تمہیں نصیب ہو رہی ہے ـــــ بچے! معلوم نہیں اب زندگی میں کتنی دیر بعد ملاقات ہوگی۔ مَیں یہاں رہوں گا بھی یا کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میری ایک آخری بات غور سے سُن لینا۔ موت سے فرار نہیں ـــــ مرنا دُنیا کی بڑی تلخ سچائی ہے لیکن کسی عظیم مقصد کے حصول کی راہ میں موت آجائے تو اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہوگی۔"

عابد خان کے ہونٹ لرزے: "اوکے سر۔"

اُس نے بڑی مشکل سے اپنی جذباتی حالت پر قابو پایا ہوا تھا۔ پچھلے چھ ماہ تک وہ دونوں ایسے انجانے لیکن بے حد مضبوط رشتے میں بندھے رہے تھے کہ ایک بے نام سا تعلق دونوں کے درمیان بندھ چلا تھا۔ اس تعلق کی مضبوطی کا اندازہ عابد خان کو آج اس وقت ہُوا تھا، جب اُس کا بوڑھا اُستاد اُس سے الوداعی ملاقات کر رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی کوئی انتہائی عزیز شے اُس سے چھن رہی ہو ـــــ یہ لمحے اُس پر بڑے شاق گزر رہے تھے۔

قریبی جھاڑیوں میں ہونے والی سرسراہٹ نے اُسے ایکدم چوکنا کر دیا لیکن

اپنے انسٹرکٹر کو صورتِ حال سے لاتعلق دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

"چہرہ چھپا لو ـــــ!" صوبیدار نے سرگوشی کی۔

دوسرے ہی لمحے اُن کے نزدیک دو مستعد رینجرز اپنے کمانڈر سمیت موجود تھے۔

"تیار جوان ـــــ" صوبیدار نے خالص فوجی لہجے میں اُنہیں مخاطب کیا۔

"جی صاحب" ـــــ دونوں کی ایڑیاں مل گئیں۔

"آؤ بچے" ـــــ صوبیدار صاحب اُس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ جیپ کے نزدیک چلے گئے۔ نتھا سنگھ کو انہوں نے باہر آنے کے لیے کہا اور اپنی جیب سے "وکس" کی ڈبیا نکال کر کھولی، ایک گولی انہوں نے اپنے ہاتھ سے عابد خان کے منہ میں ڈال دی اور دو تین گولیاں نکال کر اُس کی جیب میں ڈال دیں۔

نتھا سنگھ بچے کو پھولوں پر چلا کر لے جانا ـــــ اُن کا لہجہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

زمین پر بیٹھ کر انہوں نے عابد خان کے پاؤں میں پہنے کینوس کے جوتوں کے تسموں پر ہاتھ پھیر کر چیک کیا اور کھڑے ہو گئے۔

"اگر وقت محسوس ہو تو اُتار دینا" آخری لمحے تک وہ اپنے عزیز شاگرد پر مشفق نظر رکھے ہُوئے تھے۔

رینجرز اب اُن کے نزدیک آ گئے تھے۔ صوبیدار صاحب نے ہاتھ پر بندھی گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈالی۔ پھر عابد خان کے دونوں گال اپنے ہاتھوں سے تھپتھپا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ انہوں نے خان کے ماتھے پر بوسہ دینے کے لیے خود کو تیار کیا۔ اُس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک آہٹ اپنے چہرے پر لا کر انہوں نے خان کو "فی امان اللہ" کہا اور دوبارہ اُس

وہ رُک کر ایک نظر مُڑ کر اُس کی طرف دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیتا ـــــ انہیں دس پندرہ میل تک پیدل راستے طے کرنا تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق اُن لوگوں نے بمشکل تین چار میل کا راستہ ہی طے کیا تھا کہ نتھا سنگھ زمین پر بیٹھ گیا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ خان رک جائے وہ اُس سے کسی معاملے میں مشاورت کرنا چاہتا تھا۔ خان فوراً جُھک گیا اور جُھکا جُھکا ہی اس کے نزدیک آکر اُس کے قریباً ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے کی سمت اشارہ کیا۔ بہت دُور اُس کی انگلیوں کی سیدھ میں کبھی کبھی کوئی شعلے یا چنگاریاں اُسے پھُوٹتے ہوئے دکھائی دے رہی تھیں۔ آسمان پر کہیں کہیں اکا دکا تارہ بھی جھلملاتا ہُوا نظر آنے لگا تھا ـــــ بادل اب پھٹ کر ٹکڑیوں کی شکل میں پھیل رہا تھا۔ لیکن چاند کو بہرحال اُنہوں نے اپنے دامن میں چھپا رکھا تھا۔

"کیا ہے یہ؟" خان نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

"سامنے ڈھولی وال گاؤں ہے۔ یہاں سے قریباً سوا ڈیڑھ کلومیٹر۔" نتھا سنگھ بولا۔

"لوگ شاید دیوالی منا رہے ہیں ـــــ ہم دوسرا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔" خان نے اپنی رائے پیش کی۔

"نہیں۔" نتھا سنگھ اس کی طرف جُھکا۔ "سب سے محفوظ راستہ یہی ہے۔ دیوالی کی وجہ سے دوسری طرف 'پیشل ناکے' بھی لگ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ آج بہت سے لوگ 'بارڈر توڑیں گے ـــــ'"

"پھر کیا کیا جائے؟"

میرا خیال ہے کہ سامنے کھیت میں بیٹھ کر تھوڑی دیر انتظار کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ـــــ نتھا سنگھ کے ساتھ وہ ابھی کسی بھی معاملے پر جرح کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

نتھا سنگھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا جبکہ خان اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ نتھا سنگھ بڑے محتاط قدموں پر چلتا ہوا اُس کھیت تک پہنچا، جسے اُن دونوں کی جائے پناہ بننا تھا۔ اندر گھس کر اُس نے حالات کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا اور ایک کُنج عافیت تاڑنے کے بعد واپس خان کے پاس پہنچ گیا۔

خان سے کچھ فاصلے ہی پر رُک کر اُس نے ہاتھوں کے مخصوص اشارے سے اُسے 'محفوظ سگنل' دیا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ عابد خان دبلے قدموں چلتا ہُوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ پھر وہ نتھا سنگھ کے تعاقب میں کھیت میں گھس گئے۔ ایک جگہ قدرے خلا دیکھ کر نتھا سنگھ نے اپنے تھیلے سے چادر نکال کر بچھا دی۔ دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

○

نتھا سنگھ نے جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی اُس کی طرف بڑھا دی ـــــ "شاکر نا میں سفر میں رات کے وقت بیڑی نہیں پیتا۔" عابد خان نے کہا اور وہ سوچنے لگا: "اُس نے بیڑی کیوں سلگائی ہے، جبکہ کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے پہلے گائیڈ کو سگریٹ نوشی کی ممانعت کی جاتی ہے؟"

"کون پروا کرتا ہے ایسے ضابطوں کی۔ پھر یہ کوئی پڑھا لکھا جاسوس تو ہے نہیں، ہے تو جاہل سا سمگلر جو پاکستان انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہا ہے۔" اُس نے سوچا اور ذہن میں پیدا ہونے والے شبہات کا وہیں گلا گھونٹ دیا۔

نتھا سنگھ نے دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں بڑی احتیاط سے سر پر پگڑی کا سایہ کر کے بیڑی سلگائی۔ اُس کا بیڑی سلگانے کا طریقہ اتنا محفوظ تھا کہ عابد خان کے ذہن سے رہے سہے خدشات بھی نکل گئے۔ وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

"شاکر نا مہاراج جی!" نتھا سنگھ نے بیڑی کا لمبا کش لے کر اُسے ہاتھوں میں

Digitized by Dawat Abbasi

چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہم جیسی لوگ ہیں نشہ پانی کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔"

"کوئی بات نہیں" خان نے جوابی سرگوشی کی۔

"آپ کا شاید یہ پہلا مشن ہے" اُس نے اچانک ہی سوال داغ دیا۔

عابد خان نے بڑی اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سوال بالکل خلافِ توقع تھا۔ وہ ضوابط کی مکمل خلاف ورزی کرنے لگا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"برا مت ماننا پوری صاحب" نتھا سنگھ نے شاید اُس کا موڈ پہچان لیا تھا۔ "ہمارا آپ کا ساتھ تو اب بڑا لمبا ہوگا۔ ٹریننگ کی ہر بات پر عمل نہیں کیا جاتا۔ ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں تو لینا ہی پڑتا ہے۔ ممکن ہے میں آپ کے کسی کام آسکوں۔ آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔۔۔۔"

"بہت دھنوادی ہوں میں تمہارا نتھا سنگھ!" عابد خان کی سرگوشی خاصی تلخ تھی۔ "لیکن ہم دونوں بہرحال ایک معاہدے کے پابند ہیں اور میرے خیال سے بہتر یہی ہے کہ ہم معاہدے کا احترام کریں۔"

"ٹھیک ہے مہاراج جی! ٹھیک ہے! جیسی آپ کی اچھیا (مرضی)" بڑی تلخی سے اس نے بات کا پانسہ پلٹ دیا۔

دونوں تقریباً آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھے رہے۔

"میرے خیال سے اب چلنا چاہیئے؟" خان بولا۔

"ٹھیک ہے پوری صاحب" نتھا سنگھ نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں باہر آگئے۔

ڈھولن وال کی روشنیاں جوں کی توں برقرار تھیں۔ نتھا سنگھ کسی سوچ میں پڑ گیا وہ دونوں جنگلی گھاس کے ایک وسیع سلسلے کے بیچ کھڑے تھے جو اُن کے گرداگرد میلوں تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

"میں ذرا حالات کا جائزہ لے لوں" نتھا سنگھ نے اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"یار کس چکر میں پڑ گئے ہو، ہم کوئی دوسرا راستہ اپنا لیتے ہیں" خان نے بے تکلفی سے اپنے اور اُس کے درمیان پیدا ہونے والے تناؤ کو کم کرنا چاہا۔

"پوری صاحب! آپ کو ٹھکانے تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے" اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں خان کو وارننگ دی۔

واقعی وہ ٹھکانے تک اُس کی "حفاظت" کم از کم اس حد تک کرنے کا پابند تھا کہ اُسی راستے پر سفر کرے جس کا انتخاب نتھا سنگھ کرے۔ خان چُپکا ہو رہا۔

"تم یہاں اِس برجی کے پاس بیٹھو" نتھا سنگھ نے ایک برجی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں آدھ گھنٹے تک لازماً واپس آجاؤں گا۔ میرے خیال سے رات اسی گاؤں میں گزار لیتے ہیں۔ یہاں میرے "جوڑی دار" موجود ہیں۔"

وہ جانے کے لیے مُڑا لیکن پھر رُک کر خان کے نزدیک بیٹھ گیا "ایک چکر چلانا پڑے گا" اُس نے سرگوشی کی۔

"کیا؟"

"ڈھولن وال کے باہر ہی میرے یار کیسر سنگھ کی حویلی ہے میں تمہارا تعارف "نئی ایجنٹ" کی حیثیت سے کراؤں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ ہم "مال" لے کر جس پارٹی کے لیے آئے تھے وہ لوگ "اٹ" (جہاں سمگلر آپس میں ملاپ کرکے "مال" کا تبادلہ کرتے ہیں) پر نہیں آسکے اور اُسے بتاؤں گا کہ میں نے تم لوگوں کو راضی کر لیا ہے کہ "مال"

کا معاملہ کیسر سنگھ سے طے کر لیں۔ یہ لالچ دے کر ہم اُس کے پاس رات گزار لیں گے۔ تم یوں کرو کہ بھے یہ افیون دے دو جو تمہارے پاس ہے۔ یہی اُسے دکھا کر لالچ دوں گا اور کہہ دیں گے کہ باقی مال صبح ناکے اٹھنے کے بعد آدمی لے کر آئے گا۔ صبح ہم اُس کے بیدار ہونے سے پہلے نکل جائیں گے۔ میں اُسے ذرا زیادہ پلا دوں گا۔ یوں بھی آج دیوالی کی رات ہے نا اس نے پہلے بھی پی رکھی ہو گی۔"

ایک لمحے کے لیے خان نے کچھ سوچا اور اپنے تھیلے سے افیم نکال کر اسے تھما دی۔ اُس لمحے اس کے لیے سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ نتھا سنگھ کی ہر ہاں میں ہاں ملائے اور بس۔

○

نتھا سنگھ کو گئے دس پندرہ منٹ ہونے کو آئے تھے اور خان کی نیس سوچتے سوچتے پھٹنے لگی تھیں۔ وہ ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

"نہ بچے، جو گردن کے اُوپر کُور رکھا ہے نا، جو کچھ ہے بس اسی میں ہے اور اسی سے ہے! وہاں تمہارے لیے کوئی مجلسِ عاملہ نہیں ہو گی جس کے ساتھ مشورہ کر کے تم کسی نتیجے پر پہنچ سکو۔ بس تم ہو گے بچے!! اور اللہ کی ذات۔ کسی بھی نتیجے یا فیصلے پر فوراً پہنچنا ہو گا۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب تمہارے اعصاب گھبرا کر جواب نہ دے جائیں۔ اپنی ذات پر اعتماد اور اللہ پر بھروسہ ہی تمہارے بہترین ہتھیار ہیں۔" بوڑھے صوبیدار میجر نے اُس کی راہنمائی کی۔

"ڈبل کراس ——" اُس نے بڑبڑاتے ہوئے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

دوسرے ہی لمحے وہ بجلی کی سی پھرتی سے برجی عبور کر کے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ گاؤں کے کھیتوں کی طرف جانے والے راستے پر جہاں سے ابھی نتھا سنگھ لڑکھڑا کر گیا تھا وہ ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا قریباً آدھ میل آگے نکل آیا تھا —— اگر

"ایلیا، آیا تو ٹھیک ہے.... ورنہ....؟" اُس نے سوچا اور وہیں دُبک کر بیٹھ گیا۔

اُس کی مُراد جلد ہی بر آئی۔ دُور سے آتے قدموں کی چاپ اُس کے حساس کانوں تک بآسانی پہنچ رہی تھی لیکن یہ کیا؟ قدم دو سے بہرحال زیادہ تھے۔

"نتھا سنگھ غدار! ڈبل کراس ——" اُس نے دانت پیسے۔

ابتدا ہی میں ناموافق حالات نے اُسے خوفزدہ کرنے کے بجائے اُس کی صلاحیتوں کو جلا بخشی تھی۔ پہلے تو اس نے چُپ چاپ یہاں سے نکل جانے کا سوچا لیکن پھر رُک گیا۔ وہ نتھا سنگھ کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔

آنے والے تین تھے۔ دو نے رائفلیں اٹھا رکھی تھیں اُن کا تعلق بی۔ایس۔ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) سے تھا۔ تینوں اونکار پوری کو "ترنوالہ" جان کر بڑے اطمینان سے چلے آ رہے تھے۔ دیوالی کی رات تھی اور آنے والے دونوں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ پیے ہوئے ہیں۔

نتھا سنگھ خان سے بمشکل پانچ چھ قدم دُور ہی رُک گیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ہمراہیوں کو اُس مخصوص جگہ کی نشاندہی کروائی جہاں وہ اُن کے شکار کو بٹھا کر آیا تھا۔ دونوں نتھا سنگھ کے ہاتھ پر باری باری ہاتھ مار کر آگے نکل گئے۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کو چیتا لیا تھا اور اب جنگی فارمیشن میں بڑی احتیاط سے گھاس کے سلسلے میں گھس کر آگے بڑھ رہے تھے۔ شاید وہ چکر کاٹ کر اچانک ہی پاکستانی جاسوس اونکار پوری کے سر پر پہنچنا چاہتے تھے۔

اُن کے لمبی گھاس میں گھستے ہی خان نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اُس کی رگوں میں اب خون کے بجائے نفرت اور نتھا سنگھ سے انتقام کے شرارے تڑپنے لگے تھے۔ اپنے کندھے پر رکھے پرنے (چادر) کو اُس نے بَل دے کر رسّی کی شکل دے لی تھی اور بلی کی طرح بے آواز پنجوں پر چلتا نتھا سنگھ کے سر پر پہنچ گیا۔

Scanned with CamScanner

نتھا سنگھ کو خبر تب ہوئی جب خان نے اُس کے گلے میں پیچھے سے رسّی ڈال کر اُسے پھانسی کے پھندے کی شکل دے دی تھی۔ نتھا سنگھ اچانک بوکھلا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ اُس کے مُنہ سے کوئی معمولی سی آواز بھی نکلتی۔ رسّی چھوڑ کر خان نے بجلی کی سی پھرتی سے دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن کے گرد شکنجہ تان دیا۔

اُس کی تمام نفرت اور انتقام اُس کے ہاتھوں میں سمٹ آئے تھے۔ نتھا سنگھ کی آنکھیں پھیل کر پھٹنے کو آگئیں اور خان کی آنکھوں میں دہکتے انگارے اپنی انتہائی شدت کو چھونے لگے تھے۔ نتھا سنگھ تڑپا، تلملایا لیکن اُس گرفت سے نجات اُن کے لیے ممکن نہ تھی جو آہنی شکنجے کی طرح اُس کا گلا دبا رہی تھی ——— وہ بے بس بکرے کی طرح ڈکراتا ہُوا بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

یہ سارا عمل بمشکل تین یا چار منٹ میں تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ خان نے اُس کی گردن میں گڑی انگلیاں باہر کھینچیں اور کھڑے ہو کر اُس کی پسلیوں میں ٹھوکر مار کر اپنی نفرت کو تسکین دی۔

○

چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کر سکے۔ نتھا سنگھ کی لاش اُس نے ٹانگوں سے پکڑ کر گھاس کے اندر کی اور دُور تک اُسے گھسیٹتا چلا گیا۔ پھر اُس نے لاش کو وہیں پھینکا اور گھاس کے اندر ہی اندر سامنے والے گاؤں کی طرف تیزی سے ہنجوں کے بل بھاگنے لگا۔

خان کی حالت اُس غضب ناک چیتے کی سی ہو چلی تھی جو بانکا کرنے والوں کے گھیرے میں آچکا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ بمشکل دس منٹ بعد ہی دونوں سرکاری اہلکاروں کو علم ہو جائے گا کہ "پاک سپائی" اُن کو چکمہ دے گیا ہے اور نتھا سنگھ کی لاش بھی وہ

اگلے دس پندرہ منٹ بعد ہی دریافت کر لیں گے۔ وہاں سے پکٹ تک پہنچنے میں انہیں مزید پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔ اس کے بعد اس علاقے پر وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح اُس کی تلاش شروع کر دیں گے۔

اور صبح تک موقعہ واردات سے کھوجی اُس کا "کھرا" بھی اٹھا لیں گے۔ اُس نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اپنے سے متعلق کوئی "کلو" بھی وہ موقعہ واردات پر نہ رہنے دے تاکہ وہ لوگ کتوں کو اس کی خوشبو سے آشنائی بہم پہنچا کر اُس کے پیچھے نہ لگا دیں۔

خان کو بوڑھے انسٹرکٹر کی وہ باتیں یاد آرہی تھیں جو دم رخصت اس نے کہی تھیں۔ اس نے ماہ خان کو بتایا تھا: "بچے! یہ "لانچنگ پیڈ" جس سے ہم تمہیں کراس کر رہے ہیں بہت محفوظ بھی ہے اور بہت خطرناک بھی۔ کبھی کبھی یہ "کوریئر" (گائیڈ) ڈبل کراس بھی کر جاتے ہیں۔ ہم مکمل چھان بین کر کے ہی آدمی گانٹھتے ہیں لیکن یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ جو شخص چند ہزار روپے کے لیے اپنے ملک سے غداری پر آمادہ ہو جائے، وہ تمہیں بھی مزید چند ہزار روپے کی خاطر دھوکہ دے سکتا ہے۔ ہم پچھلے دو سال سے یہ لانچنگ پیڈ استعمال کر رہے ہیں اور کبھی کوئی "پارسل" غلط ایڈریس پر نہیں پہنچا ——— لیکن پچھلے تین چار ماہ سے اِدھر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ایک اُدھر کا کوریئر ڈبل کراس کر گیا تھا اور اُس نے ہمارا بہت پیارا ایجنٹ پکڑوا دیا ——— کچھ دن پہلے بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہُوا تھا، اُدھر سے ایک ایجنٹ واپس آرہا تھا کہ....." صوبیدار نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی تھی شاید اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اُسے یہ سب کچھ خان کو نہیں بتانا چاہیئے۔

"بچے! اچھا سپائی حالات کے مثبت سے زیادہ منفی پہلو پر نظر رکھتا ہے یہی مائنڈ پرسٹک نہیں کرنا چاہیئے، لیکن اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھنا۔"

اُسے خوامخواہ اپنے اِس باپ کی طرح شنیق انسٹرکٹر سے ایک عقیدت سی ہو چلی تھی جو اُس کے سامنے مختلف ایجنٹوں کے تجربات دھراتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا: "بچے اِن لوگوں کی لائن، کبھی جوں کی توں نہ اپنانا، اس میں کوئی نہ کوئی جدت ضرور پیدا کرنا۔ یاد رکھو اچھا جاسوس موقعے سے صرف فائدہ ہی نہیں اُٹھاتا بلکہ مواقعے بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔"

خان بڑا ہونہار شاگرد تھا اس کی ٹریننگ کے خاتمے پر جب اُس کے ڈائریکٹر جنرل صاحب اُس سے ملے تھے تو صوبیدار صاحب نے اُن کے سامنے مستعد ہوتے ہوئے کہا تھا: "سر! میرا دل گواہی دیتا ہے میرا یہ شاگرد ملک و قوم اور اپنے اُستاد کا نام ضرور بلند کرے گا۔"

خان کو احساس تھا کہ اس کے انسٹرکٹر کو کتنا اعتماد ہے اُس پر۔ آج نتھا سنگھ کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتار کر اُس نے اس اعتماد پر نہ صرف مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی بلکہ اُن دو ساتھیوں کی گرفتاری کا ایک طرح سے انتظام بھی کر لیا تھا۔

وہ گھاس کے اندر ہی اندر چلتا چلا جا رہا تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق اب اُس کو "پہلی پلاننگ" ختم کر کے "دوسری سکیم" پر عمل پیرا ہونا تھا جس کے مطابق اب اس کو "آر۔ڈی" (جہاں جاسوس ملاپ کرتے ہیں) "لائنگ سٹیشن" اور "سیف ہاؤس" کو بدلنا تھا ——— وہ سوچنے لگا:

گھر کی بجائے اب اُس کی منزل بٹھنڈہ تھی۔

وہ جانتا تھا کہ ٹریننگ کے مطابق جب وقت پر وہ "آر۔ڈی پوائنٹ" پر نہ ملا تو "مقامی دوست" جنہوں نے اُس سے "پی۔ایم" (رابطہ) کرنا ہوگا اُسے دوسرے سٹیشن پر "ملاپ" کریں گے۔

صبح ہونے تک اس سرحدی قصبے کے چپے چپے پر بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس

کا قبضہ ہونے والا تھا۔ وہ لوگ اُس کے لیے اس علاقے سے نکلنے کے تمام راستے مسدود کر سکتے تھے۔ خان سمجھتا تھا کہ بس سٹینڈ یا کوئی بھی ایسی جگہ جہاں سے کوئی بھی ذریعہ روانگی میسر آ سکے "اُن لوگوں" کی کڑی نگرانی میں ہو گی۔

صبح ہونے تک اُسے بہرحال اس قصبے سے نکل جانا تھا۔ اور خان کو یہ تک علم نہیں تھا کہ وہ اِس وقت کہاں ہے۔ کون سے راستے پر چل رہا ہے؟ وہ راستہ "محفوظ" بھی ہے یا نہیں!

○

نتھا سنگھ پچھلے سات آٹھ ماہ سے پاکستان انٹیلی جنس کے لیے خدمات انجام دے رہا تھا۔ سمگلنگ کا پیشہ اُسے وراثت میں منتقل ہوا تھا۔ وہ بچہ تھا جب اُس نے پہلی مرتبہ اپنے "بابو" کے ساتھ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کی تھی۔ پھر ایک روز اُس کا باپ بھی اس کے چاچا کی طرح "پلس مقابلے" میں سرحد پر مارا گیا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے بڑا تھا اس لیے اب کاروبار کی ساری ذمہ داری اُس کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔

نتھا سنگھ نے پانچ سال تک جی جان سے کام کیا۔ اُس نے کبھی "ناں" نہیں "نہیں" تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح ہمیشہ بغیر ناں کر دیے "اَٹ" لگایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ قابو آ گیا۔ "ٹف" کی مار کھانے کا اُس کا اوّلین تجربہ گو کہ بڑا جان لیوا تھا لیکن وہ جونوں کی طرح اپنی جان پر بوجھ ریمانڈ جھیل گیا۔

چھوٹے بھائی کی بے وقت موت اور "دشمنی" نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ اب وہ بھی اس دھندے سے متعلق "کامیاب سمگلروں" کی طرح کوئی مضبوط سہارا تلاش کرے۔ پہلی ہی سے وہ دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ کہ بھارتی سیکورٹی کے افسر اُس کے خاندان کے ساتھ کتنا بُرا اور بیہمانہ سلوک کرتے آ رہے تھے۔ اُس کے لاشعور میں جو نفرت

Scanned and PDF by Qamar Abbas

اپنی سیکورٹی کے خلاف پیدا ہو چکی تھی وہ کبھی نہ نکل سکی۔

سرحد پار کے اُس کے دوست "گامے" نے اُس کا تعارف پاکستانی سیکورٹی کے ساتھ کروایا۔ اُن لوگوں کے "حسن سلوک" اور کھلے بہاؤ نے نتھا سنگھ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اُن کے لیے "خدمات۔ انجام دینے پر رضامند ہو گیا۔ پھر یہ کام اُس کے لیے تھا بھی کوئی مشکل۔

بس کسی ایجنٹ کو اُدھر سے اِدھر پہنچا دینا اور کبھی کسی کو اِدھر سے اُدھر لے جانا اور اس معمولی سے کام کے مقابلے میں اُسے کتنی مراعات حاصل تھیں۔ وہ کافی عرصہ تک بڑی ایمانداری سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہا۔

ایک روز جب وہ ابھی ایک ایجنٹ کو سرحد عبور کروانے کے بعد بس پر سوار کروا کر واپس ہی لوٹا تھا تو اُس کی حویلی کے سامنے بی۔ ایس۔ ایف کی دو جیپیں آ کر رُک گئیں۔ مقامی پولیس کا عملہ بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ اُن لوگوں نے بغیر وجہ بتائے اُسے گرفتار کر لیا۔ بات اگر مقامی تھانے تک ہی رہتی تو نتھا سنگھ اُسے آسانی سے سنبھال لیتا۔ لیکن اس مرتبہ وہ لوگ اُسے سیدھے امرتسر انٹروگیشن سنٹر لے گئے تھے۔

نتھا سنگھ نے کئی تفتیشیں کاٹی تھیں لیکن اس سنٹر میں ایک ہفتے کے ریمانڈ ہی نے اُسے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنے "صدق" پر آخری دم تک قائم رہتا لیکن اُس کے کیس انچارج ڈی۔ ایس۔ پی شرما نے ہار ماننا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ریمانڈ ختم ہونے سے دو روز پیشتر ہی وہ لوگ اُس کی اکلوتی بہن کو لے آئے۔

جب زنجیروں میں بندھے نتھا سنگھ کے سامنے اس کی بہن کو نیم برہنہ حالت میں لایا گیا اور ڈی۔ ایس۔ پی نے ایک قطار میں لگے سٹاف کے مشٹنڈوں کی طرف اشارہ کر کے اُسے سنگین حالات پیش آنے کی وارننگ دی تو نتھا سنگھ کو یوں

لگا جیسے اُس کا سارا وجود مٹی ہو کر رہ گیا ہو۔

شرما نے بڑا اوچھا لیکن انتہائی بھرپور وار کیا تھا۔ اس کے پیچھے قطار میں کھڑے مشٹنڈے سپاہی جس طرح بھوکی اور کھا جانے والی نظروں سے اُس کی بہن جیتو کو دیکھ رہے تھے، وہ منظر نتھا سنگھ جیسے خاندانی بدمعاش کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے بارہ روز مسلسل دن رات مار کھائی — اور اپنے جُرم کا اقرار نہیں کیا تھا لیکن جیتو کو سامنے دیکھ کر دوسرے ہی منٹ میں وہ پگھل کر رہ گیا۔

"شرما! میں ہار گیا" اُس نے ٹوٹتی اور ڈوبتی آواز سے ڈی۔ ایس۔ پی کو مخاطب کیا "اپنے ان بھیڑیوں کو یہاں سے دفع کرو۔ جیتو کو چھوڑ دو!! میں اقبال جُرم کرتا ہوں"

شرما نے نتھا سنگھ کی ہار کو پرماتما کی طرف سے گنٹ جانتے ہوئے فوراً اپنے "ساتھیوں" کو وہاں سے "دفع" ہو جانے کے لیے کہا اور حوالدار کو حکم دیا کہ وہ نتھا سنگھ کو "ہلکا پھلکا" کر کے اُس کے دفتر میں لے آئے۔

نتھا سنگھ دفتر میں پہنچا تو جیتو اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اُس کو نتھا سنگھ کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ صرف سمگلر اور بدمعاش ہی نہیں ایک "ان" کا بھائی بھی ہے۔

"جیتو! کاش تو نے میری ماں کے بطن سے جنم نہ لیا ہوتا" اُس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی بہن کو خود سے الگ کر دیا۔

"شرما صاحب! پہلے جیتو کو یہاں سے نکالو اور مجھے گیتا پر حلف دو کہ آئندہ اس کے ساتھ ایسی "ذلیل حرکت" نہیں کرو گے۔ اس کے بعد میں اگلی بات کروں گا ——" اُس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو مخاطب کیا۔

شرما نے چند لمحے کے لیے گردن جھکا کر کچھ سوچا۔ وہ نتھا سنگھ کی ناراضی کا خطرہ

Scanned and PDF by Qamar Abbas

اب مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُسے اِس بات پر فخر تھا کہ جو کام بڑے بڑے جُغادری افسر نہ کر سکے۔ وہ "کارنامہ" اُس کے ہاتھوں انجام پا گیا ـــــ اُس نے نتھا سنگھ کو اقبالی کروا کر تمام پُرانے افسروں کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے نتھا سیماں" اُس نے نتھا سنگھ کی آنکھوں میں جھانکا۔

انٹروگیشن سنٹر کے باہر والے مندر سے اُس نے "مقدس گیتا" منگوائی اور اِس پر ہاتھ رکھ کر حلف دیا کہ اگر نتھا سنگھ اُن لوگوں کی مرضی کے مطابق کام کرتا رہا تو وہ کبھی جیتو پر دوبارہ ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔

جیتو کو نتھا سنگھ کے سامنے اُس کے ماموں کے ساتھ وہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ اِس ماموں کو بھی وہ لوگ جیتو کے ساتھ ہی باندھ لائے تھے۔ نتھا سنگھ کے لیے وہیں سگریٹ اور شراب منگوا لی گئی اور وہ طوطے کی طرح بولنے لگا۔

○

تیسرے ہی روز اُس نے ایک "پاک سپائی" کو جس نے اپنا مشن مکمل ہونے پر اس کے ساتھ پار جانا تھا۔ بھارتی سیکورٹی کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا۔ یہ کام اتنی چالاکی اور ہوشیاری سے کیا گیا کہ اُس پر کسی کو پاکستان میں شک ہی نہ ہو سکا۔

نتھا سنگھ کی ڈور اب بھارتی آرمی انٹیلی جنس کے ایک میجر کے ہاتھوں میں تھما دی گئی تھی۔ جس کی ہدایت پر وہ پاکستانی انٹیلی جنس کے لیے اپنا ہر اتنی ہی مستعدی اور جی جان سے کام کرتا۔ جس طرح وہ اب تک یہ خدمات انجام دیتا آیا تھا۔ اس دوران بڑی ہوشیاری سے اُس نے ایک اور "شکار" اُن لوگوں کے ہاتھوں پکڑوا دیا تھا۔

وہ اس طرح دوہرا فائدہ حاصل کر رہا تھا۔ پاکستان کی طرف سے تو اُسے اطمینان تھا ہی اب اپنی طرف بھی کوئی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا! اس علاقے میں دو ایجنٹوں

کی گرفتاری کی وجہ سے اُس کا پنگ پیڈ سے ایجنٹوں کو پار کروانے والے دوسرے گائیڈز کی طرف بھی پاکستان انٹیلی جنس کی لسٹ میں "زیرِ نگرانی" آ گیا تھا۔ لیکن اُس کے "نئے آقا" بڑے کائیاں تھے انہوں نے نتھا سنگھ کو پاکستانی انٹیلی جنس کی نظروں میں کبھی مشکوک نہ ٹھہرنے دیا۔

○

"اونکار پوری" اُس کا تیسرا شکار ہوتا لیکن وہ خود اُس کا شکار ہو چکا تھا۔

اِس مرتبہ پاکستان انٹیلی جنس نے بطور احتیاط اُسے پہلی پکٹوں سے ہٹ کر نئی پوسٹ سے کراس کروایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نتھا سنگھ کو وہاں اپنی شناخت کروانے کے بعد ہی مدد میسر آئی تھی۔

جس پکٹ پر وہ "اطلاع" لے کر پہنچا تھا وہاں دیوالی کا تہوار اپنے پورے جوبن پر تھا۔ نزدیکی دیہات سے پکٹ والے "لڑکیاں" اور "شراب" لے آئے تھے۔ آج رات اُنہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ لوگ شراب کے نشے میں دھت باری باری شباب کی رنگینیوں سے دل بہلا رہے تھے۔ جب نتھا سنگھ کباب میں ہڈی بن کر وہاں پہنچ گیا۔

پہلے تو انہوں نے اُسے خوب گالیوں سے نوازا اور اُسے باندھنے پر تُل گئے۔ لیکن جب نتھا سنگھ نے انہیں کمپنی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرنے اور اُس علاقے میں گرم مل آرمی انٹیلی جنس یونٹ کے میجر گپتا کا حوالہ دیا تو اُن کے ہوش ٹھکانے آئے۔

پکٹ پر موجود فیلڈ ٹیلیفون کے ذریعے اُس کی بات میجر گپتا سے کروائی گئی جس نے نتھا سنگھ کو دیوالی کا تحفہ "اونکار پوری" کی شکل میں پیش کرنے پر اُس کا پیشگی شکریہ ادا کیا۔ اُس نے پوسٹ انچارج کو فون پر اپنی شناخت کروانے کے بعد حکم دیا تھا کہ اگر اُن لوگوں نے کوئی کوتاہی کی تو وہ اُن سب کو معطل کر کے کورٹ مارشل لگوا دے گا۔

پکٹ انچارج کا دل پکٹ پر بنے واحد کمرے سے جہاں جشن دیوالی اپنے نقطۂ انتہا کو چھو رہا تھا، باہر آنے کو بالکل نہیں چاہتا تھا۔ جس ٹاسک کے ذریعے انہوں نے لڑکیاں منگوائی تھیں اُس نے بھی پورا پورا حق نمک ادا کیا تھا۔

وہ خود کو راجہ اِندر سمجھتا ہُوا شباب کی رنگینیوں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا جب اُس کا حوالدار ہانپتا ہوا بغیر کسی جھجک کے اُس مجلسِ سروسی میں گھس آیا۔

"سَر! سَر! اُدھر پھُوَن پر کوئی میجر گپتا ہووے۔"

میجر گپتا کا نام ہی اُس کے ہوش ٹھکانے میں لانے کے لیے کافی تھا، وہ جھٹکے سے اُٹھا۔

"یس سَر!" ــــ اُس نے بمشکل اپنی آواز پر قابو پا کر کہا۔

"کہاں مرے ہُوئے تھے؟" میجر گپتا دھاڑا۔

"س س سَر! پیٹرول بھیج رہا تھا ــــ" اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"میرا آدمی جیسا کیسے ویسا ہی کرو۔ خبردار شکار ہاتھ سے نکلنے نہ پائے....." اُس نے فون پر ہی پکٹ انچارج کو ہدایات اور احکامات جاری کیے۔

"حرامخور! گدھا....." اُس نے فون نیچے رکھتے ہی میجر گپتا کو بے نقط سُنا دیں۔

"حوالدار!" ــــ اُس نے ایک طرف کھڑے حوالدار کو بُلایا۔ "دو جوان اِس کے ساتھ بھیج دو۔ خبردار کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے ــــ سالوں نے آج ہی مرنا تھا۔ کمبخت دیوالی کی رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔"

حوالدار کو حکم دے کر وہ بڑبڑاتا ہُوا اُسی کمرے میں گھس گیا۔ جہاں سے تھوڑی دیر پہلے بادل نخواستہ اُسے اُٹھ کر باہر آنا پڑا تھا۔

○

حوالدار پر بڑی عجیب بپتا آن پڑی تھی: اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس کس کو

Scanned and PDF

ا گھ کے ساتھ جانے کو تیار کرے۔ وہاں تو پکٹ کے مختلف کونوں کھدروں
ان دیوالی منا رہے تھے: کچھ دیوالی میں معروف تھے اور باقی اپنی باری
ظر۔

اہم کسی نہ کسی طرح اُس نے دو سپاہیوں کو تیار کیا اور نتھا سنگھ کے ساتھ بھیج
ا وہ دیوالی کی برکتوں سے لُطف اندوز ہونے لگا۔

دونوں سپاہی میجر گپتا کے نام سے بخوبی واقف تھے اور معاملے کی نزاکت
ی انہیں احساس تھا۔ لیکن نشے کا تھوڑا بہت اثر ابھی باقی تھا! نتھا سنگھ کو
ہتا وہ آدمی جان کر حوالدار نے روانگی سے پہلے دو چار پیگ چڑھا دیے تھے۔

دونوں سپاہی جب نتھا سنگھ کو بیچ میں چھپا کر اُس مخصوص بُرجی کے پاس پہنچے
ں پاکستانی جاسوس کے بجائے سفید قلعی کی ہوئی پتھر کی بُرجی اُن کا منہ چڑا
ی۔

پہلے تو دونوں نے آنکھیں مل کر یقین کرنا چاہا کہ وہ کہیں ابھی تک نشے میں
ہیں۔

"مل دے گیا سالا!" بالآخر ایک کو ہوش آیا۔

"ایا طلب؟" پہلا حیران تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔

"مل گیا۔"

"اوہ! اوہر اطلاع کریں۔ ابھی دُور نہیں گیا ہوگا۔"

دونوں بڑی افراتفری میں واپس مُڑے۔ وہ سیدھے اُس جگہ پہنچے جہاں نتھا سنگھ
لے تھے۔ لیکن یہ کیا! ــــ نتھا سنگھ بھی غائب!

"ہی گیا ــــ" پہلے کے مُنہ سے اچانک ہی نکل گیا۔

"اوئے ہے یار ــــ دونوں ہی غائب!" دوسرے کو تو بالکل ہی سمجھ نہیں آ

Scanned by PCS Qamar Abbas

"وہ ـــــ وہ اُسے بھی جاتے جاتے ـــــ گولی کھونٹ کر....."

اُس کی بات نامکمل ہی تھی کہ میجر کی زبان بے دریغ چل پڑی۔ وہ مجنو کی طرح فون پر دھاڑتے ہوئے اُسے گالیاں دے رہا تھا۔

"میں ..... میں تم سب کو شوٹ کر دوں گا۔ شوٹ کر دوں گا۔" اُس کے سے نکلنے کی حالت میں کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہیں نکل رہی تھی ـــــ "فوراً علاقے کو گھیرے میں لے لو ـــــ سرحد کی طرف بھاگو ـــــ" اُس نے پھر گالیوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑ لیا۔ جہاں سے ٹوٹا تھا۔

فون کریڈل پر رکھ کر اُس نے کمپنی ہیڈ کوارٹر سے لائن ملائی اور ڈیوٹی پر موجود کمپنی کمانڈر کو جس کی آواز شراب کے نشے سے بوجھل ہو رہی تھی حکم کہ ریزرو میں موجود تمام جوانوں کو سرحد کی طرف بھیج کر ناکہ بندی کرے۔

یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ اتنے زبردست دلیرانہ اقدام کے بعد بھی یہ پاکستانی ایجنٹ بچائے واپس بھاگنے کے بھارت میں موجود رہے گا ـــــ وہ بالآخر آرمی انٹیلی جنس کا میجر تھا۔ اس امکان کو بھی نے نظر میں رکھا تھا اور احتیاطاً کچھ جوانوں کی ڈیوٹی اُدھر بھی لگا دی۔

خود بڑی تیزی سے جیپ چلاتا ہوا اپنے اردلی کے ساتھ ڈھولن وال کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا۔ بی۔ایس۔ایف کے کمپنی ہیڈ کوارٹر سے شراب کے میں دھت سپاہی اور چھوٹے افسر میجر گپتا کو گالیاں دیتے بادلِ نخواستہ وردیاں پہن کر اپنی رائفلیں سنبھالے ٹرکوں اور جیپوں میں سوار ہو رہے تھے۔

میجر گپتا جب سے اس علاقے میں انٹیلی جنس ڈیوٹی پر آیا تھا۔ اُس نے اُن لوگوں کو پچار رکھا تھا ـــــ عام حالات میں بھی وہ اُن کی جان کو آیا رہتا تھا جبکہ آج تو ظالم نے انتہا کر دی تھی۔

اُس نے بے چارے ملازموں کی دیوالی کو بالکل بدمزہ کر دیا تھا۔

⊙

ڈاک بنگلے کی میز پر پھیلا نیلے رنگ کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلتا چلا گیا۔

کرنل صاحب کی اُنگلی، ڈھولن وال، اور اُس کے گرداگرد مختلف مقامات پر لگے خرخ دائروں پر یکے بعد دیگرے جمتی اور اُٹھتی چلی گئی۔ اس علاقے کے چپے چپے کا نقشے کی مدد سے انہوں نے خان کے ذہن میں نقش کر دیا تھا۔ لیکن رات کے اس عالم میں جب کوئی سمت کی بھی صحیح طور سے نشاندہی نہیں کر سکتا تھا وہ کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

رات ٹوٹ ٹوٹ کر وقت کی گود میں گر رہی تھی۔ آسمان کھلنے لگا تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے چھٹ کر تحلیل ہونے لگے تھے۔ تارے اب ایک ایک کر کے نمایاں ہو رہے تھے اور خان اپنے ٹریننگ کلاس روم میں پہنچ گیا۔

"یہ قطبین ہیں۔ دوستارے! بس انہی سے رہنمائی حاصل کرنی ہے تم نے۔ یہاں سے یہ راستہ دکھاتے آ رہے ہیں قافلوں کو۔ اور یہ جو دُم دار سا ستارہ قطبین کے نیچے نظر آ رہا ہے نا۔ اِسے ہمیشہ اپنے بائیں کندھے پر رکھ کر اپنی سمت متعین کرنا۔ بائیں کندھے پر رکھو گے تو بھارت پہنچ جاؤ گے اور دائیں پر پاکستان" فرش پر موٹے شیشے کی عینک جمائے ایک ڈھلتی عمر کا پروفیسر اُس سے مخاطب تھا۔ خان کی نظریں اِس وقت آسمان میں اُس قطبین کو تلاش کر رہی تھیں۔

پھر اُسے یاد آ گیا کہ قطبین تو رات دو بجے کے بعد نمودار ہوں گی۔ تب تک اُسے کا ایک درست اندازہ قائم کر کے سفر اختیار کرنا تھا۔ اُس کا رُخ ڈھولن وال کی تھا۔ وہ اگر چاہتا تو بآسانی نتھا سنگھ کو مار کر واپس پاکستان چلا جاتا اور اگلے روز

Scanned with CamScanner by Qamar Abbas

کسی دوسرے لانچنگ پیڈ سے اُسے سرحد عبور کروا دی جاتی۔ لیکن اُس کی غیرت کو
یہ واپسی گوارا نہ تھی۔

خان نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ ڈھولن وال سے مناسب فا
برقرار رکھتے ہوئے آگے نکل جائے! اُسے بتایا گیا تھا کہ اس کے بعد اُسے ایک ن
عبور کرنا ہو گی۔

اب جنگلی گھاس کا سلسلہ قریباً ختم ہو چکا تھا اور وہ کھیتوں اور اُن کے کن
لگائے گئے درختوں کی آڑ میں کافی سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ و
جانتا تھا کہ "ناکہ" عموماً کسی جھاڑی کے نزدیک کسی درخت کے نیچے لگایا جاتا ہے
کیونکہ ناکہ لگانے والے بھی جانتے ہیں کہ اُن کا شکار اسی طرف آئے گا۔

گاؤں کے باہر نظر آتی روشنیاں مدھم پڑتے پڑتے اب ماند پڑ گئی تھیں شاید لو
تھک ہار کر سو گئے تھے۔ یہ بات تو خان سمجھتا تھا کہ اگر اب کوئی اُن کے گھروں سے
باہر ڈھول بھی پیٹنا شروع کر دے تو وہ لوگ جاگیں گے نہیں کیونکہ وہ شراب اور
تھکاوٹ کے مشترکہ شکار ہو کر گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔

اپنی جیب سے گھڑی نکال کر اُس نے وقت دیکھا رات کے ساڑھے بارہ بج
رہے تھے۔ گاؤں کے گرد ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ اپنی سمت اندازے سے صحیح درست
چل رہا تھا۔ آباد علاقہ اب پیچھے رہ گیا تھا اس لیے خان نے اپنی رفتار بھی بڑھا لی
تھی۔ اس کی آنکھیں مکمل ہوشیاری کے ساتھ اندھیرے کے آر پار جھانک رہی تھیں
ابھی وہ گاؤں سے بمشکل دو تین فرلانگ ہی دُور نکلا تھا جب اچانک ایک کوندا اُس
سے بیس پچیس گز دُور لپکا۔ اُس کے ساتھ ہی اُس کے دائیں بائیں چالیس پچاس گز دُور
ویسا ایک کوندا لپکا۔

"ٹاپ" — اُس کے ذہن نے سرگوشی کی۔

رات کو گشتی پارٹیاں اِس طرح ایک دوسرے کو سگنل دے کر آپس میں ملاپ کرتی
ہیں: "کون ہو سکتے ہیں؟" سوچتا ہوا وہ فوراً اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اور اگر وہ اندازہ اُس
جھاڑی کی طرف سرکنے لگا۔ جہاں اُس کے چھپنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ اُس کے
جھاڑی کے نزدیک پہنچنے تک ایسے مزید کئی کوندے لپکے تھے! خان نے اندازہ لگا
لیا تھا کہ یہ جو کوئی بھی ہیں کسی باقاعدہ فوج کا حصہ نہیں۔ پھر اُس نے سوچا اگر یہ
ایس۔ ایف نہیں تو کون ہیں؟ اتنے اندازی مقامی "ہوم گارڈز" ہی ہو سکتے
ہیں" اُس کے ذہن نے فیصلہ کیا۔

اُس کے عندیہ کی تصدیق چند منٹ بعد ہی ہو گئی۔ جب اُس سے محض آٹھ
دس گز دُور تین چار ہوم گارڈز اکٹھے ہو کر اُونچی اونچی آواز میں بولنے لگے۔ وہ
سب پیئے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور ہر بات پر قہقہہ بھی ضرور لگاتے تھے۔

اُنہی کی زبانی خان کو یہ علم بھی ہو گیا کہ ایک پاکستانی خطرناک جاسوس بھی
اسی علاقے میں گھوم رہا ہے۔ اِن گارڈز کا تعلق نزدیکی دیہات سے تھا اور قریباً
ایک گھنٹہ پہلے اُن کے گاؤں کے سرپنچ کو "پکی ٹلڑی" (آرمی) والوں نے جگا کر
اطلاع دی تھی اور کہا تھا کہ وہ گاؤں میں موجود "ہوم گارڈز" کو اِس طرف پہرہ
دینے کے لیے پھیلا دے۔

سرپنچ نے اُن کے سامنے "دلیالی کا رونا" رویا لیکن آنے والوں نے بتایا
کہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ انہیں بادلِ نخواستہ یہ حکم ماننا ہی پڑے گا۔ سرپنچ یا
ہوم گارڈز کی کیا مجال تھی کہ وہ انکار کرتے۔ اُن بے چاروں کے ہاتھوں سے بوتلیں
اور گلاس چھین لیے گئے اور اُن کی بجائے رائفلیں اور ٹارچیں دے کر انہیں اس
طرف بھیج دیا گیا تھا۔

یہ چاروں ہوم گارڈز "پاک سپائی" اور بھارتی آرمی کو بے تحاشہ گالیاں بکتے

رہے تھے جنہوں نے مل کر اُن کی دیوالی کا کباڑہ کیا تھا اور خان تولی ہی دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ وہ جلدی یہاں سے ہٹیں تو وہ آگے نکلے۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ بھارت کے سرحدی علاقے میں رہنے والے نوجوانوں کو معمولی سی ٹریننگ دے کر اُنہیں سرکار کی طرف سے رائفلیں دے دی جاتی ہیں تاکہ وہ رات کو اپنے اپنے گاؤں کی نگرانی کر سکیں۔ اور دونوں اطراف کے ناپسندیدہ عناصر سے نمٹ سکیں۔ اس کام کا اُنہیں گو کہ معمولی ہی سہی معاوضہ باقاعدہ دیا جاتا ہے۔

○

پانچ سات منٹ بعد وہ وہاں سے ہٹ کر ٹولی کی شکل میں بائیں کرتے اُسی راستے کی طرف چل دیے جس سے گزر کر خان یہاں آیا تھا۔ میدان صاف ہوتے ہی وہ باہر نکل آیا۔ یہ بات کسی عام اعصاب رکھنے والے ایجنٹ کے لیے بجلی کے زبردست جھٹکے سے کم نہیں تھی کہ اُس کے فرار کی خبر اردگرد کے دیہات میں پھیل چکی ہے اور فوج اور عوام مل کر اُس کے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں۔ لیکن خان فولادی اعصاب کا مالک تھا۔

یوں ہی تو اُسے اس خطرناک کام کے لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

چوکنے اور خونخوار چیتے کی طرح اُسے بہرصورت یہ ہانکا، توڑ کر نکلنا تھا۔ اس مرتبہ اُس کی رفتار قدرے تیز تھی۔ اگلے آدھ گھنٹے بعد وہ نہر کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ نہر اُس سے بمشکل دس بارہ گز دُور تھی۔ اور خان اُس کو عبور کرنے کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا کہ دوسرے کنارے پر روشنی کا ایک اور ہالہ بلند ہوا۔

پہلے تو اُس نے یہی قیاس کیا کہ یہ کسی مندیا کان پر کے گئے چند خاں کی روشنیاں ہوں گی لیکن اس کے دیکھتے ہی دیکھتے روشنیاں متحرک ہو گئیں۔ تب اُسے اندازہ ہوا کہ نہر کے پرلی طرف جیپ گھوم رہی ہے۔ شاید وہ لوگ اُسی کے استقبال

Scanned and PDF

کے لیے وہاں موجود تھے۔ نہر سے جیپ کا فاصلہ خاصا تھا۔ خان کو یاد آگیا۔ صوبیدار صاحب نے بتایا تھا کہ نہر سے قریباً آدھ میل دُور ایک پکی سڑک فوجی مقاصد کے لیے تعمیر کی جا رہی ہے۔ یہ جیپ شاید اسی سڑک پر رواں دواں تھی۔

اُسے فوراً ہی ایک فیصلے پر پہنچنا تھا اور خان جس فیصلے پر پہنچا اُسے عام حالات میں پاگل پن ہی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اُن حالات میں اُسے بہرحال یہی دلیرانہ فیصلہ کرنا پڑا۔ خان جانتا تھا کہ یہ گھیرا اُس کے گرد اگرد پھیلتا چلا جائے گا۔ وہ اگر اس جال سے نکل سکتا تھا تو صرف رات کے اندھیرے میں، رات ہی اُس کا سائبان تھی۔ اگر یہ سائبان ہٹ جاتا اور وہ اُجالے کی گرفت میں پھنس جاتا تو وہ لوگ دن کی روشنی میں ایک ایک انچ زمین پر اُسے ڈھونڈنے نکل پڑتے اور اس کے بچ نکلنے کے امکانات بالکل ہی ختم ہو کر رہ جاتے۔

اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنے گرد پھیلے اس جال میں سے راستہ بنا کر نکل جائے گا اور اُس کی بہترین صورت یہ تھی کہ وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس طرح غنیم بھی اپنا جال کھلا کرتا چلا جائے گا۔ اور بالآخر وہ کہیں سے بھی اس جال میں نقب لگا کر نکل سکے گا۔

○

اپنی جیب سے اُس نے پولی تھن پیپر کا بنڈل کیا ہوا ایک تھیلا نکالا۔ اپنے تمام کپڑے اُس میں بند کر کے اُس کے سرے کو مضبوطی سے گانٹھ لگا کر پیٹھ پر باندھ لیا۔ اسی تھیلے میں اُس کے لیے دوسری جوتی بھی رکھی تھی۔

اپنے پاؤں میں پہنے کینوس شوز اُس نے وہیں گڑھا کھود کر دبا دیے اور نہر میں اتر گیا۔ نہر میں پانی بہت کم تھا۔ کہیں کہیں اُسے تیرنا پڑا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اُس نے کپڑے پہنے اور جوتی پاؤں میں ڈال کر وہ تھیلا بھی وہیں

ایک کھیت میں دبا دیا۔ اب وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا اُس سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس سے تھوڑی دیر پہلے جیپ گزری تھی۔

سڑک تک وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ گیا۔ پھر دھڑکتے دل لیکن مضبوط اور پُراعتماد قدموں سے اُس نے سڑک بھی عبور کر لی۔ اب اُس کے کانوں میں آہستہ آہستہ کہیں بہت دُور ہونی "بھن کتا" کی آوازیں بھی آنے لگیں تھیں۔ پھر اُس کی نظریں آسمان کی سمت اٹھیں تو وہاں اُس کی سا ہبر "نظبین" بھی موجود تھیں۔ خان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک اُس نے راستے کی سمت نہیں کھوئی تھی ورنہ عموماً ہوتا یہی ہے کہ آدمی ساری رات کی بھاگ دوڑ کے بعد صبح یہی دیکھتا ہے کہ وہ جہاں سے چلا تھا وہیں کھڑا ہے۔

گھاس میں ہونے والی خلاف معمول ہلچل اور بھاگ دوڑ کے اثرات سرحد کے دوسری طرف بھی محسوس کیے جا رہے تھے۔ "وائیٹ لائن" کے ساتھ ساتھ گشت کرنے والی پیٹرول پارٹیوں نے فوراً ہی یہ اطلاع اپنی اپنی "پکٹ" پر پہنچا دی تھی۔ کہ بھارتی علاقے میں اچانک ہی بے تحاشا ریزر دفورس گھس آئی ہے۔ ایسا عموماً اُنہی حالات میں ہوتا تھا جب اُنہیں کسی خطرناک پاکستانی کی آمد یا واپسی کی خبر ملا کرتی تھی۔

ریجنرز کے کینٹ ہیڈ کوارٹر کی طرف سے فوراً ہی ایک "ریکی پارٹی" کو اُس طرف روانہ کیا گیا۔ جس نے تھوڑی ہی دیر بعد تمام صورتحال سے آگاہی دے دی۔ اُن کی حاصل کردہ اطلاعات کے مطابق بی۔ ایس۔ ایف کے نزدیکی ہیڈ کوارٹر سے تمام ریزرو فورس کو اس طرف ناکہ بندی کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔

ریجنرز کے کینٹ ہیڈ کوارٹر کی طرف سے تمام پاکستانی پوسٹوں کو "سٹینڈ بائی"

[illegible] کنے اور دن کی ڈیوٹی والے جوانوں نے بھی ہیر جنسی ڈیوٹی سنبھال لی۔

اس خبر پر سب سے زیادہ تشویش اُس پاکستانی پوسٹ کے پکٹ کمانڈر کو تھی جس کی [illegible]ٹ سے خان اور نتھا سنگھ نے کراس کیا تھا۔

پوسٹ کمانڈر خود ہاتھ میں رائفل پکڑے سرحدی لکیر کے ساتھ ساتھ گشت کرتی پارٹیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اُس کے حوالدار نے ایک سرحدی برجی کے پاس کھڑے ہوئے اُس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ مار کر اُسے خاص اشارہ کیا اس کے ساتھ ہی بجلی کی سی پھرتی سے دونوں اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ حوالدار نے جس سمت انگلی اٹھا رکھی تھی وہاں گھاس میں کسی کے بڑے احتیاط سے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

عموماً رات کے وقت جنگلی جانور بھی یہاں گھسے رہتے تھے۔ لیکن اس بات کا اندازہ دونوں سپاہیوں نے کر لیا تھا کہ اتنی احتیاط سے سُور یا گیدڑ وغیرہ نہیں چلا کرتے یہ یقیناً کوئی آدم زاد ہی تھا ——— پکٹ کمانڈر نے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے حوالدار کو وہاں سے ہٹ کر پوزیشن لینے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد اُن کی سمت ٹارچ جل کر بجھی۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ آنے والے "دوست" ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ دُشمن کی کوئی چال ہو اور انہیں دھوکہ دینے کے لیے ایسا کیا گیا ہو۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے حوالدار کو وہیں ٹھہرا ہونے کو کہا۔ اور خود اپنا ریوالور ہاتھ میں پکڑے آنے والے کا منتظر ہو رہا۔

نوولرڈ اسی برجی کے نزدیک آ رہا تھا ———

جب وہ نمودار ہوا تو چاند کی روشنی میں اُس نے رائفل سلنگ کے ساتھ کندھے سے لٹکا رکھی تھی اور دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا پکٹ کمانڈر اچانک ہی اُٹھ کر اُس کے سامنے آ گیا ——— اُس کے ریوالور کی نالی نوولرڈ کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔

Scanned and PDF by Qamar Abbas

"بالٹ: دو لنکارا۔

"فرنٹ: جواب ملا۔

"پہچان: پکٹ کمانڈر چوکنا تھا۔ حوالدار نے نوردار کو نشانے پر لیا ہوا تھا۔ جواب میں آنے والے نے خبر کو ڈوہرایا۔ اُسے سُن کر پکٹ کمانڈر کا ریوالور والا ہاتھ جھکتا چلا گیا۔ اُس نے نوردار کو جو بی۔ ایس۔ ایف کا کوئی حوالدار تھا اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اُس کی راہنمائی کرتا ہوا پکٹ کی طرف چل دیا۔

"غالباً آپ ہی پکٹ کمانڈر ہیں: پکٹ پر پہنچ کر لالٹین کی روشنی میں پکٹ انچارج کو پہچان کر نوردار نے کہا۔

"تمہارے لیے چائے:....

"نہیں سر۔ نوردار نے اُس کی بات کاٹ دی: میں بڑی مشکل سے نکلا ہوں: اور اگر تھوڑی دیر تک واپس نہ گیا تو بات بگڑ جائے گی۔ آپ میرا رابطہ فوراً جی سی ون سے کروا دیں، فوراً۔

○

کمپنی ہیڈ کوارٹر کے ذریعے نوردار کا رابطہ فوراً انٹیلی جنس کے کرنل صاحب سے کروا دیا گیا۔ اپنی "پہچان" کروانے کے بعد ذیلدار نے اُنہیں بتایا۔

"سر نتھا سنگھ ڈبل کراس ہو گیا تھا: پارسل نے اُسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور خود فرار ہو گیا ہے۔ اُس کی تلاش میں چاروں طرف ریزرو پھیل رہی ہے: دوسری طرف سے استفسار پر اُس نے اپنی معلومات کی حد تک واقعات سے انہیں آگاہ کر دیا: نوردار پکٹ کمانڈر کو دو: دوسری طرف سے کہا گیا۔

"یس سر! شہباز خان از آن دی لائن سر! پکٹ کمانڈر نے پھرتی سے چونکنا سنبھالا۔

"شہباز خان "دوست" کو احترام سے فوراً رخصت کر دو۔ خیال رہے معاملہ صرف تم

سے محدود ہے: دوسری طرف سے حکم ملا۔

"یس سر۔ اُس نے کہا اور رابطہ کٹ گیا۔

شہباز خان نے زبردستی نوردار کو چائے پلائی اور خود اُسے بُرجی تک چھوڑنے آیا تھا۔ یہ معاملہ اُس تک اور اُس کے حوالدار تک ہی محدود رہا تھا۔

کرنل صاحب نے دوسری طرف طویل سانس لے کر فون آہستہ سے کریڈل پر رکھ دیا۔ اُن کے ساتھ صوبیدار لال محمد بھی کھڑا تھا۔ کرنل صاحب نے ایک نظر بوڑھے صوبیدار انسٹرکٹر کی طرف ڈالی۔

"ویل ڈن ـــــ صوبیدار صاحب! آپ کے پٹھے نے حق ادا کر دیا: انہوں نے تعریفی نظروں سے بوڑھے صوبیدار کی تحسین کی۔

"تھینک یو سر: صوبیدار کا سینہ فخر سے تن گیا۔

کرنل صاحب نے اُسے تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کچھ ہدایات دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک "سپیشل میسج" بھنڈہ میں موجود "ڈیٹ" کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ کیوں کہ اُدنکا ریوری کی آمد و رفت اب بدل چکی تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ اپنے سفر کے آغاز ہی پر اُن کے ہونہار پٹھے نے ایک "ڈبل کراس" کا صفایا کر دیا تھا اور کئی دوسرے اِس کے شر سے محفوظ ہو گئے تھے۔

اُن کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اُن کا پٹھا، بھیڑیوں کے اِس ریوڑ کے قابو نہیں آ سکے گا۔ اور بخیریت "منزلِ مقصود" تک پہنچ جائے گا۔ وہ رات کرنل اور صوبیدار صاحب نے مصلوں پر گزار دی۔ ساری رات وہ سجدے میں گرے غازی خان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔

○

خان نے پانچ چھ میل کا مزید فاصلہ طے کر لیا تھا جب اُسے ایک اور گاؤں ملا

Scanned with CamScanner by Gamar Abbas

میں دکھائی پڑا۔ گاؤں کے مندر میں لگے لاؤڈ سپیکروں سے پورے شور کے ساتھ بھجن کیرتن کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا رات اسی گاؤں میں گزار دے یا یہاں سے نکل جائے۔

بالآخر اُس نے بائیپاس کاٹ کر آگے نکل جانے کی ٹھان لی۔ ابھی وہ گاؤں کی ایک سمت میں دو ڈھائی فرلانگ دُور ہی نکلا تھا جب اُسے کھیتوں کے سلسلے سے کچھ دُور گزرتی سڑک پر متحرک روشنیاں دکھائی پڑیں۔ ایسی ہی متحرک روشنی پھر بائیں طرف رینگتی محسوس ہوئی۔

"وہ گھیرے میں آگیا ہے کیا؟" خان نے سوچا۔

بات کچھ بھی تھی اب سیدھے آگے بڑھتے چلے جانا غلط تھا۔ اُس کی عقابی نظریں اُس ٹیلے کی طرف اُٹھ گئیں جو اُس سے کچھ دُور ایک دیرانے میں نظر آرہا تھا۔ شاید کسی کی سمادھی ہو۔ اُس نے سوچا کچھ بھی ہو۔ اُس کے لیے فی الوقت یہاں پہنچنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

خان کے قدم اُسی طرف اٹھنے لگے۔ قریب ہونے پر ٹیلے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ ایک کھنڈر کی شکل کا مندر تھا جس کو بڑ کے ایک گھنے درخت نے مکمل ڈھانپ رکھا تھا۔ بڑی بڑی جنگلی گھاس بھی چاروں طرف اُگی ہوئی تھی۔

خان نے یہ اُجاڑ مندر غنیمت جانا اور وہیں پناہ لینے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مندر کے ایک ٹوٹے پھوٹے حصّے کی طرف سے اُس کے اندر داخل ہو گیا لیکن اندر ہال کمرے میں مورتی دیکھ کر چونک پڑا۔ اُسے وہاں بھینی بھینی خوشبو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کافی تھی کہ یہ مندر اُجاڑ نہیں بلکہ آباد ہے۔ دبے پاؤں، محتاط اور چوکنا ہو کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ قریباً پانچ منٹ تک اُس نے وہاں گھوم پھر کر اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ یہاں کوئی ذی روح سوا اُس کے موجود نہیں ہے۔

اب وہ مورتی کے پیچھے جس کا بھیانک جبڑا کسی کو بھی نگلنے کے لیے کھلا ہوا تھا دیوار میں کھلی کھڑکی کے باہر اُس راستے پر جھانک رہا تھا جس سے وہ چل کر یہاں آیا تھا۔ اچانک ہی وہ چونکا ایک دیا جلتا ہوا اُس کی طرف آرہا تھا۔ پھر اُس دیئے کے پس منظر میں ایک ہیولا بھی دکھائی پڑا۔ بجلی کی سی پھرتی سے بلی کی طرح وہاں پر بھاگتا وہ باہر آگیا۔ جلدی میں اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا وہ ہال کمرے میں بنی جھروکوں کے ذریعے جو اتنی شکستہ تھیں کہ کسی کے اُن پر سے گزر کر اوپر پہنچنے کے امکانات بالکل ہی ختم ہو چلے تھے۔ ہال کمرے کی چھت پر کسی نہ کسی طرح پھسلتا، سنبھلتا پہنچ گیا۔

چھت میں دیوی سے کچھ فاصلے پر پرانی طرزِ تعمیر کے روشندان کے ذریعے جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اُس نے نیچے نظریں جما دیں: تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی وہاں آپہنچی گئی رات کی اس تنہائی اور اُجاڑ مندر میں وہ اُسے قرنوں پرانی کوئی دیوداسی یا اُس کی بچھڑی ہوئی روح دکھائی دے رہی تھی۔

دیئے کو اُس نے دیوی کے چرنوں میں رکھ دیا۔ جب اُس کا مکمل چہرہ خان کو دیئے کی پُراسرار روشنی میں نظر آیا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

عورت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے؟ اُس نے سوچا اور سوچتا ہی رہ گیا۔ اُسے ہال کمرے جیسے کمرے میں ایستادہ بھیانک شکل والی کالی ماتا اچانک ہی خوبصورت نوجوان کے روپ میں پرگھٹ ہو گئی ہو۔

اگلا منظر تو عابد خان کو بوکھلا دینے کے لیے بہت کافی تھا۔ پاربتی دیوی نے صاف کر مورتی کو سیس نوائے، اُس کے چرن چھوئے اور دیوی کو ماتھا ٹیکنے کے بعد اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُٹھ کر اُس کے چرنوں میں بیٹھ گئی۔

اُس کے لمبے سیاہ بالوں نے اُس کے کندھے اور کسی حد تک سینہ ڈھانپ رکھا

Scanned by CamScanner

تھا اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اُسے ہی گھُور رہی تھی۔ خان کو اپنی رگوں میں لہو کھولتا محسوس ہو رہا تھا۔

اِس عذابناک ماحول سے اُسے نجات جیپ کے انجن کی اُس آواز نے دلائی جو اب بڑی واضح اس کے کانوں میں گھُس آئی تھی ـــــ آواز کی سمت اُس نے نظریں دوڑائیں اور اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا: مندر کے دونوں اطراف سے دو جیپیں اُس طرف آ رہی تھیں۔ جن کی ہیڈ لائٹیں اُن لوگوں نے احتیاطاً بجھا رکھی تھیں۔ آہستہ آہستہ چلتی دونوں جیپیں مخالف سمتوں میں آ کر رُک گئیں۔

جال

"جال" ـــــ اُس کے لاشعور نے انگڑائی لی۔

خان کو یاد آ گیا: اُسے بتایا گیا تھا کہ "سرحدی مضافات میں قدم قدم پر بھارتی سُپر پاور نے ایسے ہی جال بچھا رکھے ہیں ـــــ وہ لوگ بشری کمزوریوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اور اُن سے فائدہ اٹھانے کے فن سے بھی اُنہیں آگاہی میسر تھی۔

لیکن یہاں مقابلہ فولادی اعصاب رکھنے والے خان سے تھا! ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھٹکا ضرور تھا لیکن گھبرانا تو جیسے اُس کی سرشت میں داخل ہی نہیں تھا۔

اُس نے چند ثانیے رُک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا:

جیپوں کی ہیڈ لائٹس اچانک ہی روشن ہو گئی تھیں۔ گھُور اندھیرے میں چلنے والی، روشنیاں اتنی تیز تھیں کہ سامنے کا ماحول یک دم برہنہ ہو گیا۔

ـــــ چھت سے چمٹے خان کی آنکھیں بڑی تیزی سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ اُس نے دونوں جیپوں سے مسلح سرحدی محافظ نکل کر مندر کے چاروں طرف پھیلتے دیکھ لیے تھے۔

وہ لوگ پہلے سے طے شدہ کسی منصوبے کے مطابق اِس علاقے کو گھیر رہے تھے۔ شاید یہ اُن کی کوئی ریہرسل تھی جو اب حقیقت کا روپ دھارنے لگی تھی! خان کے لیے سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ یونہی چھت سے چپکا رہتا

Scanned and Fit by Qamar Abbas

کی ستم ظریفی کا نظارہ کرتا رہے۔

وہ بے بس چوہے کی طرح اس جال میں پھنسنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اُس کے گرداگرد گھیرا اتنی شدت سے تنگ ہونے لگا کہ اب وہ واقعی مُقید ہو کر رہ گیا تھا۔

باہر کے ماحول کی سنگینی سے نجات حاصل کرنے کے لیے صرف ایک لمحے کو اُس نے دوبارہ چھت پر لگی سلاخوں میں سے نیچے نظر دوڑائی۔ ماحول کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

جیپوں سے نکل کر بھاگتے بی۔ ایس۔ ایف کے جوانوں کی آوازیں اور اُن کے افسران کی ہدایات اُسے بڑی واضح سنائی دے رہی تھیں، لیکن لڑکی تو جیسے پتھر کی بنی ہوئی تھی اور اب تو خان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہاں ایک کی بجائے دو پتھر کی مورتیاں دھری ہیں کیونکہ ایک ثانیے کو بھی لڑکی کے عالم استغراق میں فرق نہیں آیا تھا:

وہ اسی طرح دیوی کے سامنے آلتی پالتی مارے اور سینے پر دونوں ہاتھ باندھے مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بُڑبُڑا رہی تھی۔ خان کی تمام حسیات پوری طرح بیدار تھیں اور اس کا ذہن تو جیسے کبھی سویا ہی نہیں تھا۔

فی الوقت اس کے لیے یہیں چھت سے چپکے رہنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اُس نے چھت پر لیٹے لیٹے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ ایک کونے میں اُسے ایک ٹوٹی ہوئی "ٹٹی" کا احساس ہُوا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے سوچا کہ یہاں سے اُٹھ کر وہاں جا بیٹھے لیکن فوراً ہی اُس کے ذہن نے رہنمائی کی کہ اوپر آنے والے سب سے پہلے اِسی "ٹٹی" کی طرف آئیں گے:

اچانک ہی اس کے ذہن نے پلٹا کھایا اور اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں ——

اسے اپنی بوقوفی پر غصہ بھی آیا کہ اب تک اِس طرف اُس کا دھیان کیوں نہیں گیا۔

بوڑھے برگد کی بے شمار ٹہنیاں اُس سے تھوڑی ہی دُور مندر کی چھت پر پھیلتی چلی گئی تھیں۔ کسی میکانکی عمل کے تابع وہ بجلی کی سی پھرتی سے اُٹھا اور بنی ہوئی ٹٹی کے اوپر سے جُھک کر پنجوں کے بل چلتا ہوا درخت کی شاخوں تک پہنچ گیا۔

یہ اُس کی خوش قسمتی کہ تھوڑی دیر پہلے تک فضا بالکل ساکت تھی لیکن اب جب سے پچھم کی طرف ہوا نے ریںگنا شروع کر دیا تھا اور درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اتنی واضح تھی کہ اس کے ٹہنیوں پر چڑھنے کا احساس کسی کو دُور سے ہونا ممکن نہ تھا۔

عابد خان نے اپنا ہاتھ ٹہنی کی طرف بڑھا کر اُسے چھُوا تو جیسے ٹھنڈک کی ایک لہر سی اُس کے سارے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔ زمین پر پنجوں کے بل بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنے جسم کو ماہر بازی گروں کی طرح تولا اور دوسرے ہی لمحے وہ کسی بندر کی طرح اپنا جسم فضا میں تولتا ہُوا درخت کی ایک ٹہنی سے دوسری پر منتقل ہونے لگا تھا۔

بمشکل دو منٹ بعد ہی اُسے ایک جائے پناہ میسر آ گئی: درخت کی شاخوں میں وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ وہ حصہ اتنا گھنا تھا کہ سورج کی روشنی بھی چھن کر اندر نہ آ سکے۔ اس نے فوری طور پر فی الوقت یہیں چھپائے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

درخت کی اِس شاخ سے لپٹے اُسے قریباً دو منٹ ہو چلے تھے لیکن ابھی تک اس نے بھی مندر میں داخل نہیں ہُوا تھا! یہاں بیٹھے ہُوئے وہ اُن لوگوں کی باتیں تو سُن سکتا تھا لیکن اُن کی حرکات بخوبی نوٹ کر سکتا تھا: مندر کے گرداگرد پھیلے ہوئے کھنڈرات اور کھیتوں کے وسیع سلسلے میں اُس کو دُور دُور تک ٹارچوں کی روشنیاں بجھتی بجھتی نظر آ رہی تھیں —— آنے والے بڑی سرگرمی سے اُسے یہاں

Digitized by Qamar Abbas

کھوج رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک سائے کو مندر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہاں سے اُسے اندر کا منظر نظر نہیں آسکتا تھا۔ دروازے میں داخلے کے بمشکل ایک منٹ بعد ہی وہی شخص بوکھلایا ہُوا باہر نکلا اس نے زور زور سے دو تین آدمیوں کو نام لے کر پکارا۔

جیپ سے بڑی افراتفری میں دو آدمی بھاگتے ہُوئے اِس طرف آئے۔ اُن لوگوں نے ابھی تک ہیڈلائٹس روشن کر رکھی تھی۔ یہ اُن کی بوکھلاہٹ کی انتہا تھی اور خان درخت کی شاخوں میں چھپا اس بوکھلاہٹ سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ لوگ تھوڑی دیر تو آپس میں بحث کرتے رہے پھر تینوں گھوم کر اس راستے پر آگئے جس طرف سے ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں چھت کی طرف آتی تھیں۔

تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں سنبھل سنبھل کر سیڑھیوں پر قدم رکھتے اوپر آگئے۔ پھر تینوں میں سے ایک نے ٹارچ روشن کر لی اور باقی دونوں نے پستول پنے ہاتھوں میں پکڑ کر خود کو مکمل مستعدی کی حالت میں رکھا ہوا تھا! ٹارچ والے نے چھت پر روشنی پھینکنا شروع کی اُس کے ساتھیوں کے ہاتھ میکانکی انداز میں روشنی کے تعاقب میں گھومتے چلے گئے لیکن وہاں تھا کیا جو انہیں نظر آتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں ہی مایوس ہو کر نیچے اُتر رہے تھے۔

ان میں سے کسی ایک کا دھیان بھی درخت کی طرف نہیں گیا تھا! نیچے اُترنے کے بعد وہ تو فوراً ہی جیپوں کی طرف بھاگے جب کہ تیسرے نے مندر کے دروازے پر اُسی لڑکی کو کسی نام سے پکارا۔ لڑکی باہر آگئی۔ اس مرتبہ اُس نے اپنے بدن کو بڑے سلیقے سے ڈھانپ رکھا تھا اور بڑے باوقار انداز میں نپے تُلے قدم اٹھاتی جیپ کی طرف جا رہی تھی۔ اُس کے انوار سے تو بظاہر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ

[illegible] میں سینئر ترین آفیسر ہو سکتی تھی۔

پہلی جیپ بھی لڑکی اور اس کے ساتھیوں کے سوار ہوتے ہی ہوا ہو گئی۔ دونوں ہی نزدیکی کچی سڑک کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے آکر اُن لوگوں نے [illegible] تین مرتبہ ہارن بجائے۔ رات کے سناٹے میں جیپوں کے ہارن بجانے کی آوازیں [illegible] دھماکے سے کم نہیں تھیں جس درخت پر خان بیٹھا تھا۔ اُس سے اچانک [illegible] پرندے پھڑپھڑا کر اُڑے تھے۔ یہی صورتحال دوسرے درختوں پر بھی پیش [illegible] تھی۔

جیپوں کے ہارن دیتے ہی اُس کے سولر جو از کر بڑی پھُرتی سے چاروں [illegible] پھیل گئے تھے اب اُتنی ہی پھُرتی اور تیزی سے واپس جیپوں کی طرف بھاگے [illegible] تھے۔ اُن کے سوار ہوتے ہی دونوں جیپیں پھر کچی سڑک پر دوڑنے لگیں اور [illegible] خان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

○

اُن لوگوں کی روانگی کے قریباً پانچ منٹ بعد خان دوبارہ مندر کی چھت [illegible] آچکا تھا۔ بھلے کچھ عرصے ہی کے لیے سہی وہ ہانکا کرنے والوں سے محفوظ ہو [illegible] تھا ـــــ لیکن بہت دیر تک نہیں! خان بخوبی جان سکتا تھا کہ مقامی ہوم گارڈز [illegible] اُس کی جان چھُٹتے چھُٹتے ہی چھُٹ سکتی تھی۔ ان لوگوں نے میلوں تک [illegible] علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اور اس مندر جیسے ابھی اور نجانے کتنے جال [illegible] راستے میں بچھے ہُوئے تھے۔

مندر کی چھت پر پہنچ کر اُس نے ایک لمحے کے لیے اپنی حالت پر نظر ڈالی اور [illegible] صورتحال کے متعلق سوچ کر مسکرا دیا ـــــ اُسے بھانے خوف کے دشمن کی [illegible] پر رحم آرہا تھا۔ جو شکاری کتوں کی طرح اُس کو کھوج رہا تھا اور وہ اُن کے

Scanned by CamScanner

ہاتھوں میں آکر پھسل گیا۔

طاہت کی سنگینی پر غور کرتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر خود سے عہد کیا کہ
وہ پکے پھل کی طرح دشمن کی جھولی میں گرنے کی بجائے مرجانے کو فوقیت دے گا!

مندر کی چھت پر کھڑے کھڑے اس نے آسمان کی طرف نظریں دوڑائیں: جہاں
تک اُسے ایک ستارہ بھی آسمان پر چمکتا دکھائی نہ دیا ـــــ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں جنہوں
نے سرِشام ہی آسمان پر نمودار ہونا شروع کر دیا تھا اب ایک تسلسل سے اکٹھی ہو کر
پھر بادل کی شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔

ہوا کی شدت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اُسے ہوا میں
خنکی بڑھنے کا احساس ہُوا جو اس بات پر دلالت کر رہا تھا کہ دور کہیں بارش ہو
رہی ہے۔

اُس کے عزم مستقل اور ارادے کی پختگی پر شاید قدرت بھی اُسے کسی انعام
سے نوازنا چاہتی تھی۔ وہی ہوا ـــــ جیسے ہی وہ مندر کی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا
ٹپ ٹپ کرتی بارش کی بوندیں اس کے استقبال کو لپکیں۔ بے اختیار اُس کے
دل میں احساس تشکر جاگا۔ وہ اس نعمتِ خداوندی پر جھوم ہی تو اُٹھا۔ مندر میں رُکا
کر ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کی بجائے اُس نے رختِ سفر باندھا۔

اپنے زیرِ جامہ کی ایک محفوظ جیب سے پیراسوٹ برساتی نکال کر اُس نے برساتی کپڑے
کھولیں اور پہن لی۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں چھانے کی وجہ سے اُس طرف سے کسی بھی
راہنمائی کی توقع عبث تھی۔ صحیح سمت متعین کر کے وہ بے دھڑک اُسی طرف
چل دیا۔

○

پچھلے تین چار گھنٹوں کی مسلسل بھاگ دوڑ نے اُسے ذرہ بھر بھی تھ

ا تھا۔ اُس کے قدم اُسی مضبوطی اور اطمینان سے اُٹھ رہے تھے جس طرح اس مہم
کے آغاز میں اُٹھے تھے۔ بارش میں بھیگ کر وہ خاصا سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

شفق پر اب لو پھوٹنے لگی تھی اور آسمان پر گہرے بادل چھا جانے کے باوجود
اب سُرخ لکیر اُسے دور مشرق میں پھیلتی نظر آ رہی تھی۔ اس لکیر نے ماحول پر اپنی
ت آہستہ آہستہ مضبوط کرنا شروع کر دی تھی اور آسمان جو اُس سے پہلے بالکل
ا ہو رہا تھا۔ اب قدرے گلابی نظر آنے لگا تھا۔

صبح کی آمد آمد تھی اور اُسے ابھی ایک لمبی مسافت پانا تھی۔ اس مرتبہ اُس
ے ظاہر تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر کچی سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر
ا تھا۔ خان کو اندازہ تھا کہ اِس سڑک کا خاتمہ اُسے اس قصبے سے باہر پکی سڑک
ے جائے گا جس کے بعد اُس کے لیے قدرے سہولت ہو گی۔

بارش کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُس کے قدموں میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔
ل شدت میں بھی اب بارش کے ساتھ ساتھ اضافہ ہونے لگا تھا اور ہوا کے
ے ہوئے تھپیڑے اس کے جسم پر بوچھاڑ کی طرح برس رہے تھے۔ اپنی سمت صحیح
ے کے لیے وہ اب تک تین چار مرتبہ رک کر اندازہ کر چکا تھا۔

○

ی سڑک کا خاتمہ بالآخر حسب توقع ایک پکے راستے پر ہُوا۔ بارش کی شدت
ے خاصی کمی آ گئی تھی۔

ا ہوا بادلوں کو اُڑا کر دُور لیے جا رہی تھی! ابھی تک دُور دُور تک اُسے
ل ہوش کا نام و نشان نظر نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے نزدیکی آبادی کے لوگ
ے چکے ہوں۔ لیکن کسی نے ابھی تک گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

ت بھر کی مسلسل بھاگ دوڑ کے اثرات اب اس کے جسم نے قبول کرنے

Scanned with CamScanner by Qamar Abbas

شروع کر دیے تھے۔ بارش کی وہ مسلسل بوچھاڑیں جو اس کے بدن پر برسی تھیں۔ انہوں نے اب اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے جسم میں آہستہ آہستہ درد جاگنے لگا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے بخار کا احساس ہوا، لیکن اُس نے اس سب کچھ پر قابو پانا تھا جس کے لیے ذہن کی بیداری ضروری تھی۔

صبح کی آمد نزدیک دیکھ کر اُس نے قریبی درختوں کے جھنڈ کا رُخ کیا۔ اپنی کمر سے بندھے کینوس کے تھیلے کو کھول کر اس نے مقامی دیہاتوں میں عام طور پر پہنا جانے والا کھلے پائنچوں کا لکیردار پائجامہ اور کُرتا نکال لیا۔ اپنے جسم سے چپکے گیلے کپڑے بھی اُس نے الگ کر دیے۔

اس مختصر سے تھیلے سے مقامی موچیوں کی بنی ہوئی دیہاتی طرز کی ایک جوتی بھی برآمد ہوئی تھی! اپنے گیلے کپڑے اُس نے اُسی تھیلے میں ٹھونس دیے خشک کپڑے پہنے اور تھیلے کو قریبی کھیت کی مٹی میں دبا دیا۔ فی الوقت تو یہی اُس کا مکمل اسباب تھا۔

قریبی مندر کے لاؤڈ سپیکر اچانک ہی جاگے اور چنگھاڑنے لگے تھے کوئی ڈوبتی عمر کا پروہت اُلٹے سیدھے اشلوک بڑی تیزی سے پڑھ رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسے یہ اس کے لیے کوئی معمول کی کارروائی تھی جسے بہرحال اُسی کے ہاتھوں انجام پانا تھا۔

مندر کے پس منظر میں نظر آتے دیہاتی گھروں کی روشنیاں بھی اب جلنے لگی تھیں۔ وہ جس علاقے میں پہنچ چکا تھا وہاں بجلی موجود تھی۔ یوں تو اب وہ کم از کم ہر قسم پر پھیلے سیکورٹی کے وسیع جال کو توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اب بھی وہ اتنا ہی غیر محفوظ تھا جتنا کہ اِس مہم کے آغاز پر۔

عابد خان کو علم تھا، کہ بھارتی سیکورٹی کا جال تہہ در تہہ پھیلتا چلا گیا ہے اور

اُس کا نشانہ بننے والے ابھی اس کے راستے میں بکھرے پڑے ہیں۔

گاؤں کی جلتی روشنیاں اس بات پر دلالت کر رہی تھیں کہ زندگی اب یہاں بیدار ہونے لگی ہے۔ خان نے ہوشیار اور چوکنے چیتے کی طرح اپنی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ اُس کی پُشت پر اور دائیں بائیں بھی حدِ نگاہ تک کھیتوں کے وسیع سلسلے پھیلتے چلے گئے تھے۔ کہیں کہیں ہریالی کے بیچوں بیچ کچے مکانات کا سلسلہ بھی سر اُٹھاتا دکھائی پڑتا تھا۔

سورج نے اب مشرق کی سمت سے اپنی سنہری روشنیاں آسمان پر بکھیرنا شروع کر دی تھیں اور سُرخ دہکتے الاؤ کا ایک ہالہ حدِ نگاہ تک پھیلنے لگا تھا۔ چند لمحے اُس جانب ٹکٹکی لگا کر خان نے کچھ سوچا پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو رہا۔ ابھی تک سورج نے اپنا چہرہ باہر نہیں نکالا تھا۔ شاید اِس نوجوان کے عزم کے سامنے اُسے سر اٹھانے کی جرأت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

خان نے کچھ وقت گزار کر کم از کم دوپہر کے بعد وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب اُسے دوپہر تک کا یہ وقت بہرحال یہاں گزارنا تھا۔ پہلے اُس نے سوچا کہ کھیتوں کے سلسلے ہی میں چھپ کر بیٹھ رہے لیکن اب وہ اپنی ظاہری حالت بگاڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ بہرحال یہ دن کا وقت تھا اور وہ کسی کی بھی نظروں میں آسکتا تھا۔

اُس نے چاہا صبح دس بجے تک کا وقت کم از کم مندر کے اردگرد گزار دے جہاں اکثر لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا اور اُس کی طرف شاید ہی کوئی متوجہ ہوتا۔ اندازہ تھا کہ ابھی تک تو مندر میں سوائے پروہت اور دو تین پنڈتوں کے کوئی نہیں پہنچا ہوگا۔ وہ مندر میں بھی اُس وقت داخل ہونا چاہتا تھا جب سارے لوگ آچکے ہوں۔

Scanned by CamScanner

یہی کچھ سوچتا خان وہاں سے ہٹ کر درختوں کے اُس سلسلے کی طرف چل دیا جو گاؤں سے مندر کو جانے والے راستے پر اُسے نظر آ رہا تھا یہاں اُسے تھوڑی دیر تک چھپنے کے لیے بہرحال جگہ میسر تھی۔

سورج نے اب اپنا چہرہ خاصا نمایاں کر لیا تھا۔ گیلی زمین پر اس کی روشنی بڑے تسلسل سے آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی اور گاؤں سے مندر کی طرف جانے راستے پر اب خاصی آمدورفت شروع ہو چکی تھی خان کو یہاں کھڑے کھڑے اب اپنی ٹانگوں میں بڑا واضح درد محسوس ہونے لگا تھا۔ شاید بخار نے اپنا زور دکھایا تھا۔ اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اپنے زیرِ جامہ میں ہاتھ ڈال کر اُس نے پولی تھن کا ایک چھوٹا سا لفافہ نکالا اور اس میں رکھی دونوں گولیاں بغیر پانی کے ایک کے بعد دوسری نگل گیا۔ اُسے اب کم از کم اتنا اطمینان ضرور تھا کہ نین چار گھنٹے درد کی اذیت سے نجات مل رہے گی۔

گولیاں نگلتے ہوئے اُس کے منہ میں خراش سی پڑ گئی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اُس نے گولیاں زہر مار کر ہی لیں۔ درخت سے ٹیک لگا کر اُس نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے جیسے فضا میں موجود ساری ہی مقناطیسیت اپنے اندر سمو لینا چاہتا تھا۔ جادو اثر گولیوں نے معدے میں اُترتے ہی اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا اور دو تین منٹ بعد وہ اپنے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے قدرے نجات پا چکا تھا۔

○

مندر کی طرف اب لوگوں کی آمدورفت خاصی بڑھ گئی تھی۔ سامنے کا سارا ماحول ہی اب سورج کی روشنی میں نمایاں ہونے لگا تھا۔ رات کی شدید بارش سے دُھلے ہوئے درخت اور سبزہ آنکھوں کو بہت بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک تازگی اور

تراوٹ سی اُسے اپنے اندر اُترتی محسوس ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر دو تین گہری سانسیں بھر کر وہ درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ اب اُس کا رُخ بھی مندر کی طرف تھا۔

اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلا کر اُس نے زوردار انگڑائی لی اور بدن میں موجود توانائیوں سے مطمئن ہو کر نپے تُلے قدموں سے مندر کی طرف چل دیا۔ مندر کے لاؤڈ سپیکروں کے شور میں اب گورد واروں کا بے ہنگم ساز بھی شامل ہو گیا تھا شاید یہاں ہندو آبادی سکھوں سے کم تھی اسی لیے نزدیکی تین چار دیہاتوں کے لوگ اس مندر میں آتے تھے۔

لاؤڈ سپیکر اتنی زور زور سے چلا رہے تھے کہ اُسے کسی کی کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ گاؤں کی طرف سے آنے والے راستے کا ایک موڑ مڑتے ہوئے اچانک ہی اُس کی نظر اُن دو گنجے سر والے ہندوؤں پر پڑی تھی جنہوں نے اپنی دھوتیاں ایک مخصوص انداز میں اُوپر کو چڑھا رکھی تھیں، ہاتھوں میں پیتل کی گڑویاں پکڑے وہ دونوں کھیتوں کی سمت جا رہے تھے۔ ماتھے پر سفید چاک کی تین لکیروں نے دونوں کے چہروں پر برستی لعنت میں قدرے اضافہ کر دیا تھا۔ دونوں ہی منہ میں کچھ انٹ شنٹ جاپ کرتے ایک دوسرے کے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔

خان پر نظریں پڑتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکے شاید نئے چہرے نے انہیں متجسس کر دیا تھا اس سے پہلے کہ اُن کے کھلے منہ کے دہانے کوئی بھی اگلتے خان کے ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف اُٹھے اور اُس نے ہاتھ باندھ کر بڑے درباری قسم کے ہندوؤں کے سے انداز میں اُنہیں "رام رام" کہہ دیا۔

"رام۔ رام" دونوں کے منہ سے بادلِ نخواستہ نکلا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ پوچھیں خان "جے بھوانی" "جے بھوانی" کہتا تیزی سے اُن کے نزدیک سے آگے گزر گیا۔

Scanned by Omar Abbas

دونوں ہونقوں کی طرح اُسے منہ اٹھائے دیکھتے رہے۔ تب اُس نے پلٹ کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھا تو وہی انٹ شنٹ الاپتے وہ دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل دیے۔

مندر کے باہر ہی اُسے خاصے لوگ نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ اندر بھجن کتھا اپنے عروج پر تھی۔ ہارمونیم، ڈھولک اور چھینوں کے ساتھ کورس کی شکل میں ہل کر گانے والوں کی عجیب و غریب اور بے سُری آوازوں نے ایک حشر برپا کیا ہوا تھا۔ خان کو یہاں آکر دوبارہ خوامخواہ اپنے سر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔

اُس نے دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی اپنے جوتے اُتار کر ایک طرف رکھ دیے! دو تین سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مندر کی عمارت آگئی تھی۔ مندر خاصا پرانا اور شکستہ حال دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے ایک کونے میں لٹکتی گھنٹیوں میں سے ایک گھنٹی کو زور زور سے بجا کر پھر جے بھوانی" پکارا اور آگے بڑھ گیا۔ اچانک ہی اندر پھیلی "دھوپ" اور "اگر بتیوں" کی خوشبو کا جھونکا اُس کی ناک میں گھس آیا۔

سامنے ہال نما کمرہ عورتوں اور مردوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک کونے میں بھجن کتھا کرنے والے اپنا گلا پھاڑ رہے تھے اور دوسرے کونے میں ایک پروہت دیوی کے سرہانے بیٹھا عبادت کو آنے والوں سے کچھ نہ کچھ اینٹھنے کے چکر میں نظر آرہا تھا۔

مندر کے نزدیک پہنچنے سے پہلے عابد خان نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کی ایک جیب میں زیرِ جامہ سے سو روپیہ نکال کر الگ رکھ لیا تھا۔

اس نے بڑے پرانے برہمنوں کی طرح کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے سر کو جھکایا۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک کر سامنے رکھی مورتی کے قدموں میں سو روپیہ رکھ کر دوبارہ ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

پجاری نے اپنے سامنے دھرے تھال میں انگلی لگائی اور منہ سے کچھ بولتے ہوئے اُس کے ماتھے پر تلک جما دیا۔ خان نے دوبارہ دیوی کے چرن چھوئے اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پانچ چھ قدم وہ انہی اُلٹے پاؤں پر چلا تھا پھر اُس نے چاہا کہ اپنا رُخ بھجن کتھا کرنے والوں کی طرف موڑے۔

جیسے ہی اُس نے گردن گھمائی اچانک ایک برقی رو اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی! اُس کی نظریں ایک کونے میں کھڑی اُس دیوی پر جا پڑیں جسے اس نے آج رات ہی اُس پُراسرار مندر میں دیکھا تھا لیکن یہاں وہ رات کی نسبت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اُس نے بڑے سلیقے سے دوپٹہ اپنے سر پر سجا رکھا تھا اور مخصوص طرح کے مذہبی براہمن گھرانوں کی کوئی انتہائی کم عمر لیکن بڑی ہی مدبر لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

اُس لمحے خان کے لیے باعثِ تسکین صرف یہی بات تھی کہ اس لڑکی نے رات اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا ضرور تھا لیکن فولادی اعصاب کے مالک خان نے دوسرے ہی لمحے خود کو مکمل نارمل کر لیا۔

دشمن کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ خان کو ہر قیمت پر گرفتار کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُسے یہ خوش فہمی تو کبھی رہی نہیں تھی کہ جس مندر میں وہ جا رہا ہے وہاں اس کے استقبال کے لیے کوئی موجود نہیں ہو گا لیکن یہ بات تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ یہاں پھر وہی رات والی لڑکی اُس کی منتظر ہو گی۔

رات درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے خان نے اُس کی باوقار چال سے اس بات کا اندازہ بھی بخوبی لگا لیا تھا کہ یہ انٹیلی جنس کی کوئی بڑی افسر ہے۔ لڑکی کے چہرے پر پھیلی آنکھوں میں نجانے ایسا کیا سحر چھپا تھا کہ خان کو اس کے

Scanned with CamScanner
Osmar Abbas

چہرے سے نگاہیں ہٹانے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔

○

جانے کیا جادو تھا ان آنکھوں میں ـــــ!!

بدقت تمام اُس نے اپنی توجہ دوسری طرف مرکوز کی اور قریب ہی ایک کونے میں تھوڑی سی جگہ خالی دیکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ کتھا کرنے والوں کی آوازوں کے ساتھ آواز ملا کر گا رہا تھا۔ اِس دوران کن انکھیوں سے دو تین مرتبہ لڑکی کی طرف بھی دیکھ چکا تھا جو حاضرین کی موجودگی سے بالکل بے نیاز ایک کونے میں بیٹھی بھجن کتھا میں مستغرق تھی۔

ایک مرتبہ جب خان نے چوری چھپے اُس کی طرف دیکھنا چاہا تو اچانک ہی دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ فوراً ہی اُس نے اپنی نظر دوسری طرف پھیر لی تھی لیکن اِس دوران شاید لڑکی نے اُس کی چوری پکڑ لی تھی اِس لیے جب خان نے دوبارہ کن انکھیوں سے اُسے دیکھنا چاہا تو لڑکی پہلے سے اُس کی طرف متوجہ تھی۔

جیسے ہی خان کی نظریں اُس سے ٹکرائیں وہ مسکرا دی۔ خان جھینپ سا گیا لیکن لڑکی کی بے باکی میں کوئی فرق نہ پڑا۔

وہ کتھا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوبارہ اُس نے گو کہ لڑکی کی طرف چوری چھپے بھی دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ لڑکی اب بھی اُسی کی طرف متوجہ تھی! عبادت کو آنے والے اب واپس لوٹنے لگے تھے۔

دو زائر یہاں آنے والوں میں سے ایک دو نے خان کے اجنبی چہرے کو متجسس نگاہوں سے دیکھا لیکن ان نظروں میں تشکیک نہیں تھی۔ اُس نے جیسے

اٹھنے کا ارادہ کیا۔ اچانک ہی ایک درمیانی عمر کا گنجے سر والا ہندو اندر داخل ہوا۔ اُس کی نظریں لڑکی پر جمی تھیں۔ خان نے واضح طور پر محسوس کر لیا کہ اُس نے انہی آنکھوں میں لڑکی سے استفسار کیا تھا یا پھر اُسے کچھ اشارہ کیا تھا۔ لڑکی نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔ دونوں کی طرف دیکھنے کی یہاں کسے ہمت نصیب تھی بس ایک خان تھا جس کی چھٹی حس نے اُس کی راہنمائی اُس کی کر دی تھی۔

گنجا اب لڑکی کے نزدیک ہونے لگا تھا۔ پھر وہ مورتی کو ماتھا ٹیک کر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دونوں اسطرح جھک کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے کہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

خان نے اچانک ہی اٹھنے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا اُس کے بجائے وہ اٹھ کھڑا ہوا ـــ شاید اُسے لڑکی نے کوئی بریفنگ کی تھی جس پر وہ عمل کرنے جا رہا تھا۔

بھجن سُنتے سُنتے اب اُس کا سر دوبارہ درد کرنے لگا تھا۔ یوں بھی اب سورج ڈوبنے آیا تھا اور لوگوں کی اچھی بھلی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے یہاں سے اُٹھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جس اُن لمحات میں جب وہ اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا اُس نے لڑکی کی طرف اُٹھتے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آنکھوں میں عجیب سا انداز سمٹ آیا تھا۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی جو فوراً ہی خان کے ذہن میں بج گئی تھی۔ اُس نے ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو کسی بھی آمدہ طوفان سے نمٹنے کے لیے تیار کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

○

Scanned and PDF by Qamar Abbas

لڑکی کے وہاں پہنچنے تک وہ خود لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ لڑکی کا رُخ مخالف سمت سے اُس طرف تھا۔ دروازے سے چند قدم پہلے ہی وہ بالکل اُس کے نزدیک آگئی پھر اچانک ہی اُس سے ٹکرا بھی گئی۔ یہ ٹکرا بڑا جان لیوا اور اُلجھا دینے والا تھا لیکن خان کا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔

لڑکی نے گو کہ اس ٹکراؤ کے اچانک ہو جانے کی شاندار ایکٹنگ کی تھی لیکن خان بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور یہ لوگ اب اُس کی چھان بین کیے بغیر اُسے یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔

"شکریہ" ــــ لڑکی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں" ــــ اُس نے خود کو بالکل نارمل رکھا اور اُٹھ کر باہر کو چلا۔

لڑکی اِس کے تعاقب میں تھی۔ باہر رکھے جوتے پہنتے ہوئے اُس نے اُچٹتی ہی آنکھوں میں باہر کے ماحول کا جائزہ لے لیا تھا۔ اُسے گنجے کے علاوہ بھی دو ایک اور چہرے مشکوک نظر آرہے۔ یہ لوگ بظاہر بالکل لاتعلق سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ بکھرے ہوئے کھڑے تھے۔

"کہاں جائیں گے آپ؟" لڑکی نے اچانک ہی اُس پر سوال داغ دیا۔

"شہر کی طرف" ــــ اُس نے جھکے جھکے جواب دیا۔

"مجھے بھی اُدھر ہی جانا ہے۔ چلو اچھا ہے ساتھ رہے گا" لڑکی نے فوراً کہہ دیا۔

خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہاں وہ اُس کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اُسے ڈانٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ اُس کی پیش کش ٹھکرا دیتا تو اس معاشرے میں یہ بڑی عجیب سی بات ہوتی اور وہ خوامخواہ مشکوک ٹھہرتا۔

"چلئے" ــــ اُس نے اچانک ہی تن کر کھڑے ہوتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

اُس منظر سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیئے۔ خان نے خود کو حال سے بالکل لاتعلق ظاہر کرنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی تھی۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی جا رہی ہے۔ اس احساس نے اس کے لاشعور میں دُور دُور تک بھی کہیں خوف موجود ہے اُسے بڑی اُلجھن میں ڈال رہا تھا۔ اُسے خود پر غصہ آنے لگا تھا کہ آخر لاشعوری طور پر ہی سہی وہ خود کو خوفزدہ کیوں محسوس کر رہا ہے۔

اُس کے ذہنی رویے نے اب اُس کے اندر بہت دُور کہیں لذتی خوف کی کیفیات بھی ختم کر ڈالی تھیں اور وہ ایک مرتبہ پھر مکمل طور پر اپنے آپ میں واپس لوٹ آیا تھا۔ کسی بھی صورتحال سے ٹکرانے کے لیے بالکل تیار۔

اُس کی چھٹی حس نے اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ اُس کے ساتھی بھی اُسی طرح اُس کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور کسی لمحے اگر اس لڑکی کو خان سے گزرا تو اُس کا صرف ایک اشارہ خان کے لیے کافی ہوگا۔

"کہاں رہتے ہیں؟" ــــ لڑکی نے دوبارہ اُسے کریدا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟" ــــ اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"لگتا ہے آپ بُرا مان گئے۔ دراصل میں نے آپ کو یہاں پہلی مرتبہ دیکھا تھا"

"جب دیکھا ہے میں یہاں پہلی مرتبہ ہی آیا ہوں! یہ جو ریلوے لائن کے پرلی طرف ہے وہاں میں آیا ہوں، میری بہن یہاں بیاہی گئی ہے ــــ میرے بہنوئی ایس ایف میں ہوتے ہیں" ــــ وہ لڑکی کو بولنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

"آپ رہتے ہیں آپ وہاں؟" ــــ

Scanned and PDF by Qamar Abbas

"پڑھتا ہوں فورتھ ایئر میں۔"

"اب شہر بھی بتا ہی دو۔۔۔۔" لڑکی کا لہجہ خاصا بے تکلف ہو چلا تھا۔ خان حوصلہ مندی سے خود کو سنبھال رہا تھا۔

"لدھیانہ۔۔۔۔"

"اوہ۔۔۔۔ یوں کہو ناں۔ ہم بھی وہاں کے ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں گھر ہے۔ میں بھی یہاں مہمان آئی ہوں۔ اپنے چچا کے گھر۔ وہ پولیس کے افسر ہیں۔ یہاں اُن کی ڈیوٹی لگی ہے۔"

"۔۔۔۔ ارے! میں نے تو تمہارا نام ہی نہیں پوچھا۔۔۔۔" اُس نے اس کے بازو پر ہاتھ بھی مار دیا تھا۔

"راج کمار۔۔۔۔" اُس نے متانت سے کہا۔

"میں بملا ہوں۔ بملا چٹوپادھیائے۔ میں بھی گریجویشن کر رہی ہوں۔ خالصہ سے۔ کون کالج ہے آپ کا؟"

لڑکی واقعی سدھائی اور سمجھائی ہوئی لگتی تھی اور خان محسوس کر سکتا تھا کہ اکیلی بھی نہیں ہے۔ اُس کے لیے کوئی بھی مسئلہ پیدا کر سکتی ہے جیسے ہی خان پر شک ہوتا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کو اشارہ کرتی اور۔۔۔۔ اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے خان پر شک ہو بھی چکا ہو۔ اب وہ اس کی تصدیق یا مزید کسی کلو کی تلاش میں ہو۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ کاش یہ ملاقات لدھیانہ میں بھی ہو رہے۔۔۔۔" اُس نے اچانک ہی ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد اپنا لہجہ بدل لیا۔

"اوہ کیوں نہیں۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔" لڑکی نے اُس مرتبہ پھر بڑی بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

جس راستے پر وہ چلے جا رہے تھے اس کے دونوں طرف کھیتوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ان کھیتوں کے بیچوں بیچ چلنے والے اُسے نظر بھی نہیں آ سکتے تھے جو اس کی تھا کہ اس کے ساتھی اس سلسلے میں کہیں کسی گوشے میں چھپے اُن کی نگرانی کر رہے ہوں۔

لے لائن اُن کے نزدیک آ گئی تھی پھر اُسے گاڑی کے انجن کی آواز بھی دینے لگی۔ فوراً ہی اُس کا ذہن پلٹا اور اُس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ لڑکی سے معاملہ کرنے اور اپنے تعاقب میں آنے والوں سے بچ کر نکل جانے کا

وہ ریلوے لائن کے نزدیک پہنچ چکے تھے یہاں کوئی پھاٹک نہیں بنایا گیا تھا۔ کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی۔ وہ لائن سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے گاڑی کے گزرنے کے بعد ہی دوسری طرف جائیں۔ اس دوران خان لڑکی کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جو واقعی کسی بھارتی ہندو نوجوان کی نظریں کہلا سکیں۔ ہوس سے بھرپور نظریں۔۔۔۔ گاڑی نزدیک آ رہی تھی۔ اور نزدیک۔ اب اس کا انجن بس گز دو گز رہ گیا جب وہ اچانک لڑکی کی طرف گھوما:

اپنے دونوں بازو سیدھے کیے اور پوری قوت سے دو ہتڑ اُس کے کندھے کے لیے یہ حملہ اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ وہ صدمے ہی گئی۔۔۔۔ وہ لڑکھڑاتی کھاتی دور جا گری اور شاید زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔

اس کی حالت دیکھنے کے لیے رکا کب تھا؟

○

بس گز دور تھا جب وہ اپنے قدموں پر اُچھلا اور ایتھلیٹوں کی طرح

Scanned with CamScanner Omar Abbas

اپنے جسم کو تولتا ہوا ہوا میں لمبی زقند بھر کے ریلوے لائن کے پار جا گرا۔

—— اُس کے اِس عمل کا مکمل نظارہ اگر کسی نے گاڑی میں سے کیا بھی تو بھی اُس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا۔ کیونکہ لڑکی اور اُس کے درمیان خاصی لمبی ٹرین حائل تھی۔

خان دیوانہ وار کھیتوں کے اندر ہی اندر بھاگ رہا تھا۔ اُس کے حساس کانوں نے اِس دوران ریوالور سے کی جانے والی فائرنگ کی آواز سُن لی تھی گو کہ ٹرین کے شور میں یہ آوازیں خاصی دبی ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ یہ جان گیا تھا کہ لڑکی کے ہمراہی ہوا میں فائرنگ کر کے شاید اپنی بوکھلاہٹ کو کسی طور کم کرنے میں کوشاں تھے۔

اتنی خطرناک صورتِ حال کے باوجود اُن لوگوں کی بے بسی پر بھاگتا ہوا مسکرائے بغیر نہ رہ سکا: وہ چشمِ تصور سے ریلوے لائن کے دوسری طرف موجود لوگوں کو غصّے سے ہونٹ کاٹتے دیکھ رہا تھا۔

جب تک گاڑی گزرتی اور وہ لوگ لائن عبور کر کے دوسری طرف آتے عابد خان اُن کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ گھنے اور اُونچی اُونچی کماد کی فصل سے بھرے کھیتوں میں دو ڈھائی فرلانگ دُور جا چکا تھا۔

اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پچھلے بیس گھنٹوں سے وہ اپنے آپ سے اعصاب شکن جنگ لڑ رہا تھا۔ لیکن حوصلہ ہارنا تو جیسے اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ کھیتوں کے سلسلے سے اب وہ باہر نکل چکا تھا اور اپنے بائیں طرف اُسے وہ سڑک بخوبی دکھائی دے رہی تھی جس پر شہر کی سمت جانے والے رکشہ، ٹیمپو اور ریڑھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔

اُس نے اپنی رفتار کم کر کے بے ترتیب اور پھولی ہوئی سانس پر قابو پایا۔

کے کنارے پہنچنے تک وہ بالکل نارمل ہو چکا تھا —— اُسے علم تھا دشمن شکاری
رہا ہو گا اُس کی بو سونگھتا ہوا اُس کے تعاقب میں آ رہا ہے لیکن وہ اتنے
سے سڑک کے کنارے کھڑا تھا جیسے ابھی ابھی فٹ بال میچ سے فارغ ہو
ا ہو۔

ایک ٹیمپو کو نزدیک آنے پر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اُس
ہاتھ سے موجود سواریوں کے ساتھ پھنس کر بیٹھ گیا۔

ٹیمپو میں موجود سواریوں نے اپنے اپنے زاویے سے اُس پر نگاہیں دوڑائیں
خان جان بوجھ کر کسی سے بھی آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔

—— یہ وہ لوگ تھے جو اکثر اسی روٹ پر سفر کیا کرتے تھے اور اپنے
اس جانی پہچانی کو دیکھ کر اُن کا چونکنا بھی ضروری تھا۔ شاید اسی لیے اُس کے
ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک گہری آنکھوں والے بوڑھے سکھ نے اُس سے
پوچھا۔

"توں آں (کہاں سے آئے ہو)؟"

ٹیمپو والی —— خان نے پہلے ہی سے خود کو ایسی صورتحال کا مقابلہ کرنے
کے لیے تیار کر رکھا تھا۔

"اسیں ہنالیں (مہمان ہو)؟" دوبارہ اُس نے خان کی آنکھوں میں جھانکا جہاں
سوائے مروت کے اُسے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"جی میں امرتسر سے آیا ہوں۔" خان نے اُسے ایسے پھاڑ کھانے والے
جواب دیا کہ دوبارہ بوڑھے سکھ کو جو شکل ہی سے پولیس کا ناؤٹ دکھائی
دیتا تھا کوئی اور بات پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

اس کے ساتھ والے کسی مسافر نے شاید خان کے تند و تیز لہجے کو بھانپ لیا تھا۔

تب ہی تو اُس نے بوڑھے سکھ کو قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا تھا "سرپنچ کیا بن گیا ہے یار، مصیبت ڈال رکھی ہے اِس نے۔ خوا مخواہ لوگوں پر شک کرتا رہتا ہے"

"اور کیا....." ساتھ والی سواریوں نے کہا۔

شاید یہ لوگ بوڑھے سکھ سرپنچ کی عادت سے واقف تھے اور انہوں نے بطور ہمدرد اِس بات کا برا منایا تھا کہ اُن کے ایک ہمدرد ساتھی سے اِس لہجے میں گفتگو کی جائے۔

سرپنچ نے کسی بات کا جواب نہ دیا اور چپکا ہو کر بیٹھا رہا! پھر وہ لوگ اپنے دیہاتوں کے گرداگرد ہونے والی ہلچل کے متعلق باتیں کرنے لگے: وہ کسی پاکستانی "گھس بیٹھئے" کا ذکر کر رہے تھے اور ایک آدمی بڑے رازدارانہ لہجے میں دوسروں کو بتا رہا تھا کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے ایک پاکستانی جاسوس کو کنوئیں میں زہر ملاتے دیکھا ہے۔ اِس سوال پر کہ اُس نے اُسے گرفتار کیوں نہیں کروایا اُس نے لوگوں کو بتایا کہ جب تک وہ مقامی پوسٹ پر اطلاع کرتا وہ جاسوس بچ کر نکل گیا تھا اور سرکار نے اب وہ کنواں بند کروا دیا ہے۔"

خان نے انہیں اپنی باتوں میں مصروف دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

بسوں میں سواریاں اس بُری طرح ٹھنسی ہوئی تھیں کہ باہر لٹکتا کنڈیکٹر اندر آنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ یہی بات خان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی اور ایک جگہ جہاں بسوں کا اُسے کچھ زیادہ ہی رونق دکھائی پڑی۔ شاید یہ بے چارے نزدیکی دیہات کے رہنے والے لوگ تھے جو اپنے کاروبارِ زندگی کے سلسلے میں شہر کی طرف جا رہے تھے۔

سواریوں کی ٹانگوں کو ادھر اُدھر کرتا وہ باہر نکل آیا۔ مقامی سواریوں کے کرائے اُسے معلوم تھے۔ اُس نے روپے کا ایک نوٹ کنڈیکٹر کے ہاتھ پر رکھا اور اُس کی

بات دیکھنے لگا۔ کنڈیکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈالا کچھ پیسے اُسے لوٹا کر زور سے ہاتھ ہلا دیا۔

خان نے ایک لمحے کے لیے رُک کر صورتحال کا جائزہ لیا۔ اِس "سٹاپ" کے قریب اُسے ایک ہی قطار میں بنی پانچ چھ دُکانیں نظر آ رہی تھیں۔ شاید یہ اِس علاقے کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ گاؤں تھا۔ ایک دکان پر جہاں ایک بوڑھا سا آدمی سر جھکائے مشین چلانے میں مصروف تھا۔ اُسے کپڑے اور کینوس کے تھیلے اور بوریاں لٹکتی نظر آ گئیں۔

یہ تائید غیبی تھی۔!

اُس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر دُکان پر پہنچ گیا۔ دھوتی کی قیمت اُس نے خان بوجھ کر اور خاصی بحث کے بعد کم کروائی تھی اور ایک کپڑے کا تھیلا بھی خرید لیا تھا۔۔۔۔ اب اُس کا رُخ سڑک کے پرلی طرف بنے کار کے کھیتوں کی طرف تھا۔ راہگیروں کی آمدورفت ابھی خاصی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن وہ نظریں بچا کر ایک کھیت میں پیشاب کے بہانے گھسنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کھیت سے دوبارہ برآمد ہوا تو بالکل ایک بدلا ہوا انسان تھا: اُس کے جسم پر قمیص تو وہی تھی لیکن دھوتی بدل چکی تھی جسے اُس نے ٹانگوں کے مخصوص انداز میں بل دے کر باندھا ہوا تھا۔ صبح مندر کے پروہت نے اُس کے ماتھے پر جو چندن لگا دیا تھا۔ اس کے بعد تو وہ اب بالکل برہمن نظر آ رہا تھا۔

دل ہی دل میں اپنے نئے روپ کا تصور کر کے وہ مسکرا دیا! اب وہ دوبارہ سڑک کی طرف جا رہا تھا جہاں اترا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اُس کی چال بدل چکی تھی۔ اُس کے چلنے کا انداز اِس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ

By Qamar Abbas

اس کی دونوں ٹانگوں میں کچھ فرق ہے۔ کھیتوں کے سلسلے سے شاپ تک وہ
یہی چال چلتا آیا لیکن کیا مجال جو اس میں ایکٹنگ کا شائبہ تک بھی گزرا ہو۔

○

بس سٹاپ کی بنی دکانوں میں سے وہ ایک چائے کی دکان پر بیٹھ گیا۔ اگر
وہ بوڑھا درزی جس سے اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہ دھوتی اور تھیلا لیا
تھا، بھی اسے دوبارہ دیکھ لیتا تو شاید پہچان نہ پاتا۔ اس نے دکاندار کو پاؤ دودھ
کی چائے اور مٹھائی لانے کو کہا اور خود دیہاتیوں کے سے انداز میں دونوں ٹانگیں
پسار کر لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

چائے پیتے ہوئے اسے بڑی فرحت اور تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک
لمبی اور تھکا دینے والی دوڑ کے بعد چائے کے چند گھونٹوں ہی نے اس کے
میں اتر کر اسے دوبارہ چوکس کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ابھی
جائے یا اچھے وقت کا انتظار کرے۔

اس بات کا تو اسے بخوبی احساس تھا کہ اگلے دو تین روز تک بھی اس
کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے سیکورٹی کے سرکاری کتے اپنی جگہ سے نہیں ہلیں
اس نے جس طرح بار بار ان لوگوں کے پھیلائے ہوئے جال کو توڑ کر اپنے
راستہ تلاش کیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ کس بری طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا
گے؟ اس بات کا احساس اس سے زیادہ بہتر انداز میں اور کون کر سکتا تھا۔

اپنے قریب بیٹھے ایک اور شخص کی گفتگو پر اس نے کن انکھیوں سے نظر
دوڑائی گیارہ بج رہے تھے اس نے بارہ بجے تک یہیں بیٹھے رہنے کا فیصلہ
لیا تھا۔

آدھ گھنٹے میں اس نے چائے ختم کی۔ دکاندار بھی اس کی طرف سے پہلے

Scanned at 3

ہ شکر گزار تھا ـــــ اب کچھ نظریں اس کی طرف خوامخواہ اٹھنے لگی تھیں
اس سے پہلے کہ وہ لوگ کسی شک و شبہ کا شکار ہوں۔ خان نے وہاں سے اٹھ
کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک خستہ حال لاری میں سوار ہو کر اب وہ شہر کی طرف جا رہا تھا اور ـــــ
کے باہر بنی چونگی پر وہ اتر گیا۔

ـــــ ریسٹ ہاؤس میں دیکھا اس ملاقے کا نقشہ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں
سامنے پھیلتا چلا گیا۔ کرنل صاحب کی انگلی ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ جاتی
اور اس چونگی پر آ کر ٹھہر گئی۔

اسے یاد آ گیا کہ یہ نہر شہر کے باہر باہر گھوم کر شہر میں داخل ہو جاتی ہے!
گی کے بعد شہر میں داخل ہوتے وقت اس بس کی چیکنگ کس شدت سے ہوتی؟
اس اندازہ تو اسے سواریوں کی باتوں ہی سے ہو گیا تھا! بس میں موجود ہر
شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ لوگ کسی پاکستانی جاسوس کے
کی کہانی سنا رہے تھے۔

مختلف منہ مختلف باتیں اور مختلف نوعیت کے تذکروں سے لطف اندوز
ہوتا ہی وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ "جب اس واقعے کی خبر آگ کی طرح لان قصبات
میں پھیل چکی تھی تو سیکورٹی کا کیا حال ہو گا؟"

یہی کچھ سوچ کر اس نے نہر کے کنارے کنارے چکر کاٹ کر پیدل ہی شہر
میں پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح اسے کم از کم یہ امید ضرور تھی کہ وہ سیکورٹی
والوں کی قائم کردہ مختلف چیک پوسٹوں سے تو نجات حاصل کر سکے گا۔

نہر کی پٹڑی پر اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ دل ہی دل میں اس نے نہر کے
کنارے اطراف دیہاتوں کے نام دوبارہ دوہرائے۔

Omar Alam

"ایک اچھے جاسوس کی بہترین پہچان یہی ہے کہ وہ کوئی بھی اگلا قدم اٹھانے سے پہلے اُس کی مضمرات پر غور کرے اور ہمیشہ ایک "کورسٹوری" لے کر چلے۔"

—— اس کے خنزیر صورت انسٹرکٹر نے اس کے لاشعور میں انگڑائی لی اور خان ایک مرتبہ پھر اُسی ریسٹ ہاؤس میں پھیلے نقشے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

سنہری پٹڑی کا ایک موڑ گھومتے ہی وہ اچانک چونک پڑا۔

سامنے گھنے جنگل میں سے ایک جیپ نکل کر باہر آ رہی تھی۔ اس کے لیے اتنا موقع بھی نہیں تھا کہ اپنا آگے بڑھا قدم ہی پیچھے ہٹا لے —— کیا کرے؟ اس نے سوچا اور اُسی لمحے ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

اُس نے بڑے اعتماد سے قدم اُسی طرف بڑھا دیے —— جیپ اُس کے نزدیک سے کیڑی کی چال چلتی آگے نکل گئی۔

لیکن اچانک ہی اُسے بریک لگنے کی آواز سنائی دی! اس کے اعصاب کو ایک جھٹکا بیچ کے ساتھ ہی ضرور لگا تھا۔ لیکن فولادی اعصاب کے مالک خان کے لیے اپنی کسی بھی کیفیت پر قابو پانے کو صرف چند سیکنڈ ہی کافی تھے۔

"اے ٹھہر جاؤ —— کون ہے؟" للکارنے والے کا لہجہ اُس کے مدراسی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

خان اُس کی آواز پر اچانک ہی پلٹا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ معافی مانگنے کے انداز میں بندھے ہوئے تھے اور چہرے پر اُس نے ایک عالم کی معصومیت طاری کی ہوئی تھی۔

"غریب آدمی ہے صاحب" —— اس نے گھگیاتے ہوئے کہا۔

"کدھر جائیں گا؟" —— دوبارہ اُسی مدراسی حوالدار نے پہاڑ کھانے والے لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

Scanned with CamScanner

"ہاں جی تارج جی!" —— خان کے ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔

ایک لمحے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھے لوگوں نے اُس کا جائزہ لیا۔ پھر کسی "ہاں" پنجابی لہجہ میں اُسے نزدیک آنے کا حکم دیا —— "ادھر آ ادے" ——

اگلی نشستوں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے سکھ جمعدار پر سے پھسلتی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تین جواں اپنی گودیوں میں سٹین گنیں رکھے بظاہر ماحول سے بے نظر آ رہے تھے۔ کانپتا ہوا اُسی طرح ہاتھ باندھے اُن کے نزدیک آ گیا۔

"کاں کے ہوا دے تم؟" —— اُسی سکھ جمعدار نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"ادھر پورے کے" —— خان دوبارہ گھگیایا۔

"اے ادھر آ" —— مدراسی حوالدار نے اُسے نزدیک آنے کو کہا ——

"ادھر کے" —— اُس نے خان کے لہجے کی بڑی بھونڈی نقل اُتاری۔

تبھی خان نزدیک آیا۔ حوالدار نے ہاتھ لہرا کر کے ایک زوردار تھپڑ اُس کے منہ پر رسید کر دیا۔ خان اُلٹ کر دُور جا گرا۔ جتنی پھرتی سے وہ گرا تھا۔ اُس سے زیادہ پھرتی کے ساتھ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اُس نے باقاعدہ بندھے ہوئے ہاتھ باندھے شروع کر دیے تھے۔

"ادھر کیا ہے کیا —— تجھے نظر نہیں آتا۔ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔" اُسی سکھ نے کہا۔

زمین سے اُٹھتے ہوئے خان نے سکھ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ سکھ جمعدار کے ذہن نے شاید مدراسی حوالدار کی یہ حرکت پسند نہیں کی تھی اور یہ فقرہ بول کر بھی شاید وہ اُسے مزید عتاب سے بچانا چاہتا تھا۔

"پتہ معلوم نہیں مالک" —— اُس نے روتے ہوئے اچانک ہی سکھ جمعدار

کے پاؤں پکڑ لیے۔

"چل دفع ہو جا۔" سکھ نے اُسے بناوٹی ڈانٹ پلائی۔

خان اُسے دعائیں دیتا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دوبارہ اُسی طرف بڑھا۔ اُدھر سے مدراسی حوالدار نے اُسے ڈانٹا اور نہر کی دوسری جانب اشارہ کیا۔

"مہاراج جی! ترنی کے" وہ سامنے ہی تو ہے" ــــ اُس نے انگلی کے اشارے سے ایک سمت اشارہ کیا۔ یہاں سے ایک گاؤں کے آثار بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے ــــ "میں غریب آدمی کہاں اتنا لمبا چکر کاٹوں گا۔ بچہ بیمار ہے بابک!" اُس نے دوبارہ ہاتھ باندھے۔

"اچھا ــــ اچھا ــــ جلدی چلا جا ــــ دفع ہو جا" ــــ اُسی سکھ جمعدار نے دوبارہ اُس کی مسیحائی کی۔

اس سے پہلے کہ مدراسی حوالدار کوئی اگلا حکم سنائے اُس نے قریباً بھاگنے کے سے انداز میں قدم آگے بڑھا دیے۔ اُس کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ہی سکھ جمعدار نے جیپ کے اگنیشن میں کنجی گھما دی تھی۔ انجن سٹارٹ ہونے کی آواز نے خان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے کر دیے تھے۔

عام حالت میں وہ کبھی اس طرح تھپڑ کھانے کی ذلت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک پڑنے والے تھپڑ نے واقعی اُس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں ایک موٹی سی گالی مدراسی حوالدار کو دیتے ہوئے اپنے دونوں گالوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں سہلایا۔ اس دوران جب وہ گر کر زمین سے اٹھا تو جیپ کے ایک کونے پر بنا ایک منحوس نشان اُس کی عقابی نظروں میں آ چکا تھا۔ گو کہ اس جیپ پر اچھی طرح مٹی سے لیپا پوتی کی گئی تھی لیکن برچھی اور ہاتھ کا نشان بہرحال نمایاں تھا۔

اُس نے اپنے ذہن کے کسی بڑے ہی محفوظ گوشے میں اس نشان کو محفوظ [illegible] اب اُس کے لیے "ترنی کے" کی طرف جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ [illegible] واقعی اُسی گاؤں کا نام تھا جو یہاں سے بمشکل پون میل کے فاصلے پر [illegible] تھا اور اُسے وہی راستہ جاتا تھا جس طرف سے یہ جیپ نکل کر آئی تھی۔

اپنا گال سہلاتے ہوئے خان نے اُس راستے پر اپنے قدم آگے بڑھائے۔ [illegible] نے اپنے ذہن میں کسی بھی ممکنہ امکان کو رد نہیں کیا تھا۔ کچھ بھی ممکن تھا ــــ [illegible] ہی کہ جیپ والے کہیں چھپ کر اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہے ہوں۔ [illegible] اس نے فلور راستہ اپنایا تو وہ لوگ اُس پر کوئی بھی شک کر سکتے تھے۔ اور [illegible] تب شک ہو جانے کی صورت میں اُس کے لیے یہاں سے بچ نکلنے کے امکانات [illegible] معدوم تھے۔

بلکل ایک فرلانگ چلنے پر ہی اُسے کچھ ٹرک اور جیپیں ایک جھرمٹ کی شکل [illegible] نظر آئے جن پر گہرے سبز رنگ کا جال اور گھاس پھونس ڈال کر انہیں [illegible] فوج نے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے کیموفلاج کر رکھا تھا۔

خان کی بیقرار نظریں بڑی بے چینی سے اس جھرمٹ کا طواف کر رہی تھیں [illegible] گوہرِ مقصود حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسی طرح کے نشانات جو [illegible] نے پہلی جیپ پر بنے دیکھے تھے اُسے یہاں بھی نظر آ گئے۔ ایک بے جان [illegible] اُس کے ہونٹوں پر رینگ گئی لیکن فوراً ہی اُس نے ہونٹ بھینچ لیے جیسے [illegible] پر قابو آ گیا ہو۔

[illegible] راستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ اُس گاؤں تک جاتا تھا جو بدقسمتی یا خوش قسمتی [illegible] اُس کی منزل تھی۔ چند قدم مزید چلنے پر اُسے ایک ٹوٹب دیل دکھائی پڑا

جس پر سکھ فوجی بڑے بڑے کپڑے پہنے غسل میں مصروف تھے اور ایک کرنے میں
شاید اس ٹیوب ویل کا مالک کھڑا بڑی حسرت ناک نظروں سے اُس طرف دیکھ
رہا تھا۔

وہ ایک کہ مرجا۔ بابے ـــــ ایک سکھ فوجی نے جس کی داڑھی اور سر کے بال
صابن کے جھاگ میں اس بُری طرح ڈوبے ہوئے تھے کہ اُس کی آنکھیں بمشکل کھلی
دکھائی دیتی تھیں اُسے ٹوکا۔

سردار جی سامنے والے گاؤں جانا ہے ؟ وہ حسبِ سابق ہاتھ باندھ کر گھگیایا۔

وہ ائے۔ یہ کوئی راستہ ہے جلدی نکل جا ؟ اُس نے خان کو گالی دیتے ہوئے
کہا۔ اگر کسی افسر نے دیکھ لیا تو تیری ساری براہمنی نکال دے گا۔ پھر اچانک
شاید اُس کی آنکھوں میں صابن اُتر آیا تھا۔ اُس نے سب کچھ بھول کر زور زور سے
اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی آنکھوں کی طرف پھینکتے ہوئے خان پر گالیوں کی
بوچھاڑ کر دی۔

اُس کے دوسرے ساتھی اس صورتِ حال سے خاصے لطف اندوز ہو رہے
تھے اور بہت زور زور سے قہقہے بھی لگا رہے تھے۔

لاکھ ضبط کے باوجود بھی خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی لیکن وہ بڑی
تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ اگر وہ سکھ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ لیتا
تو شاید وہ کبھی اپنی ٹانگوں پر چل کر یہاں سے آگے نہ جا سکتا۔

○

اُس کا رُخ ورنی کے کی طرف تھا اور ذہن برق رفتاری سے ایک کہانی
تیار کر رہا تھا۔ تیار شدہ کہانی کو اُس نے دل ہی دل میں دو تین مرتبہ تنقیدی
جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔ گاؤں کے کھیت اب شروع ہو گئے تھے

ان میں کہیں کہیں بنی حویلیاں بھی اُسے دکھائی دینے لگی تھیں۔ ایک ایسی
حویلی کی طرف اب اُس کے قدم اٹھنے لگے تھے۔

حویلی کے باہر ٹیوب ویل کی طرف پیٹھ کیے ایک دیہاتی کسان اُسے دکھائی
دیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں کلہاڑی پکڑ رکھی تھی۔
سامنے کے درختوں کی قطار میں کسی درخت کی ٹہنی پر نقب لگانے کے چکر
میں لگائی پڑتا تھا۔

خان بڑے پُر اعتماد انداز میں قدم اٹھاتا اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ اب
وہ میرے سے واقعی ایک براہمن زادہ نظر آتا تھا۔ اپنی چھٹی حس کے زیرِ
اثر درمیانی عمر کا شخص اُس کی طرف اچانک ہی گھوما۔

رام رام جی ـــــ خان نے دونوں ہاتھ بڑے سلیقے سے خاندانی براہمنوں کی
طرح باندھے ہوئے اُسے پرنام کیا۔

رام رام ـــــ شاید اُس کی شخصیت نے مخاطب پر پہلی ہی نظر میں اثر
کیا تھا۔

حویلی کے اسی گاؤں کا نام ہے کیا ـــــ ؟ خان کا لہجہ بڑا مدبرانہ سا ہو
گیا تھا۔

مہاراج ـــــ مخاطب اب مکمل اسیر تھا۔

گھمنڈیو جی کے گھر جانا تھا ؟ اُس نے اپنی پہلے سے تیار کردہ کہانی کے
پہلے تیر چلایا۔

گھمنڈیو کے ـــــ یہاں دو رہتے ہیں۔ ایک منگو رام کا بیٹا اور دوسرا کالنٹی
کا۔ اُس نے وضاحت کی۔

ویسے اُن کے پتا جی کے نام کا تو علم نہیں۔ بس وہ درمیانی سی عمر کے ہیں۔

اور لدھیانہ میں ریکروٹنگ کا کام کرتے تھے" ـــــ خان کا لہجہ بدستور پُرسکون تھا۔

"کیا بات کر رہے ہیں پنڈت جی مہاراج ، شاید مخاطب کو سمجھ نہیں آئی تھی۔

"شریمان جی ہم جس سُکھدیو جی کا ذکر کر رہے ہیں وہ پاسپورٹ ویزوں کا کام کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں یہی پتہ بتایا تھا اپنا۔"

"شریمان جی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے شاید بے چارہ اپنے ذہن پر زور دے کر اردگرد کے دیہاتوں میں کسی ایسے سُکھدیو کو کھوج رہا تھا! قریباً ایک منٹ بعد اُس نے مراقبے سے سر اٹھایا اور اُس سے مخاطب ہوا۔

"پنڈت جی! آپ شاید غلط ایڈریس پر آ گئے ہیں۔"

"کیا بات کرتے ہیں مہاراج جی! یہ کیسے ممکن ہے ہمیں تو اُس نے سارا رستہ حفظ کروا رکھا ہے۔" پھر اُس نے شہر کی چونگی سے اس گاؤں تک راستے میں آنے والے دو تین دیہاتوں کے نام بھی لے دیے۔

اُس کا مخاطب دوبارہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ آدمی "سمجھدار" معلوم ہوتا تھا۔ شاید معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

"آیئے آپ بیٹھیں ـــــ اطمینان سے بات کرتے ہیں۔" اُس نے خان کو قریب بچھی چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اُسی طرف بڑھنے لگا۔

خان بظاہر ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اُس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے مخاطب نے "پنڈت جی مہاراج" کا خاص احترام کیا تھا اور اُسے سرہانے کی طرف بٹھا کر خود پائنتی کی طرف آ بیٹھا۔

"ایک بات ہے پنڈت جی مہاراج۔" اُس نے کسی گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے

"ان" مخاطب کیا۔

"کیا بات؟" ـــــ خان نے اپنی طرف سے خاصی حیرانگی کا اظہار کیا تھا۔

"ہم ہیں تو جاٹ لوگ لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ کے ساتھ کوئی دھوکہ ہوا ہے۔ کیا شُبھ نام ہے آپ کا؟"

"امیت شرما" ـــــ خان نے کہا ـــــ "لیکن ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے۔" اُس کا جان بننا چاہا۔

"ابھی سمجھ آ جائے گا مہاراج۔ مجھے ذرا بتائیے قصہ کیا ہے؟"

پھر امیت شرما جی اُسے قصہ سنانے لگے۔ اُنہوں نے بتایا کہ سُکھدیو نامی اس آدمی نے اُن سے پانچ ہزار روپیہ باہر بھجوانے کے لیے لیا تھا اور آٹھ دن کا وعدہ کر کے ویزا آ جائے گا۔ آج آٹھ ہفتے ہونے کو آ رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہیں سکھدیو جی بیمار نہ پڑ گئے ہوں۔ اس لیے اُس کے گاؤں چلے آئے ہیں۔

"اوہ! کتنے بھولے ہیں آپ مہاراج پنڈت جی۔" اُس کے مخاطب کو واقعی خان کی "سادہ لوحی" پر ترس آ رہا تھا۔ "آپ پڑھے لکھے آدمی ہو کر سمجھ نہیں سکے۔ وہ شخص جو کوئی بھی تھا آپ کے ساتھ دھوکہ کر گیا اور آپ کو پریشان کرنے کے لیے یہاں بھیج دیا۔"

"اوہ ـــــ گھور کلیُگ ـــــ ہے بھگوان" ـــــ خان نے ٹھنڈی سانس لی ـــــ "اُس نے زرِ پیہ بھی قرض پکڑ کر حاصل کیا تھا ـــــ ہے بھگوان۔" اُس کی شکل خاصی اُداس ہو چلی تھی۔

"حوصلہ کیجئے مہاراج! حوصلہ کیجئے! میں آپ کے لیے جل پھوہن کا بندوبست کرواتا ہوں" ـــــ اُس کے مخاطب نے خان کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

"کیا شبھ نام ہے آپ کا" اس مرتبہ جب خان نے اپنا چہرہ اُس کی طرف موڑا تو اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"میں پنڈتوں کا داس ہوں مہاراج جی کمار نام ہے میرا۔" وہ پنڈت پر واقعی مرمٹا تھا۔

"کمار جی آپ کا بہت دھنواد ـــــ ہم کو جانے دیجئے۔" خان کا لہجہ خاصا گمبھیر تھا۔

"نہیں مہاراج نہیں ـــــ یہ کبھی نہیں ہوگا ـــــ کیڑی کے گھر اندھیرا آئے اور چلے جائیں۔ آپ اتنے سفر سے پہلے ہی تھکے ہوئے ہیں۔ آپ مجھ غریب کی کٹیا پر رات بسر کیجئے۔ صبح میں خود آپ کو لاری اڈے پر شہر تک چھوڑ کر آؤں گا۔"

"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں ـــــ یہ تو ہمارا نصیب ہے۔ آپ کیوں کشٹ اٹھاتے ہیں ہمارے لیے۔"

"پنڈت جی" کی آواز ابھی تک بھرائی ہوئی تھی۔

"یہ میرا کرتوے (فرض) ہے مہاراج ـــــ" کمار نے ہاتھ باندھے۔

کمار کی ضد پر پنڈت جی کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ اُسی کھاٹ پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔

○

کمار اُسے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لیے کہہ کر چلا گیا اور خان سوچنے لگا کہ قدرت کو واقعی اُس کی حالت پر رحم آگیا ہے۔ یہ شخص بالکل فرشتہ بن کر اُس کی مدد کر رہا ہے۔ اگر وہ آج کی رات بھی اس علاقے میں گزار لیتا تو کل تک خاصا افارہ ہو جاتا۔ کمار جیسے براہمنوں کے عقیدت مند سے یہ توقع تو فضول تھی کہ وہ اُس کے متعلق کوئی پہچان بین کرتا رہے گا۔ اگر ایسی بات ہوتی بھی تو خان اُس کے لیے

کی طور پر مکمل تیار تھا۔

کمار اُسے یہیں بٹھا کر گاؤں کی سمت جانے والے راستے پر چلا گیا تھا۔ شاید اپنے گھر سے پنڈت جی کے لیے "جل بھوجن" لینے گیا تھا۔ ان فارغ لمحات کو غنیمت جانتے ہوئے خان نے اپنے کپڑے ایک طرف اتار کر رکھے اور زیرِ جامہ کے ساتھ ہی چبوترے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے پہلے ہندوؤں کے سے مخصوص طریقہ عبادت کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر منہ سے اُلٹے سیدھے اشلوک نکالے پھر پنڈتوں کے سے انداز میں جھکتے ہوئے ایک ہاتھ سے ناک بند کر کے اپنا سر اُن کی دھار کے نیچے رکھ دیا۔

تین چار منٹ بعد جب وہ نہانے سے فراغت پا کر باہر نکلا تو اُسے اپنا جسم کے مقابلے میں خاصا ہلکا محسوس ہونے لگا۔ کھاٹ پر بیٹھے ہوئے اُسے پچھلے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے تھے اور اس کا دل احساسِ تشکر کے جذبے سے بھر بھر آتا تھا۔ واقعی یہ اُس پر اللہ کی خصوصی کرمفرمائی تھی کہ وہ ابھی تک موزیوں کے شکنجے سے بچا ہوا تھا۔

کمار کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ اُس کی گھر والی بھی آئی تھی جس نے اپنے ہاتھوں میں تھالی، اگربتی اور کچھ اور سامان اٹھا رکھا تھا اور اُس پر ململ کا سفید کپڑا بھی ڈھکا ہوا تھا۔

کمار کی بیوی پر پہلی نظر پڑتے ہی خان کو احساس ہوا کہ اس عورت کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ بادی النظر میں اُس کی عمر بمشکل بیس سال دکھائی دیتی تھی جبکہ اُس کا شوہر ڈھلتی عمر کا آدمی تھا۔

"کیا اُس کی دوسری شادی تھی؟" ـــــ کچھ بھی ہو۔ اُس نے سوچا! مجھے

"کملا ہے مہاراج میری دھرم پتنی ـــــ" اُس نے خان سے اپنی بیوی کا تعارف کروایا۔ جس نے تھالی چارپائی پر رکھ کر پنڈت جی کے چرن چھُو کر عقیدت و احترام کا اظہار کیا تھا۔

خان نے بھی کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے اُسے پرنام کیا۔ اُسے اِس کملا کی آنکھوں میں ہلکورے مارتی ایک مخصوص پیاس کا بڑی شدت سے احساس ہوا تھا۔ اُس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ: "اُس کا تعلق اِس علاقے سے نہیں۔ شاید بے چاری وسطی ہند کے کسی علاقے کی رہنے والی تھی اور ہاتھوں ہاتھ بکتی ہوئی کُمار تک پہنچی ہو گی۔"

دونوں پاؤں چارپائی کے اوپر کر کے وہ پنڈتوں کے مخصوص انداز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ کُمار نے تھالی اور تازہ پانی سے بھرا پیتل کا ایک لوٹا اُس کے سامنے رکھ دیا۔

"آپ جل بھوجن کیجئے مہاراج! میں ذرا سامنے سے لکڑی کاٹ لاؤں۔" اُس نے کھاڑی ہاتھوں میں تولتے ہوئے کہا۔

"اوشے ـــــ اوشے ـــــ (ضرور۔ ضرور)" خان نے کہا۔

"مہاراج کا خیال کیجئو۔" اُس نے جاتے جاتے اپنی بیوی کو تنبیہ کی جس نے گردن جھکا کر اُس کے حکم پر صاد کر دیا۔

○

سر جھکائے وہ کھانے میں مصروف تھا۔

ـــــ تازہ سبزی اور ہنڈ وگھرلنے کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مخصوص کے پھُلکے اور دہی کے ساتھ مختلف اقسام کی کھٹی میٹھی چیزیں دیکھ کر اس کی بھُوک چمک اٹھی تھی لیکن وہ بڑے سکون اور پُروقار انداز میں لُقمہ لُقمہ بڑی نزاکت

کھا رہا تھا۔ اِس دوران اُس نے گو کہ براہ راست کملا کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن کن انکھیوں سے اُس نے دیکھ لیا تھا کہ کملا کی نظریں مسلسل اُس پر جمی ہیں۔

کُمار کے وہاں سے رُخصت ہوتے ہی اُس کا چہرہ بدلنے لگا تھا اب وہ ایک ہندو عورت اور حیادار عورت کے بجائے نوجوان لڑکی بنتی چلی جا رہی تھی۔ اِس کے چہرے پر موٹے سوت کی چادر کھسک کر اُس کے شانوں پر آ رہی تھی اور ہوا سے اب اِس کے بالوں سے اٹھکیلیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔

حالات نے کملا بے چاری کو واقعی بہت چھوٹی سی عمر ہی میں مکمل عورت بنا دیا تھا اور خان نہیں چاہتا تھا کہ: یہ معصوم لڑکی جسے بھارتی سماج نے فاحشہ بنا دیا تھا اُس کے اعصاب پر غالب آئے۔ اُس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

"کہاں کی ہیں آپ؟" کھانا کھاتے ہوئے اچانک ہی اُس نے کملا پر سوال داغ دیا۔

"میں اب کہاں کی رہی ہوں مہاراج ـــــ کہیں کی بھی تو نہیں رہی۔ نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔" اُس نے بڑی لمبی آہ بھر کر غمگین دُکھیا لہجے میں کہا۔

"کوئی تو دیس ہو گا آپ کا؟"

"ہاں مہاراج۔ ہمارا دیس تھا۔ گھر تھا۔ ماتا پتا تھے۔ بہن بھائی تھے۔ اب تو کوئی بھی نہیں رہا۔" اس کا لہجہ قدرے گھمبیر ہو چلا تھا۔

"ماتا سنسار ہے ہی دُکھ کی نگری۔ یہاں سب روگی ہی روگ میں ہے رہتے ـــــ" خان نے اُس کی حالت پر کفِ افسوس ملا۔

"آپ نے ٹھیک ہی کہا مہاراج۔ ہم تو جنم جنم کے دُکھیا ہیں۔"

اس کی پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی میں کہیں بھی کُمار کے آنے کا ذکر تک نہ تھا۔

اب تک وہ حالات کے دھارے ہی پر بہتا ہوا یہاں آیا تھا۔

اُس نے قدم قدم پر نئی منصوبہ بندیاں کی تھیں۔ اور واقعی ایک تھکا دینے والی اعصابی جنگ خود سے لڑی تھی اور ــــ اب حالات نے اس موڑ پر کملا کو اُس کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا تھا۔

بھارت میں ان حالات میں کسی بھی عورت کا سہارا اُس کے لیے باعثِ اطمینان ہو سکتا تھا! اُس نے کمار سے ملاقات کے بعد جو نئی منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ: "اس میں کہیں یہ دھان پان سی لڑکی فٹ بھی بیٹھتی ہے! نہیں؟"

فی الوقت اُسے اپنے سوال کا کوئی مناسب جواب نہ ملا اور اُس نے دیکھ اور انتظار کرو کی پالیسی کو مفید جانا۔ اس کے باوجود وہ کملا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ شاید بنگال کی ہیں؟" اُس نے پیش رفت کی۔

"مہاراشٹر کی۔ میرا جنم شاید بمبئی میں ہوا تھا۔ میرے ماں باپ نے مجھے سات دو سو روپے کے عوض اُس کے ہاتھ بیچ ڈالا!" ــ "

"تم اِس کی پہلی بیوی ہو کیا؟"

"نہیں ــــ" اُس نے کہا ــــ "پہلی بیوی تو دو بچوں کو جنم دے کر مر گئی۔ میں تو دوسری ہوں۔ لیکن یہ بھی کیا معلوم سچ ہے یا جھوٹ ــــ گاؤں والے تو یہی کہتے ہیں۔ اِس گاؤں میں مجھ جیسی تین اور لڑکیاں بھی ہیں۔ وہ بھی خرید کر لائی گئی ہیں۔"

"اوہ ــــ!" خان نے ہمدردی ظاہر کی۔

"آپ اِس کے واقف ہیں کیا؟ شہر جا تا رہتا ہے ناں؟"

"نہیں ــــ بس حالات نے اچانک ہی تمہارے پتی سے ٹکرا دیا۔"

"اچھا ہوا۔ اِس طرح میں بھی تو آپ سے ٹکرا گئی ہوں۔" وہ خاصی بیباک ہو رہی تھی۔

"میں تو ایک آدھ روز کا مہمان ہوں ــــ" خان اِس کارڈ کو ہر صورت ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔

کمار اب ایک لکڑی گھسیٹتا ہوا اُس طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں نے کمار کی نزاکت کا احساس بھی کر لیا تھا۔

کملا نے بڑے سلیقے سے دوبارہ موٹے سوت سے بنی ہوئی چادر اپنے سر پر ڈال کر گاؤں کی عورتوں کی طرح لمبا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔

○

کمار کے وہاں پہنچنے تک کملا نے اُس کے سامنے سے برتن ہٹا لیے تھے اور اب انہیں شاید مانجھنے جا رہی تھی۔

"آپ کا بہت دھنوار۔ اِس کلیُگ میں آپ ایسے اچھے لوگ ہی سنسار کو سورگ استھان بنائے ہوئے ہیں۔" خان نے اُس کے نزدیک آتے ہی اُس میں ہوا بھرنا شروع کر دی۔

اُسے اس معاشرے کے دوغلے پن سے ابتدا ہی میں کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔ ظاہر تو یہ شخص اتنا مذہبی بنا ہوا تھا کہ پنڈتوں کے پاؤں دھوتا پھر رہا تھا۔ باطنیت میں وہ جنسی درندہ تھا اور محض اپنی جنسیت کو تسکین فراہم کرنے کے لیے اصلی تلمر میں بھی اُس نے کملا جیسی بدقسمت لڑکی خرید کر اپنے گھر میں بسا رکھی تھی۔

"ہندو مت اس معاشرے کی بنیاد ہے ــــ" اُسے دورانِ تربیت اپنے اُستاد کا فقرہ یاد آگیا۔ "لیکن تم وہاں مصلح بن کر نہیں جاسوس بن کر اُن لوگوں کے

راز چرانے جا رہے ہو۔ جذبات کو کبھی خود پہ غالب نہ آنے دینا۔ جس معاشرے میں جا رہے ہو اُس کا ایک مکمل اور مربوط حصہ بن کر رہنا۔ اگر کبھی تم نے اُس سے ہٹ کر کچھ سوچنے یا کرنے کی ٹھانی تو بڑی بے رحمی سے مارے جاؤ گے۔"

اور اُسے بادلِ نخواستہ ہی سہی بہرحال ہندو بن کر رہنا تھا۔ فی الوقت اُس نے اِس معاشرے کے مذہبی پیشواؤں کی اولاد کا روپ دھار رکھا تھا جو اِس بات کا متقاضی تھا کہ وہ کمار سے بھی زیادہ بھرپور منافقت کا ثبوت دے۔

یہ اُس کی خوش نصیبی تھی کہ اُس کا سامنا بھی کمار جیسے روایتی ضعیف العقیدہ ہندو سے ہوا تھا جو ضرورت سے زیادہ برہمنوں کا تابعدار نظر آ رہا تھا۔ کمار کو اُس نے جلد ہی ایک لمبی کہانی سُنا دی کہ کس طرح اُس نے اپنے ماتا پتا کی مرضی کے خلاف باہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے کمار کو بتایا کہ وہ گریجویشن کر چکا ہے لیکن اِس کے باپ کی خواہش ہے کہ وہ اُس کی جگہ مندر کی گدی سنبھالے اور اگلا پروہت وہ خود ہو۔

"ہم لوگ وشنو ماتا کے پجاری ہیں۔ یہ مندر میرے پردادا نے خود بنوایا تھا اور ماتا کے کئی تحائف ہمارے ہاں موجود ہیں۔ دادا کے بعد میرے پتا نے پروہت کی گدی سنبھالی تھی اور اب وہ مجھے یہاں بٹھانا چاہتے ہیں۔" اُس نے کمار کو مذہبی کردار سے جس طرح فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"مہاراج بھی آپ کے پاس بھگوان کا دیا سب کچھ تو ہے۔ اب کس چکر میں پڑ گئے۔" کمار نے اسے سمجھایا۔

"بس ہماری بدھی (عقل) ہی بگڑ گئی تھی۔" ماتا شبراں والی۔ جو کہ اس نے خالص برہمنی انداز اپنایا۔ "اب یہ نئی درخواست کرنی ہے اس سے۔" اچانک ہی ایک خیال اُسے آ گیا تھا۔

"کیا۔" کمار بسر و چشم حاضر تھا۔

"دیکھئے ہمارے پتا جی علاقے کے عزت دار آدمی ہیں۔ یوں بھی ہم نے یہ کام ان کی مرضی کے خلاف کیا تھا۔ اب بھگوان نے ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ ہم نے بھی توبہ کر لی۔ اب تو سارا جیون دھرم کی سیوا ہی میں بیتائیں گے۔ آپ اس بات کا تذکرہ اس گاؤں میں اور کسی سے نہ کیجیے۔ بس یہ راز ہمارے اور آپ کے درمیان ہی رہنا چاہیے۔ آپ لوگوں کو یہی بتائیں کہ ہم آپ کے مہمان ہیں اور آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"جیسی اچھیا (مرضی) مہاراج کی۔" کمار نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی اور من ہی من میں ایسے بیوقوف ہندو سے ملاپ پر ایک مرتبہ پھر سجدۂ شکر ادا کیا۔

اتنا اس دوران برتن دھونے سے فارغ ہو چکی تھی۔ کمار نے بوب ویل پر سے اب بچھونے سے کمرے سے اُس کے لیے بستر نکال کر چارپائی پر بچھا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے معزز مہمان کی مدارت میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی آئے۔ خان للہ ہشیاری سے یہ باور کروا دیا تھا کہ ماتا وشنو کے مندر سے متعلق کچھ اشیاء اُس کے پاس موجود ہیں اور اگر ایسی کوئی بھی شے کمار کے گھر میں پائی جاتی تو وہ دونوں میں لکھ پتی بن جاتا۔

اس دوران بوب ویل پر اکا دکا لوگ گزرتے ہوئے کمار کی خیریت معلوم کرتے رہے تھے! ابھی تک کسی نے خان کے متعلق دریافت نہیں کیا تھا۔ شاید دیہاتوں کے لوگ تھے اور انہوں نے پنڈت جی کے تھانیدار ہی سمجھا ہو گا۔ کمار نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ یہ کمار کے کوئی خاص مہمان ہیں اگر اس کے اپنے گاؤں

کا کوئی آدمی ہوتا تو وہ ضرور پنڈت جی کا جغرافیہ بھی معلوم کرتا جو انہوں نے کمار کو پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا کہ اگر کوئی ان کے متعلق استفسار کرے تو اُسے یہی بتانا کہ میں تمہارے ایک پرانے پنڈت دوست کا چھوٹا بھائی ہوں اور ایک شادی کا پیغام دینے آیا ہوں۔

کملا کو اُس نے اس ہدایت کے ساتھ گاؤں کی طرف روانہ کر دیا تھا کہ وہ کسی سے خوامخواہ اس ننھے مہمان کا ذکر نہ کرے۔ ابھی تک شاید اُس نے کملا کو پنڈت جی کا مکمل تعارف نہیں کروایا تھا۔ دوپہر کے بعد جب کمار نے اُسے گھر لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو خان نے فوراً معذرت کر لی۔

"ہم یہیں ٹھیک ہیں شریمان جی! رام رام کر کے وقت گزار لیں گے۔ ہمارا من بڑا بوجھل ہو رہا ہے اپنے پاپ (گناہ) کا پرائشچت (کفارہ) ادا کیے بغیر ہمارا من ہلکا نہیں ہوگا ـــــ ہمیں یہیں رات گزارنے دیں۔" اُس نے کمار کو سمجھایا۔

"جیسی مرضی مہاراج کی ـــــ" کمار نے سر تسلیم خم کیا۔

اُس نے پنڈت جی کو کمرے کی چابی دے دی تھی۔ کمرے میں دو چارپائیاں ایک صراحی، پیتل کا لوٹا اور رامائن ایک اونچی جگہ پر ٹنگی ہوئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی "امیت شرابی" سیدھے رامائن تک پہنچے۔ پہلے دونوں ہاتھ باندھ کر انہوں نے اُسے سنسکار کیا، پھر ہاتھوں میں پکڑ کر آنکھوں سے لگایا اور اس کے بعد دوبارہ وہیں ٹانک دیا۔

"بس ہمارا سے یہاں بہت اچھا گزرے گا۔ ہم تو یوں بھی شام کے بعد پاٹھ ہی کرتے ہیں۔" اس نے رامائن کی وہاں موجودگی پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کر دیا۔

کمار نے کمرے کی چابی اُسے تھما دی اور خود گاؤں کی طرف چلا گیا۔ بہت

اس نے بند کر دیا تھا۔ اِکا دُکا لوگ دُور دُور سے آتے جاتے رہے تھے۔ لیکن مقام کا خاکہ ابھی تک یہاں دیہات کی عورتیں کپڑے دھونے یا پھر کوئی نہانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ بعد میں خان نے اس راز کی حقیقت کو بھی پا لیا، گاؤں کے لوگ رات کے مہیب دیپ پر اپنی عورتوں کو بھیجتے ہوئے گھبراتے تھے یوں بھی کوئی شریف عورت اس طرف پھٹکنے کی ہمت نہیں کرتی تھی۔

○

گاؤں سے واپسی پر کمار اُس کے لیے تازہ چائے کا گلاس بھر کر لے آیا۔ ایک چھوٹی سی پیتل کی بالٹی میں اُس نے دودھ الگ سے رکھا ہوا تھا اور لغانے کے نظام کے مطابق فروٹ بھی تھا۔

"اب ہم رات کا بھوجن نہیں کریں گے۔" خان نے اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"کیوں مہاراج! کیا غلطی ہو گئی مجھ سے ـــــ؟" کمار گھبرا گیا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ ہم رات کو زیادہ سے جاگ کر پوجا پاٹھ میں گزاریں گے۔ بھوجن کے ساتھ ٹھیک نہیں۔" خان نے اُسے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے مہاراج ـــــ" کمار نے ہاتھ باندھے۔

اس نے مہاراج کو بتایا کہ بچوں کی وجہ سے وہ رات گھر گزارنے پر مجبور ہے۔ کمار بھی چاہتا تھا کہ فی الوقت وہ چلا ہی جائے۔ یوں بھی وہ جانتا تھا کہ کملا کے علاوہ اُس کی مجبوری اور کیا ہو گی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کمار اُسے کبھی اکیلا چھوڑنے کا رسک نہیں لے گا۔

جوں جوں ڈھلتے ہی ٹھنڈک میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ خان نے کمرے میں رکھی کرسیاں اندر کر لیں۔

"آپ اب جائیے ہماری پوجا کا سمے ہو رہا ہے۔" اس نے کمار سے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج۔"

"صبح جلدی آجانا۔ ہم چاہتے ہیں کل شام تک گھر پہنچ جائیں۔ وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔" اس نے کمار کو اگلا پروگرام بھی سمجھا دیا۔

کمار کے وہاں سے جاتے ہی اس نے لالٹین کی لو خاصی گھٹا دی۔ کمرے کے اندر سے گندی لگائی اور لمبی تان کے لیٹ رہا۔ اس دوران وہ چائے سے فراغت پانے کے بعد دودھ اور پھلوں سے بھی شوق فرما چکا تھا۔ کمار کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی نے اسے ابھی تک سونے بھی نہیں دیا تھا۔ کیونکہ وہ مسلسل اس کا دماغ چاٹتا رہا تھا۔

اب جو فرصت نصیب ہوئی تو جیسے ساری تھکن دوبارہ عود کر آئی۔ آدھ گھنٹے وہ نیند سے جنگ کرتا رہا۔ پھر اس نے لالٹین بجھا دی اور لمبی تان کے سو رہا۔ کب تک سوتا رہا؟ اس کا احساس اسے نہیں تھا۔

صبح کمار وقت مقررہ پر آیا تو وہ دیوانچی کی حد تک اس کا عقیدت مند ہو چکا تھا۔ اس نے آتے ہی پنڈت جی کے چرن چھوئے۔ کملا اس کے ساتھ حسب سابق تھالی اٹھا کر لائی تھی۔ اس نے اپنے پتی دیو سے بھی زیادہ عقیدت کا مظاہرہ کیا اور آنکھ سے اشارہ کر کے مودب سی کھڑی ہو گئی۔

تعاقب

ہوٹل میں اپنی مخصوص میز پر وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے براجمان تھا۔ یہاں لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی علمیت کی وجہ سے اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ منوہر لال اس کا نام تھا۔ اور سارا محلہ اسے "کامریڈ" کہہ کر پکارتا تھا۔ اس کی گزر اوقات سیاست سے زیادہ کیمونزم تھی لیکن حیرانگی کی بات یہ تھی کہ وہ کیمونسٹ پارٹی کا معمولی سا ممبر بھی نہیں تھا۔ جبکہ پارٹی کے ورکر اسے "دیوتا" کا درجہ دیتے تھے۔

جب کبھی اس سے پارٹی والے عظیم انقلاب کے حصول کے لیے پارٹی میں شمولیت کی درخواست کرتے۔ اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ "فراڈ ہیں سب۔ سب فراڈ ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں یہ کیا خاک انقلاب لائیں گے۔"

اور لوگ مطمئن ہو رہتے۔ واقعی وہ سچا انقلابی تھا لیکن کیا مجال جو پولیس یا خفیہ والی فائل میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی کبھی لکھا گیا ہو۔ آج سے تین چار سال پہلے جب وہ اس قصبے میں آیا تھا۔ تو اس کے متعلق بڑی عجیب عجیب افواہیں گشت کرنے لگی تھیں۔ خفیہ پولیس نے ایک عرصے تک اس پر کڑی نظر رکھی تھی۔ لیکن اب اسے وہ لوگ پاگل سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یہ منوہر لال اسی ایک ہوٹل پر بیٹھا کرتا تھا۔ عموماً اس کے لیے کونے والی

Scanned with CamScanner

میز خالی رہتی تھی اگر وہاں کوئی موجود بھی ہوتا تو اُس کی آمد پر اُس کے احترام میں ... بولیا۔
اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کرسی اُس کے لیے خالی ہو جاتی۔

○

اُس روز کامریڈ نے حسبِ معمول پچھلے آدھ گھنٹے سے اپنا لیکچر شروع کیا ہوا تھا اور لوگ بڑی عقیدت مندی سے اُس کے گرد اگرد چائے کی پیالیاں تھامے بیٹھے تھے جب ایک مانوس چہرہ اس چھوٹے سے ہوٹل میں نظر آیا۔

دو بڑے شہروں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس قصبے میں مسافروں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ کسی نے اُس طرف توجہ نہ دی۔

اجنبی، منوہر لال کے سامنے والی میز پر اس طرح بیٹھا تھا کہ کامریڈ کی نظریں اس کی تمام حرکات کا بخوبی جائزہ لے سکیں۔ اس کے اندر داخل ہونے پر کامریڈ نے ایک نظر اُس کے سر پر بندھی پیلے رنگ کی پگڑی پر ضرور ڈالی تھی لیکن چہرے سے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

کامریڈ کے سامنے بیٹھتے ہوئے اُس نے ایک مخصوص انداز سے زوردار انگڑائی لی۔ شاید سفر نے اُسے تھکا دیا تھا۔ کامریڈ نے اُسے انگڑائی لیتے ہوئے بھی دیکھا اور ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ ہوٹل کا واحد بیرا جو مالک کا بھائی بھی تھا اس کے پاس آرڈر وصول کرنے آیا۔

"یار بڑی توڑ لگ رہی ہے سگریٹ کی۔ پہلے مجھے باہر سے "چار مینار" کی ٹن تو لا دو۔" اُس نے یہ فقرہ اتنی اونچی آواز سے کہا تھا کہ کامریڈ منوہر لال چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"پھر چائے اور برفی لے آنا۔" اُس نے دس روپے کا نوٹ اُسے تھما دیا۔

"اچھا مہاراج جی" ــــ کہہ کر ہوٹل والے نے نوٹ پکڑ لیا اور سگریٹ

○

"آ جائیے آپ ۔ میں بھی "چار مینار" ہی پیتا ہوں" کامریڈ نے اُسے
"اب لا۔

"او! دھنواد، دھنواد" ــــ کہتا وہ کامریڈ کے پاس آ گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"میں نے "موگا" جانا ہے۔ یہاں ایک کام کے لیے رُک گیا ہوں۔"

"موگا" کے نام پر پھر کامریڈ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"لیجئے آپ ــــ "چار مینار" سگریٹ خوب ہے۔ آپ شروع سے
"استعمال کر رہے ہیں؟" کامریڈ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
"پیکٹ کھول کر اُس کی طرف سگریٹ بڑھا دیا۔

"میں تو پہلے "بیڑی" پیا کرتا تھا۔" نووارد نے مسکراتے ہوئے
"

اس "وجود باقی لوگ انہیں گفتگو میں مصروف دیکھ کر اب ایک ایک کر کے
"بھی مسکرا کر کر وہاں سے اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

"کہاں سے ہیں آپ؟" ــــ کامریڈ نے آخری گاہک کا بقایا بھی
"ادا کر لیا تھا۔

"اُس کے پار والی بستی سے" ــــ اجنبی نے اس مرتبہ آواز قدرے نیچی
"رکھتے ہوئے کامریڈ کے اور کسی تک نہ پہنچ سکی۔

"اوہ" ــــ کامریڈ کے ہونٹ گولائی اختیار کر گئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔
"نہ تو ہے نا اُس طرف" ــــ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ فقرہ اُس کے منہ

سے نکل گیا۔

"ہاں ـــــ!" اجنبی نے مختصر سا جواب دیا۔

اس دوران ہوٹل والا اُس کے لیے سگریٹوں کی ڈبیا لے کر آگیا تھا۔ دونوں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"آپ میرے ساتھ چائے ضرور پیجئے ـــــ" اجنبی نے کامریڈ سے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

"ہاں! ہاں! ضرور پیوں گا لیکن میزبان میں ہوں۔ آپ تو یہاں اجنبی ہیں۔"

کامریڈ شاید پہاڑوں کے پار والی بستی میں کھویا ہوا تھا۔

جب کبھی کوئی اُس طرف سے آتا تھا تو اُس کی جذباتی حالت کچھ ایسی ہی ہو جاتی تھی۔ وہ بڑا منجھا ہوا ایجنٹ تھا لیکن اپنے وطن کی سمت سے آنے والی ہوا بھی اُسے تڑپا دیا کرتی تھی۔

کامریڈ نے ہوٹل والے کو اشارہ کر دیا تھا کہ وہ اجنبی مسافر کے پیسے نہ لے کیونکہ وہ اس کا مہمان ہے اور یہاں کسی کی مجال نہیں تھی کہ "کامریڈ بھیتا" کے حکم

"آیئے باہر چل کر کھلی فضا میں بیٹھیں ـــــ" اجنبی نے خود ہی تجویز پیش کی۔

"اوہ! ہاں، ضرور، ضرور۔" کامریڈ ابھی تک شاید اُسی بستی میں گھوم رہا تھا

○

دونوں باتیں کرتے باہر آگئے۔ اُن کا رُخ بازار سے باہر اڈے کی طرف جانے والی سڑک کی طرف تھا۔ بازار کے خاتمے پر بنے ایک چھوٹے سے پارک میں نصب کو بالکل ویران نظر آرہا تھا۔ دونوں بیٹھ گئے۔

انہوں نے یوں تو ہوٹل ہی میں "کوڈ ورڈز" کا تبادلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنی شناخت سے مطمئن کر دیا تھا پھر بھی احتیاطاً یہاں بھی انہوں نے ایک

[illegible] کر لیا۔

اجنبی نے ابھی تک اُسے اپنا کوئی نام نہیں بتایا تھا، نہ ہی کامریڈ منوہر لال نے اب تک اُس کا نام پوچھنے کی زحمت کی تھی ـــــ دونوں نے ابھی تک موسم کے متعلق ہی گفتگو کی تھی۔

اچانک ہی اجنبی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بند لفافہ اُسے

[illegible]!

"لیجئے اب چلنا ہوگا ـــــ" اُس نے کامریڈ کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ہاں۔ آپ چلیں۔" کامریڈ نے بادلِ نخواستہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"اچھا حافظ ـــــ" نوواردو نے بڑی آہستگی سے کہا۔

"حافظ ـــــ" کامریڈ کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔

[illegible] سیدھا چلتا چلا گیا۔ کامریڈ وہیں بیٹھا رہا۔ باغ کے دروازے کے قریب [illegible] کے لیے وہ رُکا۔ مڑ کر اُس نے کامریڈ کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ

اس کے باغ سے باہر نکلتے ہی کامریڈ نے بڑی بیتابی سے لفافہ چاک کیا۔

"اب پیلے رنگ کا کاغذ کا ٹکڑا برآمد ہوا۔ جس پر مختصر الفاظ لکھے ہوئے تھے

[illegible] ڈی بدل گئی ہے ـــــ اب پی۔ ایم نمبر لوٹ کرنا ہے۔" نیچے ایک خاص [illegible] تھے۔

[illegible] ہاتھ میں پکڑے وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر دوبارہ کاغذ پر نظریں دوڑا [illegible] جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور کاغذ اور لفافے کو جلا کر اُس کی راکھ [illegible] ڈالی۔

گھڑی پر نظریں دوڑا کر اُس نے دل ہی دل میں ایک اندازہ لگایا اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا بازار کی طرف آگیا۔ اِس مرتبہ اُس کا رُخ ہوٹل کے بجائے بازار کی دوسری سمت بنے اُس محلّے کی طرف تھا جہاں وہ ایک بڑے احاطے میں بنے بے شمار کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ اِس بڑے احاطے میں رہنے والے تمام لوگوں کو اُس نے قریباً ایک ہی کنبے کا رُکن بنا دیا تھا اور سب لوگ الگ الگ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا! آج بڑی جلدی گھر آگئے"۔۔۔ اُس کے ساتھ والے کوارٹر میں رہنے والی جانکی دیوی نے پوچھا۔

"بس یونہی۔۔۔ آج بہن بہت یاد آرہی تھی"۔ اُس نے جانکی دیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تو بچّہ بلا آنا اُس سے"۔

"ہاں موسی۔۔۔ مَیں سوچتا ہوں۔ آج شام کو چلا جاؤں۔۔۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کوارٹر میں جا گھسا۔

Scanned and ... by Qamar Abbas

○

... مریڈ منوہر لال کے کچھ رشتہ دار ابھی زندہ تھے۔ اُس سے اکثر لوگ ملنے بھی ... آتے تھے اور کبھی کبھی وہ بھی اُن سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی ... بلنے جا رہا تھا اور اُس احاطے کے لوگ اُس کی چند روزہ جدائی کے ... ری سے پریشان ہو رہے تھے۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔ مَیں کوئی مرنے نہیں جا رہا۔ دو تین روز میں لوٹ آؤں گا"۔ ... سب کو پیار سے ڈانٹا اور اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس پکڑ کر باہر آگیا۔ لاری ... تک ایک دو آدمی اُسے چھوڑنے جا رہے تھے۔ جنہیں اُس نے زبردستی واپس ... دیا۔

... سے ٹکٹ خرید کر جب وہ لاری میں سوار ہو رہا تھا تو اُس کی جہاندیدہ ... نے اُس سُرخ پگڑی والے سکھ کی حرکات کا بخوبی جائزہ لے لیا تھا جس نے ... ساعت اُس سے خفیہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔

○

... کھیل اُس کے لیے نیا یا انوکھا نہیں تھا۔۔۔ وہ اس میدان کا ... تھا اور ایسی کسی حرکت کی نشاندہی اُس کی چھٹی حس کر دیا کرتی تھی۔

... پولیس اور سیکورٹی کو اُس کے بھارتی ہونے کا یقین ہو چلا تھا لیکن ... آج بھی بخوبی محسوس کر رہا تھا کہ پچھلے دو تین ماہ سے جب کبھی اُس نے ... جانے کی کوشش کی۔ اُس کی نگرانی ضرور کی جاتی تھی۔

... خفیہ پولیس کے ایک انسپکٹر نے، جو اس کے مداحوں میں شامل تھا، اُسے ... اطلاع کو اُس کے "مسلسل باڑی" ہونے پر شک ہے۔ اِس سلسلے میں یوں

بھی اُسے دو تین مرتبہ مختلف حیلوں بہانوں سے بلا کر حکومت نے اس کی تفتیش کی تھی کیونکہ اس نے اپنے اخبار سے یہ ثابت کیا تھا کہ صرف "زبان" کی حد تک انتہا پسند کمیونسٹ ہے لیکن اس طرح تو خفیہ پولیس بھی اُن کی جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔

"آج کا یہ تعاقب بھی شاید اسی سلسلے کی کڑی ہو۔" اُس نے سوچا۔

لاری چل پڑی اُس نے ٹکٹ تو کسی اور شہر کا خریدا تھا۔ لیکن راستے میں ایک سٹاپ پر اچانک ہی اُتر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ علاقہ "بھوانی ماں" کا علاقہ کہلاتا تھا اور یہاں کا "بھوانی مندر" اپنی پوجا کے لیے سارے پنجاب میں مشہور تھا۔ دور دور سے یاتری یہاں نذریں اُتارنے آیا کرتے تھے۔

اُس سے دو سیٹیں پیچھے بیٹھا خفیہ پولیس کا اہلکار اُس کے اچانک اُترنے پر پہلے تو چونکا پھر اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے سوچا آج محنت راس آگئی اور ضرور وہ یہاں کامریڈ منوہر لال کا کوئی خصوصی تعلق و تلاش کرے گا۔

"بھوانی ماں" کے سٹاپ پر لاری سے قریباً ایک چوتھائی سواریاں اُتر گئی تھیں خفیہ پولیس کا سکھ اہلکار بظاہر خود کو حالات سے مکمل لاتعلق رکھنے کی شاندار ایکٹنگ کر رہا تھا لیکن اصل میں بُری طرح بوکھلا چکا تھا اور اس بوکھلاہٹ کے نتیجے ہی میں اُس نے اپنا پاؤں سامنے سیٹ پر بیٹھی ایک موٹی عورت کے پاؤں پر رکھ دیا۔ جس نے اونگھتے ہوئے اپنی ٹانگیں سیٹوں کے درمیانی راستے میں پھیلا رکھی تھیں۔

عورت شاید ابھی تک نیم خوابی کی کیفیت کا شکار تھی۔ اچانک پاؤں پڑنے سے اُس نے گھبرا کر اتنی زور سے چیخ ماری کہ تمام سواریاں چونک کر اس طرف دیکھنے لگیں۔ عورت نے اس اثنا میں دروازے کی طرف بڑھتے سکھ کو دیکھ لیا تھا جس سے نادانستگی میں یہ حرکت سرزد ہوئی تھی۔

موٹی عورت غصے اور تکلیف کے مارے اچانک پہلے تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی

اور پھر روتے ہوئے دھڑام سے سیٹ پر گرتے ہوئے اپنا پیر پکڑ لیا۔ بس کی سواریاں بے چاری مظلوم عورت کا ساتھ دے رہی تھیں اور انہوں نے گالی گلوچ شروع کر دی۔

اس کی تمام سواریوں کی طرف سے باجماعت ہونے والی پھٹکار نے اس کے دماغ پر چڑھا دیا تھا لیکن اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب اُن لوگوں کو اپنی سرکاری شناخت کروائے گا وہ مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیں گے۔

وہ نگاہ سے گھلائے دے رہی تھی کہ شاید کامریڈ پھر ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن اس میں جان آگئی۔ جب بس سے نیچے اُترتے ہی اُس نے سڑک کے پار پان سگریٹ کی دکان پر منوہر لال کو سگریٹ نوشی میں مصروف پایا۔ اس نے ہاتھ میں کمپا کولا کی بوتل پکڑ رکھی تھی اور کسی دوسری دنیا میں گم کھڑا تھا۔

کامریڈ بہت خوش ہوا اور سجدہ شکر بجا لایا۔ کامریڈ نے اُسے دیکھ کر اظہار نہیں کیا تھا۔ اُسی اطمینان سے اُس نے بوتل ختم کی اور سگریٹ کا لمبا لمبا کش لے کر اُسے پاؤں کے نیچے پھینک کر مسل دیا۔ اب اس کا رخ بھوانی مندر کی طرف تھا۔ دوسرے یاتریوں کی طرح وہ بڑے احترام سے چلتا ہوا مندر پہنچا۔

مندر کے تالاب پر موجود تالاب میں اُس نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اشنان کیا اور پھر وہاں ناریل بیچنے والے سے دو ناریل خریدے اور مندر میں داخل ہو گیا۔ وہ بڑی حیرت سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کی اطلاعات کے بالکل برعکس وہ ہر طرح کی قسم کا پابند دھرم تھا۔ اس کے طریقۂ ہائے عبادات سے بھی یہی

Scanned with CamScanner

شام ڈھل رہی تھی جب وہ آشرم کے دروازے پر پہنچا۔ اندر بھجن کتھا اپنے
عروج کو چھو رہی تھی۔ وہ ان سب باتوں سے لاتعلق سا آشرم کے رہائشی حصے
کی طرف بڑھنے لگا۔ پندرہ بیس کوٹھڑیاں ایک قطار میں بنی ہوئی تھیں۔ کوٹھڑی
نمبر ۱۱ کی اس قطار کے سامنے سے گزر کر وہ آخری کونے والے کمرے کی طرف بڑھا۔
روشنی دکھائی پڑتا تھا جیسے وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہو۔ بھجن کتھا کی
وجہ سے آشرم کا کوئی سیوادار وہاں نظر نہیں آرہا تھا۔ کامریڈ نے ایک لمحے کے لیے
رک کر کچھ سوچا پھر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک کونے میں میز چراغ
جل رہی تھیں ——— کوئی بھی شخص باہر سے عمارت دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ
اس کمرے میں کوئی خفیہ راستہ اوپر جانے کا بھی ہوگا۔

سیڑھیوں کے ذریعے بغیر آواز پیدا کیے وہ اوپر کوٹھے پر چلا گیا۔ کوٹھے پر چارپائیاں
بھی تھیں۔ ایک کونے میں بھی چارپائی پر اسے ایک پجاری لیٹا نظر آیا۔

"اے منوہر تم؟" اسے پجاری کی آواز سنائی دی۔

"ہاں میں ہوں کاکا!" ——— اس نے پجاری کو جواب دیا۔

"کب آئے؟" پجاری نے ایک اور چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آج ہی اور ابھی ابھی۔"

"کیا بات ہے اس مرتبہ بڑی دیر لگا دی ———" دوران گفتگو پجاری اس کے
اور بھنے پتیلے پر مسلسل نظریں گاڑے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔ کامریڈ
نے اس کا مدعا بھانپ لیا تھا۔ اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافے میں لپٹی
ہوئی بوتل نکال دی۔ یہ وہی بوتل تھی جو اس نے اسی شہر کے ایک گھٹیا سے شراب
خانے سے تھوڑی دیر پہلے خریدی تھی لیکن بوتل کا لیبل اس دوران صاف ہو چکا تھا۔

"لے کاکا کیا یاد کرے گا۔ تیرے لیے خاص طور سے پہلے توڑ کی لایا ہوں بالیوں

ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی پروہت کی اولاد ہے اور ایسی عبادات اس کا روزانہ کا
معمول ہیں۔

خفیہ پولیس کے اہلکار کو بھی بادلِ نخواستہ اس کے ساتھ ہی مندر میں داخل
ہونا پڑا۔ کامریڈ منوہر لال کا خشوع و خضوع اور انہماک دیکھ کر وہ اسے بجائے
مکمل باڈی کے صدیوں پرانا "تپ دھاری" سمجھنے لگا تھا۔ جب کامریڈ پجاری سے پرشاد
لے کر واپس آیا تو سکھ اہلکار نے اس کا پیچھا کرنے کی بجائے واپس لوٹ جانے کا فیصلہ
کر لیا تھا۔

"درگا ماں" کے سٹاپ سے اپنے ٹھکانے تک وہ اپنے افسران بالا کو رپورٹ
دیتا آیا تھا کہ انہوں نے اس کا وقت ضائع کروانے کے لیے خوامخواہ اسے زحمت
کروایا۔ اگلے روز جب آفس پہنچ کر اس نے "ڈائری" لکھی تو کامریڈ منوہر لال کو "مہا
تپ دھارک مہندو" قرار دیا اور جو لوگ اسے "مکمل باڈی" بنانے پر تلے ہوئے تھے
ان کے بارے میں اچھی خاصی قصیدہ خوانی کر دی۔

○

مندر سے باہر آکر منوہر لال نے سکھ کو واپسی کا راستہ ناپتے دیکھ لیا تھا۔
بے اختیار ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ وہ اپنے ٹٹے قدموں سے
چلتا "درگا ماں" بس سٹاپ تک پہنچ گیا۔

یہاں سے ابوہر پہنچنے تک اس نے تین مرتبہ بسیں بدلی تھیں حالانکہ وہ
چاہتا تو سیدھے راستے سے بھی یہاں آسکتا تھا۔ ابوہر کے بس سٹاپ پر اترنے کے
بعد اس نے شہر کے چھوٹے سے بازار کا رخ کیا۔ اور ایک شراب کے تھیلے کے سامنے
جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بوتل خرید کر اس نے اپنے تھیلے میں ڈالی اور بڑے اطمینان
سے چلتا ہوا شہر کے واحد بڑے بازار کے کونے پر بنے ایک آشرم کی طرف چل دیا

Scanned at 3PCS by Gamar Abbas

کو ایک ہفتہ پہلے بتانا پڑتا ہے؟"

"ارے جیتا رہ بھتیجے! تیری ان ہی اداؤں نے مار ڈالا ہے ہمیں ——" اس نے مذبحے بکروں کی طرح جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بوتل چھین لی —— "ابھی آیا۔"

کہہ کر وہ ایک کونے میں بنی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔

یہ کوٹھے پر بنا واحد کمرہ تھا اور شاید اس کا ذاتی کمرہ۔ اس نے کمرے میں پہنچ کر بلک جیسوں مرتبہ بوتل کو چوما تھا اور اسے اپنے کمرے میں چھپا کر باہر آگیا۔ لیکن اب تیزی سے اندر گیا۔ اس مرتبہ وہ باہر آیا تو ہاتھوں میں بستر تھامے ہوئے تھا۔ اس نے ایک خالی چارپائی پر بستر رکھ دیا اور منوہر لال کو وہاں بیٹھنے کو کہا۔

منوہر لال بھی نہ نہ کرتا وہاں جا بیٹھا۔

اسے وہاں بٹھا کر پجاری جھومتا ہوا نیچے اترا اور چند منٹ بعد اس کی اہلیہ ایک نوعمر لڑکے کے ساتھ ہوئی۔ جس نے ہاتھوں میں ٹرے پکڑ رکھی تھی جس میں تازہ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو منوہر لال کی بھوک کو چمکانے کے لیے کافی تھی۔

"بھی کتھا" بدستور جاری تھی لیکن وہ کھانا کھاتے ہی اسی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اٹھا اور بستر سمیت پجاری کے کمرے میں جا گھسا۔ رات گئے جب پوجا سے فارغ ہو کر پجاری جی اوپر آئے تو ان کے کمرے میں منوہر لال لمبی تان کر سو رہا تھا۔ پجاری جی نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

"جیتے رہو بھتیجے! مجگران نہیں لمبی عمر دے کتنا خیال رکھتے ہو اپنے چچا کا" انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ اور بوتل ہاتھ میں پکڑے بڑی آہستگی سے باہر آگیا۔

○

صبح اٹھ کر سب سے پہلے کامریڈ نے اشنان کیا۔ اس کے لیے پجاری جی نے چھت پر ایک غسل خانے کو نما لگوا کر رکھا تھا جو کامریڈ کو دیکھتے ہی رات والے خدشے

کے نکھول دیا —— انسان سے فارغ کر کامریڈ "دل نواستہ" بھن کتھا" میں شمولیت کے لیے چلا گیا۔

"کتھا" کے خاتمے پر اس نے حسب روایت پرشاد بھی حاصل کیا۔ اور پجاری کے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ پجاری ابھی تک نیچے مصروف تھا، لیکن اس نے اپنے "مہمان" کو بھلایا نہیں تھا۔ وہی نوعمر لڑکا کامریڈ کی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کے لیے گرم گرم پوریاں حلوہ اور چائے لے کر آیا۔

"پجاری جی ابھی آتے ہیں —— آپ ناشتہ کیجیے!" اس نے بڑے مودب لہجے میں کامریڈ کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے —— جاؤ تم" —— اس نے لڑکے کی طرف دیکھے بغیر بڑی شان بے نیازی سے جواب دیا۔

ناشتہ کرتے ہوئے وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق اس کا "پارسل" بہت احتیاط سے "پوسٹ" کیا گیا تھا لیکن ابھی تک وہ اپنی جگہ نہیں پہنچا تھا اس کے ساتھ ہی آر۔ وی" بھی بدل دی گئی تھی۔ اسے تشویش صرف اتنی تھی کہ کہیں "پارسل" غلط ہاتھوں میں نہ چلا گیا ہو۔ کیونکہ ان لوگوں نے بہت جان سوزی کے "دل نواستہ" تلاش کیا تھا۔

ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ "محفوظ راستے" پر سے کسی "پارسل" کا گم ہو جانا اس کی اطلاع سے بہت کم ممکن تھا ضرور اس میں کسی "ڈبل کراس" کا ہاتھ تھا اور ان "ڈبل کراس" کی موجودگی ایک ہی کے لیے نہیں سب کے لیے تباہی کا باعث بھی بن سکتی تھی۔

کامریڈ جی تھا اسے بہرحال ابھی صرف "دیکھنا اور انتظار کرنا تھا۔

○

پنڈت جی کے نہ کرنے کے باوجود کمار بضد تھا کہ وہ بھی بس سٹاپ تک اُن کے ساتھ ضرور جائے گا ـــــ اور جب وہ ساتھ ہو ہی گیا تو چلتے چلتے خان نے اُسے ٹٹولا۔

"آپ کا گاؤں بڑا خوبصورت ہے۔ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ راجستھان کا یہ علاقہ صحرا ہو گا۔"

"مہاراج جی! آپ تو پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ کو علم نہیں راجستھان کا تو بس نام ہی ہے ـــــ یہ سارا گنگا نگر تک کا علاقہ پنجاب میں ہے ـــــ صدقے جائیے ہماری سرکار کے جس نے پنجابی صوبے کا نشٹ مارنے کے لیے اُس کے ٹکڑے کر دیے۔ چندی گڑھ تو گیا ہی تھا۔ ہریانہ میں بھی خاصا علاقہ شامل کر دیا اور اس طرف ڈنڈی مار کر گنگا نگر بھی لے لیا ـــــ اب لے لیں سکھ پنجابی صوبہ ـــــ!!" کمار خاصا سمجھدار نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہم نے تو پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ آپ بڑے کام کے آدمی ہیں ـــــ خان نے اُس کی سیاست سے نجات پانے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"دھتواد ـــــ" کمار نے انکساری سے کہا۔

"کمار جی! جب ہم کسی کو اپنا سجن بنا لیتے ہیں تو اس سے دل کی بات چھپایا نہیں کرتے ـــــ" اُس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا ـــــ "دھرم کرم اپنی جگہ ـــــ اور دھندا اپنی جگہ۔"

اپنے آخری فقرے کا اُس نے بڑا خوشگوار ردِ عمل کمار کے چہرے پر دیکھا۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"بالکل بجا کہا مہاراج!"

"ہمارے ماتا پتا نے آج تک دھرم کی ٹھیکیداری کر کے کھایا ہی کیا ہے!"

"بالکل بجا کہا مہاراج!" ـــــ کمار نے اگلی بات اُس کے منہ سے نکلوانے کے لیے ایک اور حوصلہ افزائی کی۔

"سچی بات تو یہ ہے بھیا نرے دھرم سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اب تم سے کیا پردہ ہم کبھی کبھار دھندا بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اُدھر سرحد پار سے کوئی مال اِدھر منگوا لیا اور کبھی اِدھر سے اُدھر بھیج دیا۔ مہینے میں ایک آدھ چکر بھی لگ جائے تو چاندی ہو جاتی ہے۔"

اس کی بات مکمل ہوتے ہی کمار نے زور سے اُس کا ہاتھ دبا کر گرمجوشی کا اظہار کیا۔ "میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا مہاراج جی! میری ساری زندگی انہی دھندوں میں گزری ہے لیکن آپ پنڈت جی مہاراج ہوتے کھل کر کہہ نہ سکا۔"

"آپ تو بڑے سیانے ہو ـــــ کمار جی! ہم نے بھی یونہی تمہیں نہیں چن لیا۔" وہ مسکرائے۔

وہ دونوں کھیتوں کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ سڑک یہاں سے نزدیک ہی تھی۔ "مال سے پیدل ہی چلنا چاہیے ـــــ باتیں بھی کرتے جائیں گے۔" خان نے تجویز پیش کی۔

"جی بے مہاراج! بالکل ٹھیک ہے۔" کمار تو جیسے اُس کا دُم چھلا بن کر رہ گیا تھا۔ اُس نے کچھ سوچ کر ایک نیا راستہ پکڑ لیا۔

"وہ سکھدیو کا میں نے ذکر کیا تھا وہ ہمارا کچھ مال لے کر بھاگ گیا ہے۔ خانہ خالی ہم نے ہی اعتبار کر کے غلطی کی۔ خیر اب کچ کر تو جیتا جا نہیں سکتا۔ سنا ہے وہ گاؤں کے نزدیک ہی کہیں پچھلے دنوں نظر آیا تھا۔ اسی اطلاع پر ہم اِدھر اس طرف ـــــ کمار جی! آدمی تم بڑے جی دار ہو اور سمجھدار بھی۔ سچی بات ہے اس علاقے میں تم جیسے کھرے بندوں کی تلاش ہی رہتی ہے۔ اگر چاہو

Scanned with CamScanner

تو ہم تمہیں دلوں میں مکھ پتی بنا دیں گے ـــــ" آخری بات کہہ کر خان نے اُس کا ہاتھ بھی گرمجوشی سے دبا دیا تھا۔

"مجھے ہمیشہ اپنا وفادار پائیں گے مہاراج ـــ کتوں سے بھی زیادہ وفادار" ـــ جوش جذبات سے کمار کی آواز کانپنے لگی تھی۔

خان چلتے چلتے اچانک رُک گیا۔ اُس کا ہاتھ اپنی قمیص کی جیب میں رینگ گیا اور باہر نکلا تو نوٹوں کی ایک گڈی اُس میں لہرا رہی تھی۔ کمار کی رال ٹپک رہی تھی اور ندیدے بچوں کی طرح اس کی آنکھیں نوٹوں پر جمی تھیں۔ سو سو کے پانچ نوٹ گڈی سے الگ کر کے خان نے باقی نوٹ جیب میں ڈال لیے ـــ اُس نے کمار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور پانچوں نوٹ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیے ـــ

"ہم یاروں کے یار ہیں کمار جی! یہ صرف ہمیں ایک رات ٹھہرانے کی قیمت ہے ـــ اگر سیدھی طرح چلتے رہو گے تو ساری زندگی عیش میں گزرے گی۔" اس نے اپنا منہ کمار کے کان کے قدرے نزدیک کر لیا تھا ـــ "اس گروہ میں بڑے بڑے کروڑ پتی اور افسر شامل ہیں لیکن کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا ـــ کمار جی! ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں پہنچ کر ہر چیز معدوم ہو جاتی ہے ـــ پولیس کبھی تمہاری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھے گی ـــ لیکن شرط ایک ہے۔"

"کہہ کر کیا مہاراج ـــ" کمار کا چہرہ شدت جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا۔ یہ پانچ سو روپیہ اُس کے تصور یک پانچ لاکھ کے برابر تھا۔ اُس نے واقعی زندگی میں کبھی اتنی بڑی رقم دیکھی تھی ـــ "کبھی یہ تصور بھی نہ کرنا کہ ہم سے غداری کر کے تم بچ جاؤ گے ـــ میں نے کہا نا ـــ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ہم جتنے اچھے دوست ہیں اُتنے ہی بُرے دشمن ہے۔"

"ایسا کبھی نہ ہوگا مہاراج! میں بھی جاٹ کا بچہ ہوں۔ جو زبان سے کہہ دیا سو کرنا

لان لٹ جائے پر زبان نہیں کٹے گی۔"

"شاباش ـــ" خان نے اُس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

"کہئے کرنا کیا ہوگا؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ـــ بس عیش کرو اور پیسے کماؤ" ـــ خان نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

"پھر بھی مہاراج آخر کوئی سیوا تو کرنی ہی ہوگی۔"

"ہاں! جیسے آج میں اچانک تم سے ملا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی مہمان، اسی طرح دن یا رات کے کسی سمے میں تمہارے پاس آیا کرے گا ـــ اپنی پہچان کروانے کے لیے وہ یہ کہنے میرا نام لے گا۔ بس اتنا کافی ہے ـــ وہ تمہارے پاس ایک آدھ دن ٹھہرے گا اور چلا جایا کرے گا ـــ لیکن ہر آنے والا تمہاری جھولی بھر جایا کرے گا۔ تمہاری آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو۔ علاقے میں اردگرد جو کچھ سکیورٹی والے کریں تمہارا کام ہے ـــ تمہارا فرض ہوگا کہ اپنے کسی آدمی کی ہوا بھی سکیورٹی والوں کو لگنے دو۔"

"مہاراج ـــ یہ بھی کوئی کام ہے" ـــ وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ "یہی اتنے سے کام کا معاوضہ بھی ہزاروں روپے ملا کرے گا۔ اور ہاں جب کبھی آپ کو سیر کرنے کو جی چاہے تو ہمیں اشارہ کر دینا ـــ بھارت کے جس بڑے شہر کی آپ کہیں ہم نہیں سیر کروائیں گے اور باقی سب کچھ بھی ـــ ہاں ایک بات اور یاد رکھنے کسی آدمی کو جو تم سے ملنے آئے کبھی شراب اور عورت کے چکر میں نہ پھنسانا اس کے سامنے کبھی خود ان دونوں کا نام لینا۔ اس کے لیے آگ سے کھیلنا ہے ـــ ہم کام کے دوران کوئی غیر ذمہ دار حرکت برداشت نہیں کرتے۔" خان نے رخصت میں لے لیا تھا۔

"آپ کا ایڈریس کیا ہوگا مہاراج ——؟" کسے کام کی بات تو اب یاد آئی تھی۔

"کوئی نہیں —— ہم میں سے کسی کا کوئی ایڈریس نہیں ہوتا ہم لوگ خود ہی تم سے رابطہ قائم کر لیا کریں گے۔"

"اگر کوئی بات آپ تک جلدی پہنچانی ہو تو ——" کمار عقلمند نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کمار نام کا ہمارا آدمی تم سے ملتا رہے گا —— ہم ہفتے یا پندرہ دن میں ایک آدھ بار تم سے رابطہ کیا کریں گے —— جب آہستہ آہستہ تم اپنا اعتماد قائم کر لو گے اور ہمارے زیادہ نزدیک آجاؤ گے تو پھر اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی —— دیکھو کمار جی اسب کچھ ہو جائے گا لیکن دھیرے دھیرے —— زیادہ گرم گرم کھانے کی کوشش میں اپنا منہ نہ جلا لینا ہاں ——" ہمیں بھاڑے کے ٹٹو تو یہاں ہزاروں مل جاتے ہیں۔ ہم کسی سے بھی مدد لے سکتے ہیں لیکن ہمارا اصول ذرا الگ ہے۔ بس میرا من تم پر آ گیا اور میں نے تمہیں منتخب کر لیا —— اگر ہماری باتوں سے اتفاق ہو تو ہاں کرنا ورنہ کوئی زبردستی نہیں۔ میں تمہیں اور پیسے بھی دے دوں گا اور تمہاری ضرورت بھی پوری کرتا رہوں گا۔ کیونکہ میں نے تمہارا نمک کھا لیا ہے لیکن ایک دفعہ جب تم دھندے میں ہمارے ساتھی بن جاؤ گے تو پھر ہمارے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا ہوگا —— ورنہ موت کسی بھی لمحے تمہیں آ لے گی۔"

"میں بچہ نہیں ہوں مہاراج۔" کمار نے سر تسلیم خم کیا۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ وہ مختلف پگڈنڈیاں مڑتا چلا جا رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں انہیں وقت کا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یوں بھی خان نے اتنی اہم اور دلچسپ گفتگو شروع کر رکھی تھی کہ کمار کے بے زمان و مکان کا احساس بھی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ کاجی چاہتا تھا کہ اسی طرح پنڈت جی اس کے لکھ پتی ہونے کی باتیں کرتے رہیں۔

اس نے کھیتوں میں ایک ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ دو ڈھائی گھنٹے پیدل چلنے کے بعد خان کو شہر کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس دوران وہ کسی بھی چونگی یا چیک پوسٹ کے قریب سے نہ گزرے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے قریباً پانچ میل کا سفر طے کر لیا تھا راستے میں شاید ہی کہیں کوئی ان کے قریب سے گزرا ہو۔ خان نے اندازہ لگا لیا تھا کمار میں ایک اچھے "گائیڈ" کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ ایسے راستوں سے واقف تھا جو اس کی دانست میں محفوظ راستے تھے —— ایسے ہی آدمی کی تلاش میں وہ شعوری طور پر تو نہیں لیکن قدرت نے اس سے بڑا اہم کام لے لیا تھا۔ بظاہر اس کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے کمار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس مرتبہ پھر اس نے اپنے بٹوے میں ریشمی اور سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس نے بچے کھچے کمار کو تھما دیا۔ "یہ تمہارے بچوں کی مٹھائی ہے۔ اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ یہاں سے تم اکیلے گیا اور میں نے تمہیں منتخب کر لیا —— اگر ہماری باتوں سے اتفاق ہو تو ہاں کرنا ورنہ کوئی زبردستی نہیں۔ میں تمہیں اور پیسے بھی دے دوں گا اور تمہاری ضرورت بھی پوری کرتا رہوں گا۔ کیونکہ میں نے تمہارا نمک کھا لیا ہے لیکن ایک دفعہ جب تم دھندے میں ہمارے ساتھی بن جاؤ گے تو پھر ہمارے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا ہوگا —— ورنہ موت کسی بھی لمحے تمہیں آ لے گی۔"

"میں بچہ نہیں ہوں مہاراج۔" کمار نے سر تسلیم خم کیا۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ وہ مختلف پگڈنڈیاں مڑتا چلا جا رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں انہیں وقت کا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یوں بھی خان نے اتنی اہم اور دلچسپ گفتگو شروع کر رکھی تھی کہ کمار کے بے زمان و مکان کا احساس بھی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ کاجی چاہتا تھا کہ اسی طرح پنڈت جی اس کے لکھ پتی ہونے کی باتیں کرتے رہیں۔

○

اس نے ہمت شدہ کمار کو وہیں چھوڑا اور شہر کی طرف گھوم گیا۔ کمار حیرانگی سے اس کو دیکھتا رہا۔ بمشکل اس کے منہ سے "رام رام" نکلا! اس آخری وار نے اس کی گھائل کر دیا تھا اور وہ ذہنی طور پر خان کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار ہو گیا تھا۔

اب چھوڑ کر وہ دوسری سمت گھوم گیا۔ کمار اسے تب تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب تک خان درختوں کے جھنڈ میں غائب نہیں ہو گیا۔ اب وہ اس نالے کو پار کر رہا تھا جو شہر اور اس علاقے کے درمیان حد بندی کا کام دے رہا تھا۔ نالے کے تقریباً ۱۰۰ گز کے فاصلے پر لکڑی اور لوہے کے گارڈروں کی مدد سے پل بنے ہوئے

1 of 3 PDF by Osmar Abbas

تھے جن پر سے لوگ آ پار آ جا رہے تھے۔

خان بھی ایک ٹکڑی کا پل عبور کر کے شہر میں داخل ہو گیا۔ اُس کے سامنے شہر کا بازار پھیلا ہوا تھا۔ اس بازار میں ضروریات زندگی کی ہر شے دستیاب تھی اور دُکاندار ایک دوسرے سے زیادہ بلند آواز میں اپنی اپنی اشیاء کی تشہیر کر رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ لوگوں کی بھیڑ کے بیچوں بیچ راستہ بناتا بڑے اطمینان سے چلا جا رہا تھا۔

ایک قدرے ماڈرن سٹور پر رُک کر اُس نے اپنے لیے ایک ریڈی میڈ پتلون خریدی اور وہیں اپنے جسم پر فٹ بھی کر لی۔ پرانے کپڑے تھیلے میں منتقل ہو چکے تھے۔ دُکان سے باہر آ کر اُس نے وہ تھیلا ایک چھوٹے سے ہوٹل کے نزدیک رکھ دیا — بالکل اسی طرح جیسے کوئی بھول گیا ہو۔

تھیلے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر وہ اُس کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتا رہا۔ بمشکل دو ہی منٹ بعد اُس نے دبے قدموں ایک ہندو لالے کو تھیلے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ پہلے تو وہ تھیلے کے پاس لاتعلق سا کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے لوگوں کی نظریں بچا کر تھیلا بغل میں دبایا اور بڑی تیزی سے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ خان نے اُسے دُور تک جاتے دیکھا اور پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ تھیلا کسی خاص آدمی کے ہاتھ نہیں لگا۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ لالہ جی نے گھر پہنچ کر ہی دَم لیا ہو گا! بازار میں بنی دامد سڑک کے فٹ پاتھ پر سجی خوانچوں کی قطار میں بیٹھے ایک مینک فروش سے اس نے بظاہر ایک قیمتی مینک بھی خرید لی تھی۔

سیاہ شیشوں کی اس مینک نے اس کے چہرے کو خاصا رعب دار بنا دیا تھا۔ اُس کی منزل برائے کیس فروخت کرنے والوں کی دکان تھی۔ بازار میں بنی واحد دُکان سے اس نے ایک برائے کیس بھی خرید لیا اور جب آنکھوں پر چشمہ لگائے برائے

اٹیچی تھامے وہ باہر نکلا تو خاصا معزز شہری دکھائی دے رہا تھا۔

ایک چاندی کی زنجیر میں ٹنگی "وشنو مائا" کی مورتی اُس کے گلے کا ہار پہلے ہی ہو چکی تھی اور وہ کسی بگڑے ہوئے ہندو گھرانے کا پڑھا لکھا نوجوان سرکاری ملازم نظر آتا تھا۔

اڈے پر پہنچ کر اُس نے بڑے اطمینان سے ٹکٹ گھر سے بٹھنڈہ کا ٹکٹ لیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اُس وقت اُس کے ہاتھ میں گولڈ فلیک کی ڈبیا اور ماچس پکڑی ہوئی تھی۔ سگریٹ سُلگا کر وہ بڑے انداز میں اس کے کش لگا رہا تھا۔ رات کی نیند گو کہ ستمگر تھی لیکن اتنے معمولی سے حلیے میں اس نے خان کو بالکل تازہ دم کر رکھا تھا۔ اس کے نزدیک سے گزرنے والے ہر شخص کی نظر ڈال کر آگے نکل جاتے۔ اُس کے متعلق کسی کے ذہن میں شک کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

تقریباً آدھا پینے کے بعد بڑی لاپرواہی سے اپنے جوتوں تلے اس نے سگریٹ مسل دیا تھا اور وہ اب پہلے سُست قدموں سے بائیں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بائیں سیٹ پر ایک ریٹائرڈ قسم کا ہندو لالہ بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر لگے چشمے کے دبیز شیشے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ آدمی کچھ شد بد بھی رکھتا ہے۔ دائیں طرف پر خان بیٹھا وہ دو آدمیوں والی سیٹ تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ اسی سیٹ پر دو لڑکیاں براجمان تھیں۔ خان نے اُن لوگوں کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہن بھائی کے لوگ ہیں۔

بالآخر — اُس نے بڑے مؤدب لہجے میں اپنے ہمراہی کو مخاطب کیا۔

"معاف کیجئے گا — کوئی بات نہیں — بوڑھا اُس کی بھرپور شخصیت تلے

بس کی روانگی تک اُن لوگوں کی آپس میں ہونے والی گفتگو سے خان کو بہت کچھ سمجھ آگیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ لوگ کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے بعد واپس جا رہے ہیں۔ یہ فیملی دہلی کی رہنے والی تھی لیکن اپنے کسی عزیز کے ہاں کسی تقریب میں یہ لوگ بٹھنڈہ سے ہو کر جانا چاہتے تھے۔

"کیا شبھ نام ہے آپ کا؟" بوڑھے کو شاید بولنے کا مرض تھا۔

"جی اُدون کمار ــــ" خان کے مُنہ میں جو آیا وہی کہہ دیا۔

"کیا کرتے ہیں ــــ؟" بوڑھا اُس سے مکمل تعارف پر تُلا ہوا تھا۔

"لمبی کہانی ہے شریمان جی" خان نے اب اُسے سنانے کے لیے ایک کہانی تیار کر لی تھی۔

"اس سے بھی زیادہ؟" بوڑھے کی حس مزاح پھڑکی۔ بس کا ایک کنڈیکٹر بہت بے ڈھب اور خاصا لمبا تھا۔ اُس نے کنڈیکٹر ہی کی طرف اشارہ کیا۔

خان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھی کام کا آدمی نکلا تھا کم از کم وہ سفر کی بوریت سے تو بچ جائے گا ــــ لیکن اتنا ہی کیوں اُس نے تو مستقبل کے متعلق بھی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اگر بوڑھا خود ہی اُس کے جال میں پھنسا جا رہا تھا تو وہ کون ہوتا ہے اُسے روکنے والا؟ اُس نے سوچا۔

"آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ نہ صرف اتنی لمبی بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبی ہے۔" خان نے مُسکراتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اس کا لہجہ بوڑھے کے جذبۂ تجسّس کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔

"بہت گہری باتیں کرتے ہو مہاشے! کہیں کوئی عشق کا چکّر تو نہیں ــــ؟" بوڑھے نے قریباً اُس کے کان کے نزدیک منہ لا کر سرگوشی کی تھی۔

"ارے نہیں انکل ــــ اتنی فرصت ہی زندگی میں کہاں ملی۔ لیکن آپ اپنا پرچ

Scanned with CamScanner

لائیے۔ تو کرداد بھئے؟"

"اں ہاں، تو میں بھول ہی چلا تھا جگن ناتھ سہائے نام ہے میرا۔ آج سے چھ ماہ تک ریلوے میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اب ریٹائرڈ ہوں اور گھر بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں۔"

دل کے کوندے کی طرح ایک خیال اُس کے ذہن میں لپکا اور اُس نے کہہ دیا۔ "خیر! ریٹائرمنٹ ملنے کے بعد آپ بیکار تو رہنے کے نہیں؟"

لڑکی نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھی دونوں اُس کی لڑکی کو دیکھنے لگیں۔ پھر اُس کے

"ہو ہی ــــ" اس نے لڑکیوں سے کہا پھر خان سے مخاطب ہوا ــــ "عجیب زمانہ آ گیا ہے، نہ کوئی کھل کر ہنسنے دیتا ہے نہ رونے دیتا ہے۔ ہاں کچھ اپنا جغرافیہ بھی بتائیے!"

جگن ناتھ نے اس سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے پر خاصی سوگواری پیدا کی اور بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ پھر چند لمحے بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولا ــــ "بڑی عجیب بات ہے مہاشے! آپ کے نزدیک بیٹھتے ہی ــــ آپ سے پرچے حاصل کرنے سے بھی پہلے میں آپ کو اپنا جاننے لگا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ ضرور کسی پچھلے جنم میں میرا اور آپ کا کوئی سمبندھ رہا ہے۔ ضرور ایسا ہے ــــ ورنہ یوں اتنی جلدی میں کسی سے بات کرنا؟"

خان نے اس کی ایکٹنگ اتنی شاندار تھی کہ وہ خود اپنے آپ کو دل ہی دل میں داد دینے لگا۔ کیونکہ بوڑھا خاصا امپریس ہو گیا تھا۔

"ہاں ــــ ایسا ہوتا ہے۔ خود میرے ساتھ بھی زندگی میں کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔ پہلی بار ایسا لگا جیسے میں اپنے ستارے سے بچھڑا ہوا کوئی ستارہ تھا جو واپس لوٹ آیا

ہوں ـــــ جیسے کوئی کرنجی اپنی ڈار سے بچھڑ کر واپس اُن سے مل جائے۔ تمہارا من ہلکا
بوجھل ہے کہہ ڈالو دل کی بات ـــــ دل ہلکا ہو جائے گا بیٹا! اس دُنیا میں کسی کے پاس
کسی کی بات سُننے کی فرصت بھی تو نہیں ہے! پھر وہ خود بھی مسکرا دیا ـــــ لیکن یہ
پاس ہے۔ میں تو ریٹائرڈ ہو چکا ہوں ناں! ـــــ اُس کا لہجہ خاصا گھمبیر ہو چلا تھا

آگے بیٹھی لڑکیوں نے اب اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ اُسے ا
پتا جی کا کوئی پرانا جاننے والا سمجھنے لگی تھیں۔ دونوں کے کان اُن کی گفتگو ہی پر تھے
نتیجہ یہ اندازہ خان نہ لگا سکا کہ وہ اس کھٹارہ نما بس کے شور میں اُس کی آواز سُن
لی تھی۔ یا نہیں؟

لڑکیوں نے اپنی نشستوں پر اب پہلو بدلنے شروع کر دیے تھے۔ بھارتی ناریوں
فطری کمزوری اُن پر بھی غلبہ پانے لگی تھی۔ دونوں اب خاصی ترچھی ہو کر بیٹھ رہی تھیں
ہاتھ والی لڑکی تو اب اس پوزیشن میں آ چکی تھی کہ براہِ راست خان کی آنکھوں
سکے۔

خان نے بوڑھے کو کریدنا شروع کر دیا۔ اُس کی کہانی برصغیر کے ہر ریٹائرڈ آدمی
ملتی جلتی تھی: زندگی بھر محنت کی اب ذرا آرام کا وقت آیا تو اپنوں نے دھتکا
کر دیا۔

اب یہی المیہ بوڑھے جگن ناتھ سہائے کی جان کا روگ بنا جا رہا تھا۔ خان کے ا
اظہارِ ہمدردی کے لیے الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ موجود تھا جس کا اُس نے بے دریغ ا
کیا اور جب وہ لوگ ایک اسٹاپ پر رُکے جہاں بس نے قریباً پندرہ بیس منٹ م
تھا تو بوڑھا سہائے اُس کی مکمل گرفت میں آ چکا تھا۔

بس سٹینڈ میں بنے ایک ہوٹل کے کیبن میں جگن ناتھ کی ساری فیملی موجود تھی
دانستہ باہر کھڑا رہا لیکن سہائے اُسے ضد کر کے اندر لے گیا۔ اُس نے اپنی فیملی کو

ا ت کرایا۔ بڑی بیٹی مسز سوشیل شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں تھی لیکن اُس نے اپنے
ت غفلت نہیں برتی تھی اور اگر سہائے نہ بتاتا تو خان اُس کے بجائے سہائے کی
ی اشا کو اُن بچوں کی ماں سمجھ لیتا۔ تیسری بیٹی جواب تک خاصی ٹیڑھی ہو کر
ان آنکھوں سے دیکھتی آئی تھی سوشیل سے چھوٹی اور آشا سے بڑی تھی اور ایک
ا میں کر بجوالیشن کے آخری سال کی طالبہ تھی۔

کہا شبھ نام ہے آپ کا؟ خان نے خود ہی اُس کا تعارف دریافت کیا تھا۔

ر ما ـــــ اُس نے خاصی لجاجت کا مظاہرہ کیا۔

اگر وہ اکیلی ہوتی تو خان ضرور اس کے اس انداز پر تبصرہ کر کے اُس کے
ا ہ لیے پہلے سے موجود جگہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتا لیکن یہاں اُس نے
ا اس انداز سے مسکرانے ہی پر اکتفا کیا۔ یہ الگ بات کے اُس کے مسکرانے کی یہ
ا کو ضرورت سے زیادہ بھا گئی۔ سہائے کے واحد لڑکے کا نام کشور سہائے تھا جو
ا جامعت کا طالب علم لیکن اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا تھا۔

ا نے اپنی طرف سے خاصی پُرتکلف چائے کا آرڈر دیا سوائے رما اور سہائے کے
ا ے بھی چائے نوشی اور اُس سے متعلقہ لوازمات کو شش جان کرنے میں بُخل سے کام
ا تھا۔ سوشیل کے دونوں ہی بچے نمکساری وانس اور مینا کشی اس معاملے میں کچھ زیادہ
ا محو واقع ہوئے تھے۔ اپنی ماں کی آنکھیں دکھانے اور گھورنے کو انہوں نے یکسر
ا دیا تھا۔

ا ا دیتے ہوئے خان نے جس بے رحمی سے اُسے ٹپ کیا تھا اُس پر اس
ا کی فیملی کا چونکنا بالکل فطری بات تھی۔

بس میں سوار ہونے تک وہ رما کو اپنی وجاہت اور باتوں کر اادت کا قائل
ا

Scanned with CamScanner by Camera Albas

بس کے چلتے ہی بوڑھا سہائے اُس کا دُکھ جاننے پر بضد ہوا اور خان کو بادل
نخواستہ اُسے بتانا ہی پڑا کہ پتاجی کے سورگباش (مرنے) ہونے کے بعد اُس کے دونوں
بڑے بھائی جو شادی شدہ ہیں سانپ بن کر دولت پر بیٹھ گئے ہیں۔ ماں بچپن ہی میں
گئی تھی۔ جب وہ بڑے بھائیوں کو خود پر ہونے والی زیادتیوں کا احساس دلاتا ہے
اُلٹا اُسے آوارہ گرد اور لاپرواہ کہہ کر مورد الزام ٹھہرانا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا حصہ
لے کر الگ ہو جانے کی دھمکی دیتے ہیں!

"لے لو ناں تم اپنا حصہ اور علیحدہ بزنس کرو۔"

بوڑھے سہائے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس کی طرف
دیکھنے لگا۔

"اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا ——— کچھ نہیں کر سکتا۔" خان نے ٹھنڈی آہ بھری۔
"بیٹا! تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ پچھلے جنم میں ضرور تمہارا میرے ساتھ کوئی ناتہ
ہے۔ پھر بھی خود کو اکیلا محسوس کرتے ہو؟" سہائے نے بڑے گمبھیر اور ہمدردانہ لہجے میں
تسلی دلائی۔

جواب میں جس ردِ عمل کا اظہار خان نے کیا تھا وہ سہائے کے لیے بالکل غیر
متوقع تھا۔ اس نے جبکہ ہاتھ سہائے کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑی زور سے
انتہائی محبت سے دبا دیا تھا اور جب سہائے کی نظر اُس کے چہرے پر پڑی تو وہ
کرہی تو رہ گیا تھا:

——— بے چارے ارون کمار کی آنکھوں میں تیرتے آنسو اُس کی جینک کے شیشے
سے بھی صاف دکھائی پڑتے تھے!

خان نے جیب سے رومال نکال کر جینک کو ایک ہاتھ سے اوپر اُٹھا کر
آنکھوں سے آنسو پونچھے اور اپنا منہ کھڑکی کی طرف کر کے خود کو دل ہی دل

سہائے نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اُسے حوصلہ دلایا اور مردوں کی طرح زندگی
گزارنے کا مشورہ بھی دیا۔ دونوں پھر نارمل لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران سہائے
نے اپنی ایک تجویز اُس کے سامنے رکھ دی۔

"بیٹا! اگلے مہینے تک اپنے لئے یا جات مل جائیں گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہل کر
ارون کمار کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتے جانا۔ بیٹا! تم بھی اپنے سورگباش پتا سے بڑھ کر پاؤ گے۔"

خان چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے ایک گہری سانس لی اور سہائے سے مخاطب
ہوا۔

"نہیں! اب کو اپنے بقیہ جات کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ انہیں کسی
دولت کے لیے سنبھال رکھنے ——— میرے پاس دولت بہت ہے لیکن پیار نہیں۔ مجھے
اپنے کی وہ ذرا سی شفقت ہی چاہیئے تھی وہ مل گئی ——— میں آپ سے دہلی میں ملوں گا
اور ارون کمار کو لے آؤں گا جو آپ چاہیں گے۔"

سہائے جوشِ محبت سے مچل مچل گیا۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے خان
کو اپنے سینے سے لگا کر اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ بوڑھے نے نہ
صرف اُسے دہلی میں اپنے گھر کا پتہ سمجھایا تھا بلکہ ارون کمار کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی ڈائری
کے پہلے ورق پر اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر دے دے۔

اس خوبصورت فریضہ بڑے احسن طریقے سے اور مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔
صرف ایک کاغذ پر ایڈریس لکھا بلکہ ایک ٹیلیفون نمبر کونے میں لکھ کر پی پی
کا اضافہ بھی انگریزی میں لکھ دیا تھا۔ یہ کام اس نے اتنی ہوشیاری سے کیا
کہ بیٹی بڑی بہن سوشیلا کو شک تک نہیں ہونے دیا۔

ایڈریس والا کاغذ بھی اُس نے براہِ راست خان کو تھمایا تھا۔ جس نے ایک کونے

Scanned and PDF by Qamar Abbas

میں کھے ٹیلیفون نمبر پر مسکراتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

بٹھنڈہ آگیا ——!

سب لوگ اُتر گئے۔ یہاں سے انہیں الگ ہو جانا تھا۔ سہائے نے خان کو اُس گھر کا ایڈریس بھی سمجھا دیا تھا جہاں اُن لوگوں نے شادی کی تقریب میں شرکت کرنی تھی۔ یہ گھر سہائے کے سالے کا گھر تھا اور اُس نے خان سے بضد ہو کر وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ضرور کم از کم اِس شادی میں شرکت کے لیے آئے گا۔

خان نے اُن کی خوشی کے لیے دلی خواستہ یہ وعدہ کر لیا تھا۔ ورنہ وہ تو بظاہر اتنا مجبور تھا کہ اپنے کاروباری اوقات میں سے ایک گھنٹہ بھی فراغت کے لیے نہیں نکال سکتا تھا جب سہائے نے اُس سے یہاں کا ایڈریس دریافت کیا تو اُردی کمار جی نے بڑی خوش اخلاقی سے اُسے ٹرخا دیا:

"انکل جیب بات پر بھی آپ نے بھی..... بھئی ایڈریس کیا ہو تم مارکیٹیں ہی اپنا ہے ہیں۔ میں یہیں پر گھوموں گا۔ کچھ پیسے لینے ہیں اور کچھ نئے آرڈرز ——"

"اچھا اچھا بیٹا جیسے تمہاری مرضی —— لیکن شادی پر آنے کا وعدہ نہیں بھولنا!"

نے ہنستی بچوں کی طرح خان سے یقین دہانی حاصل کی۔

جاتے ہوئے وہ مینا کشی کو ہاری لڑکے سے خوبصورت گڑیا کا تحفہ خرید کر دینا نہیں بھولا تھا۔ ننھی مینا کشی کب سے اس گڑیا پر نظریں جمائے ہوئے تھی اس سے اس کے ماں باپ کے پاس کے لیے۔ لیکن ہر مرتبہ مسز سوشیل اُسے گھور کر رہ جاتی۔

"رہنے دیتے بھائی صاحب! ایسی تو عادت ہی بھی ہے۔ ہر چیز کے لیے ضد کرتی ہے۔ مسز سوشیل نے احساس تشکر میں ڈوبنے کے باوجود فراز کی راہ ڈھونڈنی چاہی۔

"کوئی بات نہیں۔ میری بھی یہی عادت ہے —— لیکن میرا کیس ذرا مختلف ہے کوئی نے کر نہیں دیتا —— دیری! وہ لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی خوا

انے کے لیے کوئی موجود ہو۔ اُس کا لہجہ اتنا گمبھیر تھا کہ مسز سوشیل دہل کر ہی تو رہ گئی۔

رُما کے دل میں تو اُس کے لیے اب محبت کے ساتھ ترحم اور ہمدردی کے جذبات بھی پلنے لگے تھے۔ اُن لوگوں سے رخصت ہوتے ہوئے خان نے خاص طور سے رُما ہی کی طرف ہاتھ باندھ کر پرنام کیا تھا۔ جواباً اپنے سینے کے سامنے دونوں ہاتھ باندھے بالکل ماں کی تصویر کی مانند اُسے تب تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی جب تک وہ ایک نزدیکی موڑ سے پیچھے غائب نہ ہو گیا۔

○

منوہر لال سمدھ چڑھنے تک پجاری کے ہاں ہی ٹکا رہا پھر اُس نے پجاری سے لیہ جانے کی آگیا (اجازت) لی اور شام تک لوٹ آنے کا وعدہ کر کے باہر آگیا! اُس نے لباس تو سادہ سے کھدر کے پہن رکھے تھے لیکن چہرے مہرے سے کوئی پہنچا ہوا ساد، روحانی قسم کا قلاسفر نظر آرہا تھا۔

مندر سے باہر آکر اُس نے سگریٹ سلگایا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا اُس کے بعد لوکل بس سٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔

—— قریباً ایک گھنٹہ بعد وہ ابوہر کے بارڈر سکیورٹی فورس کے کمپنی ہیڈ کوارٹر کے سامنے کھڑا تھا۔

انٹری پر اُس نے اپنا نام پتہ لکھایا اور ایک کیپٹن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ "کس قسم کی ملاقات؟" دریافت کرنے پر اُس نے رک کر قریباً گھور کر دیکھا۔

اس سے پوچھ لو۔"

نے ایک لمحے کے لیے اُس کی طرف دیکھا لیکن اُس کی آنکھوں سے نکلنے والی رک کر دوبارہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ دلائی۔ وہ سہم کر رہ ا اس نے ایسی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں! اُس نے انٹرکام پر کیپٹن دُوبے کا نمبر

ویا اور جیسے ہی اُس کے مُنہ سے طوائف کا نام نکلا، دوسری طرف سے کیپٹن نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"ابھی تک وہ باہر ہی کھڑے ہیں ــــ وہ اتنی زور سے چیخا کہ کلرک کی گھگی بندھ گئی۔

"یس سر ــــ میں ابھی بھیج رہا ہوں سر!" اُس کی زبان لڑکھڑائی۔

"شٹ اپ۔ میں جیپ بھیجتا ہوں اُنہیں لینے کے لیے۔" کیپٹن نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

منوہر لال جو کلرک کے چہرے پر بدلتی کیفیتوں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس گفتگو کے خاتمے پر اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرایا۔

"میرے خیال سے تمہیں "مقصدِ ملاقات" کا علم ہو گیا ہو گا؟"

"شاکر دیجئے مہاراج! میں یہاں نیا نیا آیا ہوں۔" اُس نے لاشعوری طور پر ہاتھ جوڑ باندھ دیے۔

منوہر لال بغیر کوئی جواب دیے سامنے سے آتی جیپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جیپ اس کے نزدیک آ کر رُک گئی۔ ایک مستعد نائیک نے ڈرائیور کی سیٹ سے اُتر کر اُن کو دیکھتے ہی ایڑیاں ملا کر تعظیم دی۔ شاید وہ اس کا شناسا تھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر اُس نے منوہر لال کو پرنام کیا اور بڑے مؤدب لہجے میں اگلی سیٹ پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

منوہر لال اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ جیپ کینٹ ہیڈ کوارٹر کی مختلف روڈوں پر دوڑتی رہی بالآخر ایک میدان کے کونے میں بنے بیرک نما کمرے کے سامنے رُک گئی۔ اندر کے دروازے پر کیپٹن دُوبے بانہیں پھیلائے اُس کا منتظر تھا۔

"ارے تم کہاں سے ٹپک پڑے مہاراج!" کیپٹن دُوبے نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"بس زندہ تھا آ گیا ــــ" منوہر لال نے ہنستے ہنستے اُس کی پیٹھ پر دھول جمائی۔

"یار اتنی دیر نہ لگایا کرو۔ ورنہ کسی روز ہم مر جائیں گے شریمان جی!" کہہ کر کیپٹن نے اُس کی کمر کے گرد بازو حائل کر کے اُسے بڑی بے تکلفی سے اندر اُسی بیرک میں لے

گیا۔ اُس کا دفتر تھا۔

اُس کی میز کے ایک کونے پر بی ایس ایف کا مخصوص چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا تھا اور دیوار پر گاندھی کی تصویر لٹک رہی تھی۔ میز کے ایک کونے میں ایک حوالدار ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ اُنہیں اس طرف آتے دیکھ کر وہ اور مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔

"تم جاؤ ــــ ذرا ٹھہر کر آ جانا ــــ" دُوبے نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے ٹالتے کہا۔

"نہیں ــــ" منوہر لال کی آواز میں نامحسوس پن کچھ زیادہ ہی سمٹ آیا تھا۔ "اسی لیے مجھے نہیں بلتے نہیں آتا۔ تم سرکاری کام کو مجھ پر اہمیت نہ دیا کرو۔" اُس نے دُوبے کو مخاطب کیا۔

"بس ہو گیا بھاشن شروع ــــ" اُس نے منوہر لال کی طرف دیکھا اور حوالدار کو اشارہ کیا۔

حوالدار کے کرسی پر بیٹھتے ہی دُوبے نے پُشت بُن پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے حوالدار ادب سے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"دس منٹ بعد چائے اور بسکٹ لے آنا ــــ" اُس نے اردلی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

منوہر لال اُس کی میز پر رکھے ایک انگریزی اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اُس نے حوالدار کو کام مکمل کرنے کا موقعہ دیا تھا۔

"ہاں کہاں پہنچے تھے۔" دُوبے نے حوالدار کو مخاطب کیا۔ شاید وہ اُسے کچھ لکھوا رہا تھا

"جی ــــ" حوالدار نے مؤدب لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جا چکی ہے۔"

"اگے لکھو۔" اُس نے دوبارہ سلسلہ جوڑا۔

Scanned with CamScanner

ویس سر" حوالدار کا قلم تیزی سے چلنے لگا۔

پاک سپائی کے لیے تین متبادل ناکہ بندیاں کی گئیں۔ دو مرتبہ وہ ہاتھوں میں آکر مقامی پولیس اور بوم گارڈز کی نااہلی کی وجہ سے نکل گیا ـــــ آرمی انٹیلی جنس کی مس سلوچنا کو اُس نے ریلوے لائن کے نزدیک ڈاج دیا ہے ـــــ مس سلوچنا نے جو شباہت اُس کی بتائی ہے۔ اُس سے سپائی کی پہچان مشکل ہے۔"....

تینوں چیک پوسٹوں کی رپورٹ منفک ہے۔ میرے خیال کے مطابق وہ اس علاقے سے نکل چکا ہے۔ مزید تحقیقات جاری ہے۔"

اس نے حوالدار کو کہا کہ ٹائپ کرنے کے بعد فلاں فلاں آفس کو ایک ایک کاپی دوبجے کر دے۔ اخبار کی سطروں پر نظریں جمائے منوہر لال کو اس رپورٹ کے خاتمے پر گویا نئی زندگی نصیب ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ پاک سپائی ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اس مختصر گفتگو سے وہ کم از کم ایک نتیجے پر تو پہنچا تھا کہ اس مرتبہ پہلی انٹیلی جنس کا سابقہ کسی عام ایجنٹ سے نہیں بلکہ تربیت یافتہ اور مکمل پاک سپائی سے آنہیں پالا پڑا ہے۔

حوالدار کی روانگی کے بمشکل دو منٹ بعد ہی مودب اردلی چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آگیا۔ دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ یہ ملاقات شاید ڈیڑھ ماہ کے بعد ہوئی تھی جسے وہ لوگ "خاصی مدت" سمجھ رہے تھے۔ دونوں کے درمیان اتنی بے تکلفی تھی کہ دفتر کے سٹاف کے اکثر لوگ بھی منوہر لال کو پہچاننے لگے تھے۔

"کیا چکر ہے مہاراج کہیں کوئی اور جنگ تو نہیں کروانے لگے۔ پھر پاکستانی جاسوسوں کی خبریں آنے لگی ہیں اخباروں میں۔" منوہر لال اب اپنے مطلب کی طرف آرہا تھا۔

"ارے چھوڑو یار۔ اپنے دھندے میں تو یہ سب کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔ ادھر کا مال

"ادھر کا مال ادھر ایک بار اس مرتبہ تو مدہی نہ گئی۔"

"کیا؟" ـــــ چائے کی پیالی میں چمچہ ہلاتے ہوئے منوہر لال بالکل یوں اُس کی طرف دیکھنے لگا جیسے واقعی کوئی انہونی بات ہو گئی ہو۔

"اس مرتبہ جو پاک سپائی اُدھر سے آیا ہے۔ ہم نے اُسے پھانسنے کا مکمل منصوبہ بنا لیا تھا ـــ اپنا ایک خاص آدمی اُس کے ساتھ چپکا دیا تھا لیکن کمال کر دیا پٹھے نے۔" حوالدار نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔

منوہر لال استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

"ہمارا وہ نہ صرف خود بچ کر نکل گیا بلکہ جاتے جاتے اُس ڈبل کراس کا جو ہم نے اس کے ساتھ چپکایا تھا بھی صفایا کر گیا۔"

"تم لوگ منہ دیکھتے رہ گئے ـــ" منوہر لال نے اُس کا تمسخر اُڑایا۔

"اس ایک یہی کمی ہے تم میں۔ جو ہر وقت "شدھ بھارتی" بننے کے چکر میں پڑے رہتے ہو۔ یار! تم اُن کو کیا سمجھتے ہو۔ وہ کوئی کم نہیں کسی بات میں۔ ارے یہ تو شکر کرو کہ "من سنکیا" (آبادی) زیادہ ہے۔ اُن سے اور "خفیہ" میں لاکھوں حرام خور اٹھ کی گائی پر پل رہے ہیں جو کبھی بھول چوک سے کوئی ایک آدھ پاکستانی ہاتھ آجاتا ہے ـــــ وہ بھی ہماری کوشش سے نہیں گردش حالات سے۔"

"چھوڑو لعنت بھیجو کوئی اور بات کرو ـــــ وہ اُس کی سناؤ تمہاری شاردا کا کیا۔"

منوہر لال نے مطلوبہ مقصد حاصل ہونے پر خود ہی گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ وہ اس سے بھی زیادہ محتاط ایجنٹ تھا اور شاید یہی اُس کی کامیابی کا راز بھی تھا۔ میز کی میز سے کچھ فاصلے پر اُس کے کلرکوں کی میزیں بچھی تھیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں سے کوئی اٹھ کر اگر کسی کام سے اِس طرف آئے بھی تو اُس کے

Scanned by iPhone by Qamar Abbas

کانوں میں اس گفتگو کی بھنک بھی پڑ سکے۔

"وہ شاردا....." دوبے نے کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

اس مرتبہ منوہر لال کے چونکنے کی باری تھی۔ آج تک کیپٹن دوبے کے لہجے میں اُس نے ایسی یاسیت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"بھاگ گئی سالی ـــــ" دوبے نے جذبات سے عاری لہجہ اپنایا۔

منوہر لال حیران تھا کہ کیپٹن دوبے جیسا عیاش ہندو نوجوان بھی کبھی کسی عاشقہ سے محبت کر سکتا ہے۔ اُس نے تو شاردا کو یونہی اُس کے ساتھ پٹا رکھا تھا لیکن بات تو اب دُور نکل چکی تھی۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو منوہر لال کے لیے یہ "انٹرسٹنگ" ہوتا۔ اس نے شاردا کے معاملے میں دوبے کو مختلف بہانوں سے کریدا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بھارتی سکیورٹی فورسز انٹیلی جنس کے کیپٹن دوبے کو شاردا نامی اس عاشقہ سے محبت ہو گئی تھی جسے اُس کی امرتسر میں پوسٹنگ کے دوران منوہر لال نے ایک منصوبے کے تحت دوبے سے ٹکرایا تھا۔

دوپہر کو کھانا دونوں نے اکٹھے کھایا۔ اس دوران منوہر لال اُس سے خاصی کام کی بات جان چکا تھا۔ دوبے نے اُس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ اُس کا بچپن بڑا المیہ تھا کہ اُس کے باپ نے جو بی ایس ایف کا بہت بڑا آفیسر تھا اپنے بیٹے کو بھی اس کی مرضی کے بالکل خلاف یہاں بھرتی کروایا تھا۔ دوبے بنیادی طور پر آرٹسٹ تھا اور آرٹ ہی کی دُنیا میں بہت آگے نکل جانے کی حسرت دل میں لیے بیٹھا تھا۔

منوہر لال سے اُس کی دوستی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اُس نے دوبے کے دل میں جھانک کر اس کے اندر ایک عرصے سے مچلتی آرزوؤں کا نوحہ سن لیا تھا اور اس کے اندر بیٹھے آرٹسٹ کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اُن دونوں کی ملاقات بھی اچانک

اُن دونوں کی بات تھی جب کیلاش دوبے ابھی اکیڈمی سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا۔ اُس نے آرمی میں کمیشن لیا تھا۔ ایک روز ایک کلب میں اُس سے منوہر لال ٹکرا گیا تھا۔ اُس دن بھی منوہر لال نے ایسے ہی سادے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن اُس کی آنکھوں اور باتوں میں موجود مقناطیسیت نے تو گویا دوبے کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر وہ جب بھی چھٹی پر گھر جاتا منوہر لال اُس سے ملنے کو آتا رہا۔ اُس کی کوئی بات کوئی حرکت منوہر سے پوشیدہ نہ تھی۔

فوج سے وہ کیپٹن ہونے کے بعد اب ڈیپوٹیشن پر یہاں بی ایس ایف (بارڈر سکیورٹی فورس) میں آ گیا تھا۔ اُس کی پوسٹنگ امرتسر پنجاب ہی کے سرحدی علاقے میں ہوتی تھی اس لیے وہ دونوں ایک دوسرے سے بآسانی مل لیا کرتے تھے۔

منوہر لال نے ابھی تک براہِ راست اُس سے کوئی خاص تعلقات استوار نہیں کیے تھے۔ اُس نے ہندو نوجوانوں کی فطری کمزوری شراب اور عورت ہی کے ذریعے اس کے قریب تر ہونے کی بات نکلوائی تھی۔ شاردا بھی منوہر لال کی بچھائی ہوئی ایک ایسی ہی بساط تھی جس سے کام نکلنے پر اُس نے حسبِ وعدہ پردہ سکرین سے غائب کر دیا تھا لیکن اُسے اس عاشقہ کیپٹن دوبے شاردا کے اتنا قریب بھی آ سکتا ہے۔

یہ تک دونوں اکٹھے رہے پھر منوہر لال اُس سے حسبِ سابق بہت جلدی وعدہ کر کے الگ ہو گیا۔ دوبے اُس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اُسے بس سٹینڈ تک چھوڑنے آیا تھا۔

بس سے اترتے ہی اُس نے ایک میڈیکل سٹور کا رُخ کیا اور وہاں سے کچھ گولیاں خرید کر جیب میں ڈال لیں۔ پھر شراب کے ٹھیکے سے اُس نے کھٹیا سی دیسی شراب خریدی اور بازار کے پرلی طرف واقع قدرے اُجاڑ جگہ کا رُخ کیا۔ ایک گوشہ

Scanned by Nasir Abbas

بابت میں بیٹھ کر اس نے شراب کی بوتل کا ڈھکن کھولا۔ اچانک اٹھنے والی بدبو کے بھبھکے نے اُس کو چکرا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔

اپنی ناک سکیڑتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے گولیاں نکال کر بوتل میں انڈیل دیں بوتل میں کچھ بلبلے پیدا ہوئے اور اس میں موجود شراب کی رنگت بھی بدل گئی۔ بوتل پر لیبل بھی اُس نے پھاڑ کر الگ کر دیا اور اس کا منہ بند کر کے اُسے دوبارہ نزدیکی کھیت کی نالی میں موجود پانی سے اچھی طرح دھو لیا تاکہ لیبل کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

اپنے تھیلے میں بوتل ڈالنے سے پہلے اُس نے بوتل کو اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھ لیا تھا کہیں بوتل کے پیندے میں تو کوئی گولی نہیں بیٹھی ہوئی لیکن تمام گولیاں شراب میں اچھی طرح حل ہو چکی تھیں۔

آشرم کے دروازے ہی پر اُس کا پجاری کاکا جانے کتنی شدت سے اُس کا منتظر تھا۔ منوہر لال کو آتے دیکھ کر وہ بڑی بے چینی سے آگے بڑھا اور بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔ اُس کی گھاگ نظروں نے تھیلے کے اندر کا بھی شاید ایکسرے کر لیا تھا۔ منوہر لال نے بھی کچھ کہے سنے بغیر تھیلا اُس کے ہاتھ میں تھما دیا خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ پجاری پالتو کتے کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا آ رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

"بھتیجے پرماتما تجھے سکھی رکھے۔ کتنا خیال رکھتے ہو اپنے چاچا کا۔" پجاری نے پاؤں چومتے ہوئے کہا۔

"بس کاکا۔ دیکھو تو تمہاری خاطر کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ ادھر ادھر میں میرا ایک دوست ہے اس دھندے میں! اُسی سے لایا ہوں خاص طور سے تمہارے لیے۔ یاد کرو گے کاکا اپنے بھتیجے کو۔" اُس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

منوہر لال نے بے شرموں کی طرح دانت نکال دیئے۔ اُس نے بوتل کو اپنی چارپائی کے ایک ٹرنک میں رکھ کر اُسے دوبارہ تالا لگا دیا تھا اور اس کے گرد اگرد لپٹی ہوئی زنجیر کو چارپائی سے باندھ کر باہر آ گیا۔

چند منٹ بعد ہی آشرم کا ایک خدمت گار اُس کے سرہانے پُرتکلف چائے کا کپ لیے کھڑا تھا۔ منوہر لال اُٹھ کر چارپائی پر ہی ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ رہا۔ خدمت گار کی بابت ہاتھ اُس کی ٹانگیں دبانے کے لیے آگے بڑھائے لیکن منوہر لال نے اشارہ کر وہاں سے بھگا دیا۔

رات کو وہ بے سُدھ سوتا رہا۔ آج تین چار روز کے بعد وہ اطمینان کی نیند سویا تھا۔ صبح کو وہ اُٹھا تو پجاری کاکا اُس کے دیدار کے لیے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ میلے سے کپڑوں میں ملبوس ایک درمیانی عمر کی بھگتنی کاکا کے ہاتھ چائے کی پیالی تھما رہی تھی۔ منوہر لال اُس کے نزدیک سے گزر کر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ کاکا اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"ایک ہی عیب ہے تم میں بھتیجے جو ہر وقت ویشنو بنے رہتے ہو۔ اگر شراب کبابی والی ویشنا بن جاؤ۔" پجاری نے اس کے پیچھے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

واپس آ کر منوہر لال نے اپنا کھانا خود تیار کیا اور وہیں کھا کر آشرم سے باہر۔ رات کافی دیر تک وہ ایک تنور نما ہوٹل میں بیٹھا چائے اور سگریٹ سے دل بہلاتا رہا۔ پھر آشرم میں واپس آ گیا۔ پجاری کاکا کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اس نے دوسری طرف پھیر لیا تھا اور اپنی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ رہا۔

صبح سویرے اُس نے پجاری کاکا سے بمشکل جلنے کی اجازت لی اور بھجن کتھا ختم ہونے سے پہلے جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

○

Scanned with CamScanner

بھنڈوہ کا وہ غالباً سب سے مہنگا ہوٹل تھا جہاں اُس نے قیام کیا مالک مروت
دیئرس نے اُس کے کمرے تک اُس کی راہنمائی کی تھی۔ خان کو یہ بات پہلے پہل نوٹ
عجیب لگی لیکن اُسے یاد آگیا انسٹرکٹر نے بتایا تھا: "وہاں کسی بھی بے حیائی کے خلاف
پر قطعاً ابنارمل ہونے کی ضرورت نہیں، نہی خود کو اُس ماحول سے الگ رکھنے کی کوشش
کرنا۔"

اُس نے اپنے کمرے ہی میں ایک کارڈ پُر کر کے ویٹرس کی طرف بڑھا دیا
جس نے جُھک کر بظاہر مؤدب ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تمام جسمانی خطوط
کر کے اُس سے شکریہ وصول کر لیا تھا۔

دروازہ پر رُک کر اُس نے دوبارہ اُس انداز میں جُھک کر اُسے تعظیم دی۔
دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ دروازے کے باہر اُس نے کارڈ پر لکھے لفظ پڑھے
مسکراتے ہوئے نظر ٹھہرائی پھر آگے نکل گئی۔

خود کو ڈیشنو، سمجھ کر خان نے بہرحال ہوٹل والوں کو اس بات کا پابند کیا
کہ وہ اُسے بغیر گوشت کے کھانوں کا مینو ہی بھیجا کریں۔ ایسے بڑے ہوٹلوں
ٹائپ گاہکوں کی آمد ہوٹل کے عملے کے لیے نیک شگون نہیں ہوتا تھا۔ وہ
ان گاہکوں سے مایوس ہی رہا کرتے تھے، کیونکہ وہ لوگ "ریزرو" ہی رہتے تھے
"ریزرو" رہنے والے گاہکوں سے ہوٹل کے عملے کو زیادہ "معاشی تعاون" کی
بندھتی تھی۔

شام کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے چہل قدمی کو بازار میں نکل گیا۔
ذہن میں جلد ہی ہوٹل کے گرد و اگرد موجود سڑکوں اور اِدھر کو آنے والے راستوں
لیے تھے۔ شام کے بعد جب وہ ہوٹل واپس لوٹا تو یہ شہر اس کے لیے اجنبی
تھا۔ اُسے یہاں کے بیشتر گھی محلوں کے نام ازبر تھے۔

اپنی آمد پر اُس نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال کا رُخ کیا۔ اُس نے کونے والی ایک
خالی تھی۔ ہال میں ہلکا ہلکا لیکن بہت بے ہودہ میوزک بج رہا تھا اور اسی مناسبت
گاہک موجود تھے۔ چونکہ یہ اس شہر کا غالباً سب سے مہنگا ہوٹل تھا اس لیے
شہر کے "شرفا" اُمڈ آئے تھے۔

آج ہال میں ہفتہ کی شام تھی جس کے لیے یہ ہوٹل خاصی شہرت رکھتا تھا۔ خالی
سے ریزرو ہو چکی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک مؤدب بیرا اُس کے
پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ خان نے اپنے لیے سبزیوں کے سوپ کا آرڈر دیا اور جیسے ہی
اُس پر اس نے نظریں اٹھائیں ایک مرتبہ تو اُس کا سارا جسم ہی جھنجھنا اُٹھا
ہال میں شاید ہی کسی خاتون نے اپنا مکمل جسم لباس سے ڈھانپ رکھا تھا،
اُس کے سر پر براجمان تھی۔ اُس نے تو جیسے کپڑے کوئی مکروہ شے سمجھ
لے تھے۔ سکرٹ اور معمولی سی تنگ چولی کے ساتھ ہاتھ میں پرس مچلتی وہ اُس
خاصی۔

اُسے تنے ہوئے شاید نہیں دیکھا تھا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں" ــــ اُس نے خان کی آنکھوں میں بڑی بیباکی
اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس کے سامنے بیٹھ گئی ــــ "آپ نے
ــــ بیٹھتے ہی اُس نے دوسرا فقرہ دانا۔

"آپ کے بیٹھنے کا بھلا کون کافر برا منا سکتا ہے" وہ سنبھل گیا۔
مالک وہ ابھی تک اُس کے لاشعور میں گونج رہا تھا ــــ کبھی خود کو
نہ کرنا۔ اگر کہیں زیادہ نیک نظر آنے کے چکر میں پڑ گئے تو
ایسی گی کا تصور بھی نہیں پایا جاتا، جو ہمارے نوجوانوں کے لیے ضروری

Scanned with CamScanner PDF by Qamar Abbas

"بہت مصیبت ہو جاتی ہے کبھی کبھی۔ ڈھنگ کا یہی ایک ہوٹل ہے اس شہر کی اور یہاں سکون سے بیٹھنے کو جگہ میسر نہیں"۔۔۔۔ اس کی زبان پھسل پڑی۔

"جی ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا"۔۔۔۔ وہ اور کیا کہتا۔

"آپ شاید پہلی مرتبہ آئے ہیں یہاں"۔۔۔۔ خان اس کے سوال پر چونکا پھر سنبھلا

"کیا شبھ نام ہے آپ کا"۔۔۔۔ وہ اب مکمل فارم میں آ چکا تھا اور لڑکی کو سنبھلنے کا موقعہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

"اوہ شما کیجیے۔۔۔۔ یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے تھا۔ سُلکشنا پائل" لڑکی مسکرائی

"مجھے ارون کمار کہتے ہیں"۔۔۔۔ خان نے اس کی مکمل حوصلہ افزائی کی۔۔۔۔ "بلڈنگ کے سلسلے میں آیا ہوں۔۔۔۔ اور اجنبی ہوں"۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر"۔۔۔۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ بے تکلفی کے انداز میں آگے بڑھا دیا۔

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے خان نے بھی بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

سُلکشنا پائل بمبئی سے یہاں آئی تھی لیکن وہ یہاں اکثر آتی رہتی تھی۔ اس کا ددھیال کا قریباً سارا خاندان یہیں آباد تھا۔ باپ کی تمام رشتہ داریاں بھی اسی شہر میں تھیں۔ بزنس کے سلسلے میں وہ مہاراشٹر میں پچھلے دس سال سے سیٹ ہو چکا تھا اور اپنے ساتھ کر بھی وہیں لے گیا تھا۔

سُلکشنا نے ہائی سکول تک بھنڈارہ ہی میں تعلیم حاصل کی تھی اور عمر کا زیادہ حصہ نانی کے پاس گزارا تھا۔ اب بھی جب کبھی اسے موقعہ ملتا وہ جاؤ لگا کر اس کے پاس جا پہنچتی تھی۔ امیر لوگ تھے، دولت کی ریل پیل تھی ہوائی جہاز سے آنا جانا اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔

بیرے کی آمد تک سُلکشنا نے اپنے تمام جسمانی نشیب و فراز سے خان کو روشناس کرا دیا تھا اور دونوں آپس میں خاصے فری بھی ہو چکے تھے۔ یوں بھی اس عمر

کے ملتے اور پھر حسن اتفاق سے سوسائٹی کی ایک ہی کلاس سے تعلق رکھنے والوں کا آپس میں گھل مل جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

خان نے اسے بتایا کہ وہ ایک کاروباری آدمی ہے اور ابھی تک "زیرِ تربیت" ہی تھا۔ اس نے سُلکشنا کے لیے کارن سوپ بھی منگوا لیا تھا اور سوپ کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو چاٹ جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے معروفِ گفتگو تھے۔

"کاروباری لوگوں سے سخت نفرت ہے لیکن آپ سے بنانے کیوں میں نفرت ہی، شاید آپ باہر ہی سے کاروباری ہوں۔ اندر سے انسان....." اس نے آنکھوں میں مسکراتے ہوئے جھانکا۔

"سُلکشنا جی۔۔۔۔ سچ کہا آپ نے، واقعی میں باہر سے کاروباری ہوں۔۔۔۔ اندر سے بیک لنت بدل گئی۔ یوں جیسے وہ دکھی ہو گیا ہو۔ پھر اس نے سُلکشنا کو ایک دلچسپ کہانی سنا دی کہ وہ تو اصل میں آرٹسٹ بننا چاہتا تھا لیکن ظالم باپ نے اس سے اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا حق اس کے پتاجی کے مرنے کے بعد چھین لیا تھا۔

اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سُلکشنا بھی اپنے باپ کے طرزِ عمل سے نالاں ہے۔۔۔۔ اسے کہ وہ لاکھ ماڈرن ہونے کے باوجود اب بھی موقع ملتے ہی بھاگ کر نانی کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس کی اسی کمزوری پر اس نے ضرب لگائی تھی۔

بھلا ہی نظر میں سُلکشنا اسے عام سی ہندو لڑکی دکھائی پڑی تھی اور یہی وجہ تھی کہ محض آدھ گھنٹہ ہی میں سُلکشنا اس سے گھل مل گئی۔

بیرا آرڈر لے کر اٹھ کر کمرے میں چلے آئے تھے۔ خان نے بیرے کو کافی لانے کی ہدایت کی تھی۔ اور دونوں اب کافی کی پیالیاں سامنے رکھے ایک دوسرے کے درد پر جان دے رہے تھے۔

سُکھشنا نے بڑی بے باکی سے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ وہ بھی عام ہندو لڑکیوں
کی طرح عورت کی عصمت کو بے معنی چیز سمجھتی ہے اور روحانی سے زیادہ، جسمانی تعلق پر یقین
رکھتی ہے۔ لیکن اُس نے یہ بھی سچ کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ محض اس لیے کر رہی تھی کہ،
عمل بہت پہلے سے جاری ہے اور اُسے بھی بہرحال اس میں سے گزرنا ہے۔ اُس کے
باپ اس کے سامنے شراب پیتے تھے۔ انہوں نے کالج لائف کے آغاز ہی سے اپنی بیٹی کو
بھی شراب کے ذائقے سے آشنا کر دیا تھا اور اب وہ وقت کی بہت سی لہروں میں سے
ایک لہر بن کر حالات کے دھارے پر بہہ رہی تھی۔

باتیں کرتے ہوئے اُس نے اپنے جسمانی خطوط کی مکمل نمائش کا مشن جاری رکھا تھا
یہ الگ بات کہ خان کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ فی الوقت اُسے تمام کارڈز اپنے
میں رکھنے تھے۔ اس لیے بادلِ نخواستہ وہ اُس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی ظاہر کرنے
پر مجبور تھا لیکن جب بات حد سے بڑھ گئی تو اُس نے سُکھشنا کو نیچے چلنے کی دعوت دی۔
سُکھشنا کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ بڑی بے تکلفی سے اُس کا ہاتھ تھامے
اُسے نیچے ڈائننگ ہال میں لے آیا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی بے اختیار اُس کے
منہ سے آواز بلند ہوئی: "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا"۔ وہاں کیبرے ناچ ہو رہا تھا اور
رنگ کی بدلیوں کے جھروکے اُٹھ رہے تھے۔ بمشکل خان نے اپنی مسلی کو کنٹرول کیا۔
بالآخر اذیت ناک ناچ ختم ہوا اور اُس نے خدا کا شکر گزارا۔

○

جب سُکھشنا اور خان ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے عین اُن لمحات میں
ایک خوبصورت لڑکی کا ہاتھ تھامے ڈائننگ ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ آج خان
اُس نے نہایت قیمتی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔

پیلا گلاب

ہال کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر کامریڈ منوہر لال نے طائرانہ نظروں سے اندر موجود
لوگوں کا جائزہ لیا۔ اُس کی نظریں مختلف چہروں سے پھسلتیں خان پر جم کر رہ گئیں جس
کے کوٹ پر گلاب کا پھول تو لگا رکھا تھا لیکن یہ خان ہی جانتا تھا کہ اُس نے کتنی مشکلوں
سے یہ پیلے رنگ کا گلاب حاصل کیا تھا۔

جس بُری طرح سُکھشنا اُس سے چپٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کے بعد سوائے اُس سے باتیں
کرنے کے وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا لیکن اپنی پہچان کے لیے یہ پیلا
گلاب بہرحال اُس نے ہوٹل کی بالکنی میں لٹکتے ایک گملے سے اُتار ہی لیا تھا۔

سُکھشنا اُسے حیرت سے بھول چوری کرتے دیکھتی رہی۔

"یہ گلاب میری زبردست کمزوری ہے ـــــ جہاں کہیں بھی نظر آ جائے۔ یہی حال ہوتا
ہے۔" اس نے اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ کسی نے سوائے سُکھشنا کے اُسے یہ
حرکت کرتے نہیں دیکھا۔

"لوگ تو سُرخ گلاب پر مرتے ہیں مگر آپ.....؟"

"میں ایسا ہی ہوں۔ ایسا اوقات میں کئی ضروری اور اچھی باتیں اپنی انفرادیت
کے چکر میں چھوڑ دیتا ہوں ـــ" اُس نے سُکھشنا کی بات بڑے فلسفیانہ

Scanned with CamScanner

انداز میں کاٹ دی۔

پھول کوٹ کے کالر میں سجا کر وہ نیچے ہال میں آیا — تو ڈانسنگ ہال میں بیٹھے ہوئے تین عورتوں اور مردوں نے اُس کے کالر میں لگے اِس پیلے رنگ کے پھول کو عجیب سی نظروں سے دیکھا بھی لیکن وہ اپنے ہر ہال میں موجود لوگوں کی موجودگی سے بے نیاز شکنجہ ہی میں مگن تھا۔

○

کامریڈ منوہر لال کے ساتھ چپٹی ہوئی لڑکی گو کہ شکل سے خاصی نہ لگتی تھی لیکن اس کے انداز بالکل خاصی عورتوں کے سے تھے — اُس نے اچانک ہی کامریڈ کا ہاتھ کھینچ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور وہ اُس کے ساتھ ہی کھنچتا ہوا خاص کے بالکل سامنے والی میز پر آکر جم گیا تھا۔

موڈب بیرے نے مینو لاکر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ منوہر لال نے اُسے جو کارڈ دکھایا وہ کوئی شراب ہی لکھا سکتا تھا۔ لڑکی اُس سے پہلے ہی متاثر تھی، اب تو بالکل مرعوب کر رہ گئی تھی۔

"میں تو صرف سبزیوں کا سوپ پیوں گا لیکن تمہیں ڈاکٹر نے میرے خیال سے اس کسی شغل سے منع نہیں کیا" اُس نے اپنی ساتھی کو متوجہ کیا۔

اس کی ساتھی لڑکی کو اُس کا ساتھ دیتے ہوئے اب خاصی اُلجھن ہونے لگی تھی وہ بھنڈہ کے اونچے حلقوں خصوصاً شرفا اور اعلیٰ افسران میں اُٹھنے بیٹھنے والی شراب تھی خود اُس کا خاوند ایک بڑا سرکاری افسر تھا، الگ بات کہ اکثر اس کی ڈیوٹی شہر سے باہر ہی رہا کرتی تھی اور وہ بیچاری اپنی "تنہائی" کا روگ ختم کرنے اعلیٰ سوسائٹی اٹھنے بیٹھنے لگی تھی۔

منوہر لال بھی ایک دن یوں ہی اُسے ٹکرا گیا تھا۔ دونوں کا تعارف آج سے

اٹھ، پہلے لدھیانہ میں ہوا تھا۔ اُس نے پہلی ملاقات میں منوہر لال کو بھی شرفا کے اس حلقہ میں ملتے ہی کا نمائندہ جانا تھا جس سے اُس کا واسطہ رہتا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ اُس پر ہزار روپے خرچ کرنے کے بعد اب منوہر لال اُن کا عوضانہ بھی وصول کرے گا لیکن اُسے بڑی خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اُس نے دیکھا کہ منوہر لال نے نہ تو شراب کا آرڈر ہی میٹ کے نزدیک پھٹکا۔ وہ رات کافی دیر تک ہوٹل کے لان کے ایک تاریک گوشے میں بیٹھے رہے، کئی مرتبہ دورانِ گفتگو اُس کا جی چاہا کہ اب اُسے فوراً اپنے کمرے میں جانے کی دعوت دے کیونکہ ٹھنڈی ہوا نے شراب کا اثر تو زائل کر دیا تھا لیکن منوہر نے رات زیادہ گزر جانے کا احساس دلا کر اُس سے اجازت طلب کر لی۔

اس کے بعد بھی وہ لوگ آٹھ دس مرتبہ آپس میں ملے تھے لیکن کیا مجال جو کبھی اُس نے منوہر لال کی آنکھوں میں خمار دیکھے ہوں — اوّل تو اُسے اس گہری آنکھوں میں جھانکنے کا موقع نصیب نہ ہوتا اور اگر کبھی منوہر لال اُس کی آنکھوں میں جھانکتا تو وہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جاتی جہاں ایک پُراسرار تقدس کے سوائے اور کچھ دکھائی نہ پڑتا۔

آج بھی وہ اچانک ہی آگیا تھا اور وہ دونوں ڈنر کھانے کے لیے اس ہوٹل میں آئے تھے۔ بیرے نے بڑے اہتمام سے اُن کے سامنے ڈنر سجا دیا تھا۔

منوہر لال بظاہر اپنی ساتھی کی گفتگو میں مکمل دلچسپی لے رہا تھا لیکن اصل میں وہ خان کی طرف متوجہ تھا۔ اُسے بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ خان نے لڑکی کو بادلِ نخواستہ ہی اُس کی طرف پھٹایا ہوا ہے۔

اور اُس کی ساتھی لڑکی دونوں اب کھانے سے فراغت حاصل کر چکے تھے! بیرے نے بل ادا کیا تھا اور دونوں اُٹھ کر اب ہوٹل کے اُس راستے کی طرف جا رہے

Scanned with CamScanner by Qamar Abbas

تھے جو انہیں رہائشی کمروں کی طرف لے جاتا۔

انہیں سیڑھیوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر اچانک ہی منوہر لال پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اُس کی ساتھی لڑکی حیرانگی اور تشویش کے ملے جلے جذبات سے منوہر لال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"شاکرنا (معاف کرنا)" اُس نے اپنی ساتھی لڑکی سے معذرت کی اور باتھ روم کی طرف آگیا۔

باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اُس کی کھانسی ختم ہو گئی ایک لمحے کا توقف کیے بغیر وہ دوسرے راستے سے ہوٹل کے رہائشی کمروں کی طرف مُڑ گیا۔ اُس نے دانستہ وہ راستہ اختیار کیا تھا جس پر اُس کا ٹکراؤ خان سے ہو سکے۔ خان نے بھی اُس کی طرح لفٹ استعمال کرنے کی بجائے سیڑھیوں کا راستہ اپنایا تھا۔ وہ بھاگم بھاگ ہوٹل کی بالکونی میں پہنچا تو خان بالکونی سے آگے اُس واحد راستے کی طرف جاتا دکھائی دیا جس کے بعد رہائشی کمروں کی قطار شروع ہو جاتی تھی۔

اپنی دانست میں منوہر لال نے بہت احتیاط اختیار کی تھی۔ لیکن خان کے حساس کانوں بیدار حواس نے بالکونی سے گھومتے ہی تعاقب کا احساس کر لیا تھا۔ مُسکراتا کو خاموش گئی تھی اور وہ اونچی اونچی آواز میں قہقہے لگاتی اُس کے ساتھ ہی اوپر تک آئی تھی۔

منوہر لال دبے پاؤں اُس کے پیچھے آرہا تھا۔ خان کے لیے اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ اپنے تعاقب میں آنے والے کو یہ احساس دلائے بغیر کہ اُسے تعاقب کا علم ہے اپنے کمرے میں چلا جائے اور اُس نے وہی کیا۔ مُسکراتا کی کمر میں ہاتھ ڈالے بھارتی معاشرے کی مروجہ اخلاقیات کے عین مطابق وہ کمرے میں گھس گیا۔

منوہر لال جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اُس سے دو قدم آگے جا کر رُک گیا۔ اُس نے کمرے کا نمبر نوٹ کیا۔ دل ہی دل میں اُسے دو تین مرتبہ دہرایا اور بڑی تیزی

سے آگیا۔ جہاں اُس کی ساتھی خاتون بیقراری سے اُس کی منتظر تھی۔

"خیریت تو تھی ——" اُس نے منوہر لال کی طرف اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بیقراری سے بڑھ کر کہا۔

"بس۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" منوہر لال نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا؟"

"آج چھ ماہ بعد ایک دوست کے بضد ہونے پر ایک پیگ لے لیا تھا اب پھر ناک بھگتوں گا! اُف —— بھگوان نے مجھے بیماری ہی لگائی تھی تو کوئی اور بیماری۔" اُس نے اپنے لیے میدان ہموار کرنے کا یہ موقع بھی ڈھونڈ لیا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ" —— عورت پریشان نظر آرہی تھی۔

"میرے خیال سے اب چلنا چاہیے۔ میری طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔"

"ہاں" عورت نے معذرت کی۔

"اوہ ضرور۔ ضرور" —— عورت نے بیرے کو متوجہ کرنے کے لیے چمچہ بجایا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ہوٹل سے باہر آرہے تھے —— منوہر لال کے نہ نہ کرنے کے باوجود اُس کی ساتھی خاتون نے بل خود ادا کیا تھا —— ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں کھڑی ایک کار کی طرف دونوں بڑھ رہے تھے۔

ڈرائیونگ سیٹ عورت نے ہی سنبھالی تھی اور منوہر لال اُس کے ساتھ بہت نڈھال سا ہو کر بیٹھا تھا۔ اگلی بیماروں کی طرح اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لی تھیں اور سر کو بے دم سا ہو کر گر پڑا تھا۔

"میری مانو تو آج میرے ہی گھر پر رہ لو" —— عورت نے اس کی تشویشناک حالت کے پیش نظر مدد دی کیا۔

"نہیں ڈیئر —— سوچتا ہوں اس مختصر زندگی میں کوئی کام ادھورا نہ چھوڑ جاؤں۔"

Scanned with CamScanner by Qamar Abbas

"ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ تم نہیں جانتے منوہر لال میں تم سے کتنی محبت کرنے لگی ہوں" اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"سیما دیکھو نارمل رہا کرو ـــــ میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں۔ ہم اچھے دوست بن میرے لیے یہی بہت ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کی زندگی کا پل بھر بھی بھروسہ نہ ہو۔ اُس کے متعلق ایسی سوچ رکھنا درست نہیں۔ میری بیماری ابھی تک ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ شراب اور میٹ چھوڑ دوں۔ میں نے چھوڑ دیا ہے۔ بس کبھی بہ قسمتی سے بے احتیاطی ہو جائے تو جان پر بن آتی ہے۔"

"میرے ساتھ چلو نہ دبلی! میرا کزن سپیشلسٹ ہے ـــــ اُسے کیوں نہیں دکھاتے"

"اچھا دیوی جی! ابھی تو مجھے یہاں ڈرامہ کھیلنا ہے ـــــ پھر کبھی یہ بھی سوچیں گے"

منوہر نے اُسے کار روکنے کو کہا۔

آج شاید پہلی مرتبہ اُس نے منوہر کی بات نہیں مانی تھی اور اس کے منع کرنے کے باوجود وہ اُسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ اوّل تو اُس کا خاوند گھر پر تھا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی تو اُس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔

بیڈ روم میں پہنچتے ہی منوہر لال نڈھال سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ سیما نے بڑے ادب اور محبت سے اُس کے جوتے اور کوٹ اُتار دیا اور اس پر گرم کمبل ڈال کر باہر نکل آئی اُس کی زندگی میں منوہر لال پہلا ایسا مرد آیا تھا جس نے اُسے مردانگی کے احترام پر مجبور کر دیا تھا ورنہ آج تک تو وہ خود کھلونا بنی رہی تھی یا پھر اُس نے مردوں کو کھلونا بنائے رکھا تھا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز سُن کر بھی وہ اُسی پوزیشن میں دم سادھے لیٹا رہا۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ اٹھا دروازہ اُس نے اندر سے لاک کر دیا۔ اس کا ہاتھ ہی سرہانے تپائی پر دھرے ٹیلیفون کی طرف بڑھا لیکن کریڈل پر ہاتھ رکھ کر چند لمحے

بعد اُس نے فون وہیں رکھ دیا۔

اُس کی آنکھیں بڑی بے چینی سے کمرے میں سجی اشیاء کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرف بڑھا۔ ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ درجنوں کیسٹ پڑے تھے۔ اس نے قدرے ایک پرانا کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں لگا دیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اب اُس کا رُخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔

ڈرائنگ روم میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ سیما غالباً سونے کی تیاری کر رہی تھی اسے آتے دیکھ کر اُس نے لائٹ جلا دی۔

"خیریت تو ہے ـــــ" وہ بے چین ہو گئی۔

"بالکل ٹھیک ہوں سیما! دیکھو تم یہ زیادتی نہ کرو۔ میں یہاں سو جاتا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں سو جاؤ" اُس نے اظہار ہمدردی کیا۔

"اوہ منوہر تمہیں اٹھنا نہیں چاہیئے تھا۔ چلو چلو! میں تمہیں چھوڑ آؤں" وہ منوہر کو منع کرنے کے باوجود اُسے بیڈ روم تک چھوڑ گئی۔ بیڈ روم کا دروازہ بھی اُس نے اندر بند کر دیا تھا۔

آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد منوہر ایک مرتبہ پھر کمرے سے باہر نکلا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ سیما سو گئی ہے۔ بیڈ روم میں واپس آ گیا۔ اُس نے معمولی روشنی والا بلب بھی بجھا دیا تھا اور کھڑکی کے سامنے سے پردہ بھی سرکا دیا تھا تاکہ چاند کی روشنی اندر آ سکے۔ اس روشنی میں اُس نے کیسٹ پر ایک پیغام ریکارڈ کیا اور اُسے اپنے مخصوص انداز سے لاک کر کے سو گیا۔

○

Scanned by: Pk by Qamar Abbas

وہ رات خان کے لیے الف لیلیٰ کی کوئی خنساتی رات بن کر رہ گئی تھی۔
اُسے سُلگھشا اور خود سے اعصاب شکن جنگ لڑنا پڑی تھی۔ خاصی رات گئے سبب سُلگھشا کا نشہ قدرے اُترا تو اُسے احساس ہُوا کہ اُسے واپس بھی جانا ہے اور خان نے اُس کے جاتے ہی سجدۂ شکر ادا کیا۔ رات قریباً دو بجے وہ سویا اور صبح سات بجے تک وہ سوتا رہا۔

اُس کی نیند فون کی گھنٹی کی آواز سے کھلی تھی! پہلے تو وہ ایک دو لمحے کے لیے بھونچکا ہی رہ گیا کہ اُسے کس نے فون کیا ہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اُس نے لیٹے لیٹے فون اٹھا کر "ہیلو" کہہ ہی دیا۔

"روم نمبر ۱۴۲ سے ــــ یور کال پلیز" آپریٹر لائن پر تھا۔

"او۔ کے ــــ" اُس نے آپریٹر کو اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر بعد ایک غیر مانوس سی آواز اُسے ٹیلیفون پر سنائی دے رہی تھی

"آپ سنام سے تو نہیں آئے جی؟"

لفظ "سنام" پر وہ چونکا۔ اُس کا دل بھی ایک مرتبہ زور سے دھڑکا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" ــــ اُس نے اب "کوڈ ورڈز" کا تبادلہ شروع کر دیا تھا۔

"جی میں تو الوہر سے آیا ہوں"

"کیا ہے آپ کے پاس کپڑا، سگریٹ، خوشبویات کس کا بزنس کرتے ہیں؟"

"میں تو کاشیانے خورد و نوش کا بیوپاری ہوں مہاراج"

"اوہ تو آپ ہیں درشن لال جی" اُس نے آخری پتہ بھی پھینک دیا۔

"ہاں مسٹر اردن" ــــ دوسری طرف سے جواب پر اُسے مکمل اطمینان ہو گیا۔

"میرے لائق کیا سیوا ہے؟"

"آپ کو تھوڑی دیر بعد ملتا ہوں"

"او۔ کے" سلسلہ منقطع ہو گیا۔

○

خان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے آدمیوں میں پہنچ تو گیا۔ یہ بات اس کے لیے اطمینان بخش تھی۔

اس ہوٹل میں آنے سے پہلے اُس نے ایک خاص نمبر پر صرف اپنے ہوٹل کا نام بتا کر فون بند کر دیا تھا۔ اور رات ڈنر پر ہدایات کے مطابق اپنے کوٹ کے کالر میں پیلے پھول لگا لیا تھا۔ اب اُسے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ رات اُس کا تعاقب کسی خفیہ ایجنسی نے نہیں بلکہ اُس کے اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔

وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا! اُس نے ہمیشہ اپنے کمرے ہی میں منگوایا اور ناشتے بدلتے ہوئے ناشتے کا منتظر تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ خان نے دروازہ کھولا کر ناشتہ آگیا ہے لیکن دروازے پر ایک خالی ہاتھ سٹیورڈ اُس کا تھا۔

"ایکسکیوزمی! آپ کے لیے ــــ" کہہ کر اُس نے ایک بند لفافہ خان کی طرف بڑھایا۔

خان نے لفافہ لیا ــــ اُس نے سٹیورڈ کو ٹپ کیا اور اندر چلا آیا۔

لفافہ موٹے کاغذ کا تھا اور اسے احتیاط سے سٹیپلر سے بند کیا گیا تھا۔ خان نے لفافہ کھولنے سے پہلے یہ اطمینان حاصل کر لیا تھا کہ اُسے راستے میں چیک تو نہیں کیا گیا؟ پھر اس نے میز پر رکھ دیا اور ناشتے کا منتظر ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد ناشتہ آگیا۔

بیرا کے جانے پر اس نے دروازہ لاک کیا اور لفافہ چاک کر دیا۔ لفافے سے ایک ہاتھ سے لکھی ہوئی خط برآمد ہوئی۔ خط میں صرف اتنا لکھا تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کے لاکر نمبر ۲۰

Scanned and Edited by Qamar Abbas

سے ایک کیسٹ نکال لے اور رات ہونے تک اپنا پیغام وہاں رکھ دے۔

خط پڑھنے کے بعد اس نے جلا کر دا ش بیسن میں ضائع کر دیا اور ناشتہ مکمل کرنے پر اس نے کمرے سے ہی سنگھشا کا نمبر ملایا ـــــ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

خان نے اسے تائید ایزدی جانا۔ اس طرح وہ اس کی مزید محبت سے قدرے محفوظ بھی رہ سکتا تھا! اپنا نام اس نے نوٹ کروایا اور کمرہ لاک کر کے باہر نکل گیا اس کا رُخ بٹھنڈہ کی اس آبادی کی طرف تھا جہاں اکثر ملازمین رہائش پذیر تھے اور جس کا ایڈریس اسے بوڑھے نے دیا تھا۔

⊙

اس نے جان بوجھ کر پہلے قریباً ڈھائی تین گھنٹے تک بٹھنڈہ کے مختلف حصوں کا جائزہ لیا اور جب وہ دوپہر کے قریب شادی والے گھر پہنچا تو بٹھنڈہ اس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ اس نے باہر بیٹھے نوجوانوں میں سے ایک کے ذریعے اندر بھیجا بمشکل دو ہی منٹ کے بعد اس کے سامنے رما کھڑی تھی۔ اس کے سینے کا زیر خان کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اس کا نام سن کر بھاگتی ہوئی آئی ہے

اچانک خان کو سامنے دیکھ کر وہ گنگ ہی تو رہ گئی تھی اور یہی حال خان کا تھا! اس نے گو کہ رما کو بس کے سفر میں بھی جی بھر کے دیکھا تھا لیکن آج تو اس کا سراپا واقعی قیامت ڈھا رہا تھا۔ رما اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ اس کو گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ شاید زندگی کے کمزور ترین لمحے تھے جب وقت کی گرد اس پر بخت ہو گئی تھی۔ خان نے اس کیفیت سے فرار حاصل کرنا چاہا تھا لیکن اس کی تو ایک اسیر بے دام سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔

اس لمحے خان کو احساس ہوا جیسے وہ بہت لمبی مسافت طے کر کے صرف اسی یہاں پہنچا تھا کہ رما اسے مل جائے۔ اس نے موت کی لمبی سرحد جو پچھلے تین روز میں

موت اس لیے کہ زندگی رما بن کے اس سے گلے آن ملے۔

آج شاید یہاں رسم مہندی ہی ادا کی جا رہی تھی۔ اسی مناسبت سے اس نے مرہٹی لک کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ ہاتھوں اور بالوں میں کلیوں کے گجرے سجائے جب وہ اس کے سامنے آئی تو خان کو یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے تپتے جھلستے ریگذاروں میں ٹھنڈی ہوائیں اچانک شام اتر آئی ہو۔ ایک ٹھنڈک ایک بے نام سی طمانیت اس کے اندر اترتی چلی گئی۔

اس کی حالت ان مسافروں جیسی تھی جو صدیوں کا سفر پانے کے بعد منزل کو پا لیتے ہیں۔

من کی دیوی نے دونوں ہاتھ پاربتی کی طرح اپنے سینے پر باندھ کر اسے نمسکار کیا اس کے ہاتھ بھی کسی میکانکی عمل کے تابع اوپر اٹھے اور بندھتے چلے گئے۔ دونوں طرف گویائی سلب ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

آہستہ آہستہ ـــــ بالآخر رما نے ہی توصلہ کیا۔

اچانک ـــــ کمرہ بھوت سا اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔

اس کو بہت سے لوگوں کے درمیان سے گزر کر کمرے تک پہنچنا تھا! لوگوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے اسے بہت سی نظریں اپنے جسم پر چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔

حالانکہ آدھا فقرہ بھی تعزیتاً یا مذاقاً رما کی طرف اچھالا تھا۔ اس وقت خان رما کے چہرے کی حیا کی سرخی نہ دیکھ سکا۔

کمرے کا اختتام ایک چھوٹے سے کمرے پر ہوا۔ کمرے کے ایک کونے میں سامان کا ڈھیر تھا جس پر چٹائی بچھی ہوئی تھی اور ایک کونے میں کرسی دھری تھی۔ بالکل شادی والے گھر کا سا ماحول تھا۔ شاید سہائے فیملی کو یہ کمرہ گھر والوں کی طرف سے

Scanned and PDF By Qamar Abbas

"کیسے ہیں آپ۔ بہت دیر کردی آپ نے آنے میں۔" رما کے لہجے میں گھلی اپنا
نے اُسے ایک مرتبہ تو بلا کر ہی دیکھ دیا تھا۔

"دیر کیسی؟ ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔ آج میں آگیا۔" خان نے سنبھالا لیا۔

"بیٹھ جائیے ناں۔ کب تک کھڑے رہیں گے آپ۔" اُس نے کمرے میں دھری وا
کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے اپنا ہی گھر جانیئے۔ لیکن نہیں۔ شاید میرا گھ
کہہ گئی۔ آپ کا گھر تو بہت بڑا ہوگا۔"

"رما جی بات گھر کی نہیں۔ گھر کے مکینوں کی ہوتی ہے۔ جس گھر میں آپ ایسے
لوگ موجود ہوں....."

"یہ ہمارا گھر نہیں۔" رما نے ہنستے ہوئے بات کاٹ دی۔ "ہمارا گھر تو دہلی
ہے۔"

"آپ جس گھر میں بھی آئیں گی، وہی گھر سج جائے گا۔" خان کہے بغیر نہ رہ سکا
"بیٹھئے ناں۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ باقی سب لوگ تو ابھی واپس
پتا جی کہہ گئے تھے آپ آئیں تو جانے نہ دوں۔"

"شکریہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

⊙

رما اپنے تبسم کی بجلیاں اُس پر نچھاور کرتی باہر چلی گئی۔ کمرے میں وہ
رہ گیا۔ اندر تو کوئی نہ آیا لیکن باہر خاصا ہنگامہ برپا رہا۔ شاید اس مکان کے کسی
والے کمرے میں لڑکیاں مل کر شادی بیاہ کے گیت گا رہی تھیں، لیکن خان گھ
لوگوں سے بے نیاز صرف یہ سوچ رہا تھا: کہ وہ اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہے؟ اُس
نے اس پر کیا سحر پھونک دیا ہے کہ وہ اس کی آنکھوں کی گہری جھیل میں ڈ
ہے۔

اسے اپنے رویے کی کوئی خاص توجیہہ دستیاب نہیں تھی اور وہ خاصی اُلجھن محسوس
ہ تھا۔ اس اُلجھن سے نجات اُسے تب ملی جب رما ہاتھوں میں ٹرے تھامے
داخل ہوئی۔

"آپ کو انتظار کرنا پڑا۔" اُس نے برتن وہیں چٹائی پر رکھ دیئے اور
ہی اس پر بیٹھ کر خان کے لیے چائے بنانے لگی۔ "بور تو نہیں ہو رہے آپ۔"
پیالہ خان کی طرف بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"نہیں تو۔ آپ کے ہوتے ہوئے بوریت کیسی؟" خان کو اپنے لفظوں کی ادائیگی پر بھی
اختیار نہیں رہا تھا۔ "آپ یہاں نیچے کیوں بیٹھی ہیں۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ بھی
ہو، خاندانی مسلمان زادہ۔ عورت کا احترام اس کی گھٹی میں پڑا تھا: وہ رما کے منع کرنے
کے باوجود اُس کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

رما کی ٹرے دونوں کے درمیان رکھی تھی اور رما سوچ رہی تھی: یہ واقعی انسان ہے
یا کسی دیوتا نے جنم لے لیا ہے؟ — اُس کے نزدیک وہ بلند و بالا نوجوان کوئی
ہو سکتا تھا جو عورت کا احترام بھی کرتا ہو۔ ورنہ تو یہاں عورت کو جسمانی لذت کے
علاوہ ایک ذریعہ سمجھنے کے علاوہ کوئی مرتبہ ہی نہیں دیا جاتا تھا۔

وہ بھی کالج میں پڑھتی تھی وہاں آئے روز اُس کی کوئی نہ کوئی ہم جماعت کسی نہ
کسی درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتی اور لوگ ایسے کسی بھی تازہ واقعے کے فوراً
بعد بربریت کے خلاف جلوس نکالتے تھے لیکن اُن کے اس جلوس پر اُن کے
اپنے ہی نہیں پولیس والے بھی ہنسا کرتے اور بس! اس سے آگے پھر لیڈروں
کے بیانات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

وہ ہمیشہ اپنے معاشرے کی اِن کھوکھلی اقدار سے نفرت رہی تھی۔ اس کے اندر
ایک لاوا کھول رہا تھا جسے پھٹ جانے کی راہ ابھی شاید میسر نہیں آ رہی

تھی۔ آج ـــــ پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ اس معاشرے میں عورت کا احترام کرنے والے اُدون کی جیسے نوجوان بھی موجود ہیں۔

"کہاں چلی گئی آپ رُما جی!" خان نے اُسے گہری سوچ کی دلدل سے باہر کھینچا۔

"کہیں نہیں۔ سوچ رہی تھی۔ آپ سے مل جانا ہی میرا سوبھاگیہ (خوش قسمتی) تھا"

الفاظ بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلے اور خان کے دل میں ترازو ہو گئے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ـــــ اُسے کہنا ہی پڑا۔ کم از کم اس معاملے میں وہ سے زیادہ دیر تک منافقت نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ نمسکار ـــــ اچانک ہی آشا اندر داخل ہوئی۔ خان نمستے کر ہی رہ گیا۔

"ارے تم!" خان نے جواب میں ہاتھ باندھے۔

"کب آئیں تم واپس؟" رُما نے اپنی خجالت مٹانے کو کہہ دیا۔ وہ خان کی دلی کیفیت کا احساس بھی کر چکی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ آشا کتنی شرارتی ہے۔

"دیدی میں تو کب سے آئی ہوں۔ آپ کی باتیں چھپ کر سُن رہی تھی" آشا مسکراتے ہوئے خان کی آنکھوں میں جھانکا جو اُس سے نظریں چُرا رہا تھا۔ اُس کی بات پر دونوں کے دل زور سے دھڑکے تھے ـــ لیکن رُما جلدی نارمل ہو گئی۔ بہن کو اچھی طرح جانتی تھی۔

"اچھا اچھا زیادہ زبان نہ چلایا کرو" رُما نے اُسے پیار سے ڈانٹ دیا۔

"نہیں چلاتی زبان لیکن جاؤں گی نہیں۔ مجھے بھی تو اُدون کمار جی سے ملنا تھا" آشا نے بہن کو چڑایا۔

"کیا ہرج ہے رہنے دیجئے اسے" خان بھی اب سنبھل چکا تھا۔

"اسے جاتی ہے یا....." رُما نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور آشا باہر بھاگ

"بل دیکھوں باقی گھر والے بھی آئے ہیں یا نہیں" وہ باہر نکل گئی۔

"اس کی واپسی بمشکل چند منٹ بعد ہی ہو گئی تھی۔ اس کی زبانی خان کو علم ہوا کہ اس کے گھر کے باقی لوگ واپس نہیں لوٹے۔ آشا تو اپنی کسی دوست کے ہاں گئی تھی "وہ واپس آئی ہے"

"تھوڑی دیر کے لیے آگیا (اجازت) دیجئے۔ شام تک واپس آجاؤں گا۔ ابھی "ت وہم کرنا ہے"

"ٹھہریئے ناں ـــــ ابھی سب لوگ آجائیں گے" رُما کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ "ے۔

"اُدون جی کس کمبخت کا جی چاہے گا آپ کے پاس سے اٹھ کر جانے کو ـــ بس ایک "ی کام کرنے ہیں پھر لوٹ آؤں گا"

"نے اُسے بادلِ نخواستہ ہی جانے کی اجازت دی اور ـــــ دروازے کے باہر "ے چھوڑنے آئی تھی۔ اس دوران اُس نے بجھے خان کو کتنی مرتبہ یاد دلایا: کہ "ام کمک بہر صورت واپس آنا ہے۔

⊙

"ے رخصت ہو کر خان سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچا تھا ـــــ

"نے پہلے سٹیشن کے گرد دو تین چکر کاٹ کر صورتِ حال کا جائزہ لے لیا: کوئی غیر "معمولی نہیں! کچھ سادہ کپڑوں والے اُس کی نظر میں کھٹکے ضرور تھے لیکن اس نے "سوچا کہ وہ لوگ معمول کے مطابق ڈیوٹی دے رہے ہیں۔

"رے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اُس نے پھر احتیاطاً اردگرد نظر دوڑائی اور "اف دیکھ کر بالآخر وہ لاکر کی طرف بڑھا ـــــ اندر ایک لفافہ میں بند ایک "تھا؛ اُس نے لفافہ اٹھایا اور بڑے اطمینان سے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

Scanned with CamScanner

تالا لگانے کے بعد وہ پُر اعتماد قدموں سے مُڑا اور کچھ سوچتا ہوا نزدیکی ٹیلیفون بوتھ کی طرف چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ہوٹل میں فون کر رہا تھا۔

آپریٹر کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ مس سُکھشنا نامی کسی خاتون کے اب تک تین بار فون آچکے ہیں۔ پھر ریسپشن سے اُسے اطلاع ملی کہ وہ قریباً آدھ گھنٹہ اُس کا انتظار کرنے کے بعد واپس چلی گئی ہے۔

خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میدان فی الوقت تو صاف ہی تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور باتھ روم کا جائزہ لینے کے بعد ٹیپ ریکارڈر میں وہی کیسٹ لگا کر سُننے لگا۔

کیسٹ پر اس کے لیے ایک خاص پیغام اور کوڈ ورڈز میں ٹھنڈو کے لیے ایک پیغام بتایا گیا تھا۔ اُس نے دوبارہ ٹیپ چلا کر وہی پیغام سُنا اسے ذہن نشین کیا اور پیغام والا حصہ کر دیا۔ کیسٹ اُس نے جیب میں رکھ لی تھی۔ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اُس نے اپنے ہیڈ کوارٹر منگرائی اور وہیں سے سُکھشنا کو ٹیلی فون کرنے لگا۔

اِس مرتبہ بھی سُکھشنا اُسے گھر پر نہیں ملی تھی۔ لیکن کال موصول کرنے والی بنگالی عورت نے اُسے بتا دیا تھا کہ سُکھشنا خود اُسے بے چینی سے ڈھونڈ رہی ہے اور وہ کچھ ہوٹل بھی گئی تھی۔ اب وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی دوست کے گھر گئی ہے۔ اُس نے پیغام لکھوا دیا کہ وہ اب صبح ہی کو اُسے ملے گا کیونکہ آج اُسے اپنے عزیزوں کی ہاں شادی میں شریک ہونا ہے۔ اُس نے بھی اپنی طرف سے انہی جذبات کا اظہار کیا تھا جو اُسے سُکھشنا کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے لیے وہ ابھی پَر تول ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ خان نے ریسیور اُٹھایا ـــــ دوسری طرف سُکھشنا تھی۔

"اوہ کہاں کھو گئی ہو تم؟" اُس نے بڑی بے تکلفی سے سُکھشنا کو مخاطب کیا اور اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی اس سے ڈھیروں شکوے اور گلے کر دیے۔ خود سُکھشنا کو جواب اس کے مسلسل غائب رہنے پر غصہ آنے لگا تھا۔ الٹا خود کو شرمندہ محسوس کرنے لگی تھی۔

فون نے اُسے بتایا کہ کس بے چینی سے اُس نے سارا دن اُس کے بغیر گزارا۔ وہ کس طرح سے اُسے آج شادی کی تقریب میں شرکت کرنی ہے۔ اس لیے اُس کی مصروفیت سے سُکھشنا نے اُس سے شادی والے گھر کا ایڈریس دریافت کیا تاکہ وہاں ملاقات ہو سکے تو خان نے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھگوان کے لیے اس کا تصور بھی نہ کرنا۔ اگر تم نے وہاں پھٹکنے کی کوشش بھی کی تو اس بنیاد سے ملاقی ہو جاؤ گی۔"

"بزدل کہیں کا ـــــ" سُکھشنا نے ہنس کر کہا۔

سلسلہ منقطع ہونے پر خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔

○

ہوٹل سے وہ سیدھا ماہی کے پاس چلا آیا تھا ـــــ

گھر کے باقی لوگ بھی آچکے تھے اور اُس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ حاصلے اور اُس کی بیوی تو اس پر مٹے جا رہے تھے شاید سائے نے انہیں بتا دیا تھا کہ لڑکا سونے کی کان ہے۔ سب ہی اس کی خدمت پر کمربستہ تھے۔ اور دن کی واپسی اچانک آمد اُن کے لیے بہت خوشی کا باعث بنی تھی۔ بوڑھے جگن ناتھ نے اُس کا تعارف اپنے بیٹے کی حیثیت سے لوگوں میں کروایا تھا اور وہاں موجود لوگوں کی اکثریت اس "بیٹے" کو حسد اور کچھ رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے

رات گئے تک اس نے شادی کی تقریبات میں شرکت کی۔ ہر جگہ رما اس کو نمایاں نظر آئی۔ اُس کے چہرے پر نظر ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ رما نے بھی بیسیوں مرتبہ مختلف بہانوں سے اپنا آپ اسے دکھایا تھا۔ وہ عورت تھی اور قدرت نے اُسے یہ خوبی ودیعت کی تھی کہ مرد کے چہرے کو دیکھ کر اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگا سکے۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ جس طرح دورانِ سفر وہ اردن کمار کے تیر نظر کی گھائل ہو گئی تھی۔ کچھ اُسی کیفیت میں اب اردن کمار بھی مبتلا ہو گیا تھا۔

رات گئے وہ اُن لوگوں سے رخصت طلب کر کے ہوٹل جانے لگا تو سمائے کی بہن بضد تھی کہ وہ اُن کے ساتھ ہی رہے، لیکن اس دوران تقریباً آدھ گھنٹے تک اردن کمار تنہائی میں جگن ناتھ سمائے کو سمجھا چکا تھا کہ اس نے کس طرح اپنے بکھرے ہوئے پیسے بوشبا سے اکٹھے کرنے ہیں تاکہ اُس کے گھر والوں کو اس کی کسی حرکت پر شک نہ گزرے۔ اسی لیے شاید سمائے نے اشارے سے اپنی بیوی کو منع کر دیا کہ وہ خان کی مرضی میں کوئی دخل نہ دے۔

رما اُسے سڑک تک چھوڑنے آئی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے لیکن ابھی تک شہر میں رات کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ زندگی دن کی طرح مکمل بیدار تھی۔ مارکیٹیں کھلی تھیں اور کاروبارِ زندگی اپنے عروج پر تھا۔

"جی تو نہیں چاہتا تھا جانے کو لیکن مجبوری ہے" ــــ اُس نے چلتے چلتے رما سے کہہ ہی دیا۔

"آپ واپس تو آئیں گے ناں ــــ دہلی ــــ میں آپ کا بہت انتظار کروں گی" رما سے بھی نہ رہا گیا۔

"میں دہلی ضرور آؤں گا اور کبھی واپس نہیں جاؤں گا" اُس نے ایک ایکسٹرک کے قریب رُک کر بڑے ڈرامائی انداز میں رما کی آنکھوں میں جھانکا۔

رما بے تابی سے قابو ہوئی جا رہی تھی۔

"رما ــــ" خان نے اپنا ہاتھ اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف بڑھا کر اُسے مضبوطی سے تھام لیا۔ وقت کی نبضیں تو جیسے تھم گئیں۔ جانے کب تک وہ اسی طرح بے خودی کے عالم میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے رہتے کہ قریب سے گزرتی ایک موٹر سائیکل والے نے بہت زور سے اُن کے نزدیک پہنچ کر ہارن دے کر دونوں کو چونکا دیا۔

"اچھا نمسکار ــــ" خان نے دونوں ہاتھ باندھ کر اُسے پرنام کیا۔

"نمسکار ــــ" رما کے ہونٹ کپکپائے اُس نے لرزتے ہاتھ اپنے سینے پر آلستادہ کر لیے۔

○

ہوٹل کی سیڑھیوں کی طرف ابھی اُس کا پہلا قدم ہی اٹھا تھا۔ جب ایک نسوانی سایہ اُس کے قدم تھام لیے۔ کسی نے اس کا نام لے کر اُسے مخاطب کیا تھا۔ گردن اٹھا کر اُس کی نظر سُکھمٹ پر پڑی۔

"اوہ ڈیئر ــــ کہاں چلے گئے تھے تم ــــ اتنی دیر ــــ" اُس نے شکایتی لہجے میں مخاطب کیا۔

"مالہ ہی ایسا تھا دیوی جی! ورنہ آپ کی محبت تو مقدر والوں ہی کو ملتی ہے"

"اچھا بس زیادہ بناؤ نہیں۔ آؤ کمرے میں چلتے ہیں" اُس نے بڑی بے تکلفی سے بازو پکڑ لیا۔

خان نے بھی کچھ کم بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ فی الحال اپنے کسی بھی عمل سے اصل ظاہر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ سُکھمٹ کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ لفٹ میں آ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سُکھمٹ نے ایسی بے ہودہ حرکت کی جس پر خان چونک اٹھا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ابھی تک وہ اس لڑکی کو سمجھنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ کبھی وہ اُسے کوئی مظلوم اور ٹھکرائی ہوئی لڑکی دکھائی دیتی اور کبھی

ضرورت سے زیادہ چالاک ـــــ وہ کوئی ایسی گری پڑی عورت نہیں تھی کہ اُسے خان جیسا اور کوئی اِس شہر میں میسر ہی نہ تھا۔

پھر ایسی کیا بات ہے؟ اُس نے خود سے سوال کیا اور اس کے ذہن نے فوراً ہی

کا دوسرا رُخ اُسے دکھانا شروع کر دیا۔

"ایکسکیوزمی ڈیئر" ـــ اُس نے خان کو مخاطب کیا اور اپنا بڑا سا پرس وہیں میز

پھینک کر باتھ روم میں جا گھسی۔

ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اچانک ہی اُس کے ذہن میں لپکا ایک لمحہ

کیے بغیر خان نے پرس اٹھا لیا۔ پرس لاک نہیں تھا۔ پہلی ہی جیب کھلنے پر اُس کا

اعشاریہ دو بور کے ننھے سے پستول پر پڑی۔ مزید کچھ دیکھے بغیر اُس نے پرس بند کر دیا

اِس عمل میں بمشکل ایک منٹ صرف ہوا تھا۔

جس طرح اُس نے پرس کھول کر دوبارہ بند کیا تھا۔ کوئی ہوشیار آدمی بھی

نہیں لگا سکتا تھا کہ پرس کھول کر دیکھا گیا ہے یا اُس کے رکھنے کی جگہ تبدیل ہوئی۔

دو پستول دیکھ کر ایک لمحے کے لیے چونکا ضرور تھا لیکن اب بالکل نارمل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی سُلکھشنا باہر نکل آئی۔

"کیا منگواؤں تمہارے لیے؟" ـــ اُس نے چہکتے ہوئے پوچھا۔

"جو تمہارا دل چاہے"

"میں تو بڑی فرح کھانا کھا کر آیا ہوں" ـــ اُس نے اپنے لیے میدان صاف

ہوتے کہا۔ "کافی منگوا لیتے ہیں"

"جو تمہاری مرضی" ـــ سُلکھشنا اُس کے اور نزدیک آ گئی۔

خان نے کچھ سوچا اور ایک پلان فوراً اُس کے ذہن میں آ گیا۔ بیرے کو کافی

Scanned at ICOE

اس کی ہر بیہودہ حرکت کا جواب اُس سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ دیتا رہا۔ کافی اُس کے

لیے سُلکھشنا نے ہی تیار کی تھی۔ اُس نے ایک ادائے خاص سے خم کھاتے ہوئے خان کو کافی

پیش کی۔ کافی کی چسکیاں لیتا ہوا وہ اچانک ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی یہ حرکت سُلکھشنا

کو گھبرا دینے کے لیے کافی تھی۔

"میرا خیال ہے اب تم کھل ہی جاؤ" ـــ خان کا وار اتنا بھرپور اور اچانک تھا کہ واقعی

سُلکھشنا بوکھلا کر رہ گئی۔

"میں نہیں سمجھی" ـــ اُس نے اُٹھنا چاہا۔

"میں ہندی بول رہا ہوں مس سُلکھشنا یا جو کوئی بھی تم ہو" خان کا لہجہ بڑا سرد تھا۔

سُلکھشنا چند سیکنڈ اُسی انداز میں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ پھر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس

کے تاثرات بالکل بدل چکے تھے اور تھوڑی دیر پہلے تک جو فاحشہ پن اور مکاری

اُس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔ اِس وقت خان کو وہ کوئی بارہ سال

کی معصوم لڑکی نظر آ رہی تھی۔

"مسٹر اروِن کمار آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہمارا اندازہ آپ

کے بارے میں ٹھیک تھا" ـــ فقرے کے آخری حصے پر خان کا سارا جسم ہی تو لرز اُٹھا تھا۔

"اس خفیہ پولیس سے نہیں پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیجئے۔ البتہ اُن لوگوں سے ضرور

ہمارے برِ زمین اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ کمار صاحب! پہلے روز آپ جب بھنڈہ

پر اُترے تھے تو ہمارے گروہ کے ایک آدمی کو آپ پر شک گزرا تھا کہ آپ ہمارے

ہی کوئی ہو سکتے ہیں؟"

"اوہ کام کرتے ہو تم لوگ" ـــ خان نے بڑے سرد لہجے میں اُس کی بات کاٹی۔

"مت سے کام۔ کوئی بھی غلط کام ـــ مجھے سب کچھ بتانے کا حکم نہیں۔ کیونکہ میری

نظر میں ان لوگوں کے نزدیک معمولی سی فاحشہ کے سوا اور کچھ نہیں"

"دیکھو مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میرا گروہ تم سے بھی طاقتور ہے، جس کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ میں تمہیں جان چکا ہوں۔" خان نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

سُلکھشنا نے دورانِ گفتگو اپنے پرس کی طرف سرکنا شروع کر دیا تھا۔ گو کہ اُس نے یہ حرکت بہت ہی محسوس انداز میں کی تھی لیکن خان کی عقابی نظروں سے وہ محفوظ نہ رہ سکی۔

"زیادہ چالاکی اچھی نہیں ہوگی تمہارے لیے ــــ" اُس نے کافی کی پیالی پکڑے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا پرس بھی اٹھا لیا۔ کافی کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر اُس نے پیالی میز پر رکھ دی اور خود مڑ کر قریبی صوفے پر بیٹھنا چاہا۔

جیسے ہی وہ صوفے کی طرح گھوما کھڑی ہوئی سُلکھشنا کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اُس نے اپنی دانست میں خان کو بے خبر پا کر اُس پر جست لگائی تھی۔

سُلکھشنا کے پاؤں اور خان کی ٹانگ ایک ساتھ چلے تھے اور ہوا ہی میں وہ دونوں پلنگ پر آن گری تھی۔ اُسے اپنا پیٹ کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ خان بغیر کچھ کہے بڑے لاپرواہی سے اپنی جگہ بیٹھ گیا:

"اگر تمہارے پاس سائیلنسر ہوا اس پستول پر فٹ کرنے کے لیے تو میں تمہیں اپنے جسم پر چھ گولیاں چلانے کی اجازت بھی دے سکتا ہوں لیکن افسوس شور و ہنگامہ مجھے پسند نہیں۔"

خان نے اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ اُس کے اچانک بدلے ہوئے روپ نے سُلکھشنا کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اُسے یہ شخص کوئی بہت بڑا اذیت پسند نفسیاتی لگا تھا جو اپنے شکار کو تڑپا تڑپا کر مارنے کا قائل ہو۔ خان نے اُس کا سارا پرس میز پر پلٹ دیا تھا اور وہ چھوٹا سا سیکیورٹی کارڈ اٹھا کر دیکھنے لگا تھا جس پر سُلکھشنا کی سرکاری شناخت درج تھی۔

"اوہ لیڈی انسپکٹر سی آئی ڈی ــــ" اُس کے ہونٹ دائرے کی شکل اختیار کر گئے۔ "میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔ نہ ہی تمہارے متعلق ابھی کوئی مشتبہ رائے

قائم کی ہے:

"مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا ــــ؟"

"مسٹر کمار، میری ڈیوٹی تھی۔ میرا فرض تھا کہ جب تک تمہارے متعلق مطمئن نہ ہو جاؤں تمہیں اپنی اصلیت سے آگاہ نہ کروں۔ تم دیکھ سکتے ہو میں نے اپنا نام تمہیں صحیح بتایا ہے۔"

"مس سُلکھشنا! میں تمہیں اپنے متعلق بہت کچھ بتا دیتا ہوں۔ میرا نام بھی غلط ہے پہچان بھی۔ میں بمبئی سے آیا ہوں یہاں صرف ایک بات کا پتہ لگانے کے لیے کہ حال ہی میں سرحد پار سے جو افیم آئی تھی اس کی مخبری کرنے والے کو پولیس نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ اور ــــ مجھے اب اس بات کا علم ہو چکا ہے! اپنے گدھے افسروں سے کہہ دینا کہ وہ اب ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تم لوگ اُسے بچا نہیں سکتے۔ افسوس یہ اطلاع تمہیں کراس وقت ملے گی جب میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔"

"مسٹر کمار! گو تمہارا پیشہ ایسا ہی ہے لیکن مجھ پر اعتبار کرو۔ میں واقعی تم سے بہت متاثر ہوئی ہوں ــــ" اُس نے پالنسہ پھینکنا چاہا لیکن خان جان چکا تھا کہ وہ اب بھی ڈبل کراس کر رہی ہے۔

"میں جھوٹ کھرانے کا ماہر ہوں مس سُلکھشنا جانتی ہو آج لاکھوں میں کیوں کھیل رہا ہوں؟" سُلکھشنا نے اس کی طرف بڑی بجھی لیکن استفہامیہ نظروں سے دیکھا ــــ "صرف اپنے اوپر کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔"

"بیوقوفی کرو گے یہ ہوٹل ہمارے آدمیوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسٹر کمار! ہم اتنے جاہل نہیں اپنے افسران کی جان کو خطرے میں ڈال کر بے نیاز ہو کر بیٹھ جائیں۔ جیسے ہی تم اکیلے باہر نکلو گے ــــ مارے جاؤ گے ــــ" سُلکھشنا نے آخری ہتھیار بھی آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

"ویسے بھی اچھا ہے! تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹنے کے

بعد کس کافر کا جی چاہے گا زندہ رہنے کو؟ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور واقعی سُلکشنا سہم کر رہ گئی۔ ایسے نوجوان خوبصورت اور اذیت پسند مجرم سے اس کا پالا آج پہلی مرتبہ پڑا تھا۔

اچانک ہی خان کی چھٹی حس نے اُسے احساس دلایا کہ یہ لڑکی وقت ضائع کر رہی ہے۔ اگر اس کی بات سچی ہی تھی تو یہ ممکن تھا کہ اس کے نیچے موجود ساتھی اوپر چلے آئیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سُلکشنا کے بالکل قریب آ گیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے: بزنس اپنی جگہ، لیکن ایسی خوابِ رات اور تمہارے قرب سے فائدہ نہ اٹھانا بھی تو کفرانِ نعمت ہوگا۔"

اُس نے اپنا لہجہ بدلنے کی اتنی شاندار اداکاری کی تھی کہ دل ہی دل میں بے اختیار اُس نے خود کو داد دی۔ اُس کی آواز ہوس کے مارے تماش بین کی سی ہو گئی تھی اور یہی شاید سُلکشنا کی آرزو بھی تھی۔

وہ مزدور نہ تھا۔ اُس نے خود سپردگی کے عالم میں سسکاری بھری۔

خان کے ہاتھ بڑے وحشیانہ انداز سے اُس کی طرف بڑھے تھے۔ سُلکشنا نے بھی بڑھ کر وہ اسے اپنی آغوش میں لے لے گا لیکن خان کوئی بھی معمولی سی لغزش کا معمولی سا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کمرہ ساؤنڈ پروف نہیں اور وہ چیخنے کا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ اس کے دونوں آگے کو بڑھے ہوئے ہاتھ اُس کے کندھوں پر جم گئے۔ اور دائیں ہاتھ کا انگوٹھا گردن کے نزدیک ایک مخصوص رگ میں گڑ گیا۔

سُلکشنا کو یہ احساس مزید ہو رہا تھا کہ اس کی جان آہستہ آہستہ نکل رہی ہے۔ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز نکالنے پر اُسے قدرت نہیں رہی تھی۔ جانے خان نے اُس جسم کی کون سی رگ دبا دی تھی کہ سارا جسم سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے کسی عضو کو حرکت

دینے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی اُس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور ڈوبتا چلا گیا —

وہ ایک مری مُنی کی طرح خان کے بازوؤں میں لہرا رہی تھی۔

— خان نے اُسے بڑے اطمینان سے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ خان کو اندازہ تھا کہ ڈھائی گھنٹے سے پہلے وہ ہوش میں نہیں آ سکے گی اور اُس کے لیے بھنڈہ سے نکل جانے کا وقت کافی تھا۔

○

اس کے فوراً ہی بعد وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا، مگر کہ اس نے کافی بنانے والے کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ مگ برتن لینے آئے۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے باہر کی سمت ہوٹل کی طرف سے فراہم کردہ "ڈونٹ ڈسٹرب پلیز" کا سائن بورڈ لٹکا دیا گیا تھا۔ مگ والی چابی ابھی تک محفوظ تھی۔ اب تک اُسے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ ڈپلی کیٹ چابی ہے۔ اصل چابی کہیں اور ہو گی۔ شاید اُس کے پاس جو گارڈ تھا کر دیا تھا۔

اُس کاغذ پر مختصر سا پیغام اور خفیہ الفاظ میں تازہ واردات کے متعلق لکھ کر اُس نے اپنے جیب میں رکھا اور بڑے اطمینان سے باہر نکل آیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی لفٹ لے کر نیچے لابی میں جانا نہیں بھولا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور چشموں کی مینک لگانے کے بعد کوٹ کے کالر کھڑے کر لینے سے اب اُسے پہچاننا مشکل نہیں رہا تھا۔

لفٹ کے بجائے اُس نے سیڑھیوں کا راستہ اختیار کیا اور بغیر آواز پیدا کیے سیڑھیاں طے کر آیا۔ اس میں کوشش اتنا زیادہ تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ لوگ مغربی میوزک کی دھنوں پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ محوِ رقص تھے کسی نے اُس کی طرف دیکھنے کی زحمت

ہی گوارہ نہیں کی تھی۔ کاؤنٹر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اُس نے احتیاطاً چلتے چلتے سگریٹ سلگانے کے بہانے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تھا اور اسی ایکشن میں باہری دروازے تک چلا آیا تھا۔

اسٹیشن یہاں سے بمشکل ایک میل دُور تھا لیکن یہاں تک پہنچنے کے لیے اُس نے تین سواریاں بدلی تھیں۔ آخری مرتبہ جب وہ ایک سائیکل رکشہ میں سوار ایک بازار سے ہو کر جا رہا تھا تو اُس نے اپنا بھاری اوورکوٹ بھی اُتارا ہوا تھا۔ یہ اوورکوٹ وہ جان بوجھ کر ایک جگہ بھول آیا تھا۔

اسٹیشن کے دوسری طرف بنے بازار میں اُس نے سائیکل رکشہ والے کو بھی فارغ کر دیا۔ اب وہ پیدل مختلف گلیوں کے چکر لگاتا اسٹیشن تک آیا تھا۔ لاکر کے روم تک کوئی ذی ہوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے لاکر کھولا اور وہ رقعہ تہہ کر کے اندر رکھ کر دوبارہ تالا لگا دیا۔ جو کرے سے نکلتے ہوئے اُس نے نگاہ تھا

اسٹیشن پر کھڑی دو تین گاڑیوں میں سے ایک کی وسل سنائی دی تو وہ بھاگتا ہوا اُسی ٹرین کی سمت بڑھنے لگا۔ ٹرین نے اب آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک ڈبے میں سوار ہونے میں وہ کامیاب ہو گیا۔ یہ فسٹ کلاس کا ڈبہ تھا اور قریباً خالی۔ کھڑکی کے نزدیک والی ایک سیٹ پر وہ ڈھیر ہو گیا۔ سردی میں اونگھتی ایک دو سواریوں نے اُس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ اونگھنا شروع کر دیا۔

ٹرین کا پہلا سٹاپ قریباً آدھ گھنٹے بعد آیا تھا۔ یہ بڑا ویران سا اسٹیشن تھا۔ اس نے نام پڑھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹرین نے یہاں بڑا دو تین منٹ سٹاپ کیا تھا پھر وہ آگے کی جانب رینگنے لگی۔ ابھی تک کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہیں آیا تھا۔ گاڑی اتنی سردی میں اپنے کمرے سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا یا شاید کبھی وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فسٹ کلاس کے ڈبے

اتنی رات گئے کوئی مسافر بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہے۔

رات گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑی آہستگی سے رینگ رہی تھی۔ چاند جو اس لڑکی کے سامنے اب تک مسلسل اُس کا ہم سفر بنا ہوا تھا اب شاید کہیں منہ چھپانے لگا تھا۔ خان سوچ رہا تھا اس مسلسل اور تھکا دینے والی دوڑ کا خاتمہ آخر کہاں ہو گا اس تک اسے کہیں بھی پاؤں جمانے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ یہ حسن اتفاق تھا یا بھارتی انٹیلی جنس کی باخبری کہ اب تک وہ لوگ اس کے پیچھے تھے لیکن یہ اُس کی خوش قسمتی ضرور رہی تھی کہ ان لوگوں کے شک کرنے سے پہلے ہی وہ اُن کے ہاتھوں سے نکل جاتا تھا۔

لکشمنا کے متعلق تو واقعی وہ حیران رہ گیا تھا کہ وہ بھی سی آئی ڈی انسپکٹر ہے اور اس کی تربیت کا صدقہ تھا جو اُس نے اس پُراسرار لڑکی کے متعلق اس سے کہنا شروع کر دیا تھا۔

اس کا ذہن ٹرین کی رفتار کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ جب اچانک ہی کسی نے دروازے پر بڑے شرمیلے انداز میں ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا۔ خان نے گردن گھمائی۔ اس کے سر پر ٹکٹ کلکٹر کھڑا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ گن کر اُس کی طرف بڑھا دیے ـــــ بوڑھا ٹکٹ کلکٹر بڑی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ نے ٹکٹ مانگا تھا شریمان جی ـــــ" اُس نے سمجھا شاید خان نے اُسے ٹکٹ کے پیسے نوٹ دے دیے ہیں۔

"نہیں ہے نمسکار جی! میں دو تین اسٹیشن بعد اُتر جاؤں گا۔" اُس نے بڑے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ٹکٹ کہاں کے کہاں کا؟"

"کاش مجھے اپنی منزل کا علم ہوتا ـــــ" خان نے لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری۔ ٹکٹ گھ
خاصا پیچھے گیا۔ اُس کا تیر عین نشانے پر لگا تھا۔

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی ـــــ" ٹکٹ کلکٹر نے مزید بحث مناسب نہ سمجھی اور
آگے بڑھ گیا۔ نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اُسے کسی
آج تک اتنی بڑی رشوت' شاید پہلے کبھی پیش ہی نہیں کی تھی۔ جاتے جاتے ایک
کے لیے وہ رُکا پھر واپس مُڑ کر اُس تک پہنچا اور بڑی آہستگی سے قریباً جھکتے ہوئے
کے کان میں کہا ـــــ "میری ڈیوٹی صبح چھ بجے ختم ہو جائے گی"

"بے فکر رہو میں اس سے پہلے ہی دفع ہو جاؤں گا ـــــ" خان نے آواز دبا کر
بڑے پھاڑ کھانے والے لہجے میں جواب دیا۔

ٹکٹ کلکٹر بیچارا سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور دوبارہ پلٹ کر اُس نے خان کی طر
دیکھا بھی نہیں تھا۔ سردی رات ڈھلنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی اور خان سوچ
تھا کہ اُسے اوور کوٹ بھول نہیں چاہیئے تھا۔

ایک دو مرتبہ اُس نے سیٹ سے سر ٹکا کر اذنگنے کی ایکٹنگ بھی کی تھی۔ اُس
سامنے کئی برتھ خالی پڑے تھے لیکن وہ نیند کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

⊙

صبح کے قریباً چھ بج رہے تھے۔

گاڑی اس دوران راستے میں کتنے مرتبہ کھڑی ہوئی تھی لیکن ڈبے میں صرف ا
موٹا سا ہندو لالہ ہی سوار ہوا تھا۔ یہاں اتنی غربت تھی کہ بہت بڑے بڑے آدمی بھی
کے فسٹ کلاس میں سفر کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے تھے۔ خان کو یاد آگیا۔ ٹکٹ گھ
بتایا تھا کہ اس کی ڈیوٹی صبح چھ بجے ختم ہو جائے گی۔

گاڑی اس مرتبہ ایک اسٹیشن پر رُکی تو انبالہ کے بڑے بڑے الفاظ اس کی آنکھ

ٹ بیدار کرنے لگے۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ خود بخود سے پھیلتی چلی گئی۔ اپنے
ے وہ باہر نکل آیا۔ دو سواریاں اور بھی اُس کے ساتھ اُتری تھیں۔ سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کی
ا سے لوگوں کا اژدہام باہر کو لپک رہا تھا۔ وہ بھی تھوڑی دیر بعد اس ہجوم کا ایک حصہ
ا سٹیشن کی سیڑھیاں عبور کرتا باہر آرہا تھا۔

انبالے میں زندگی بیدار ہونے لگی تھی۔ مندروں اور گوردواروں کے لاؤڈ سپیکر اچھی
ی آواز دھاڑ رہے تھے۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے واحد بریف کیس کا جائزہ لیا۔
ا اور جیکٹ کی جیبوں میں موجود نوٹوں کو تھپتھپا کر محسوس کیا اور بجائے سیدھے راستے
ا ہونے کے ایک ذیلی راستے سے جس طرف اُس نے اکثر سواریوں کو جاتے دیکھا
ا گیا۔

Scanned and PDF by Qamar Abbas

لہو کی مہک

انبالہ میں داخل ہوتے ہی جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی کہانی اچانک یاد آگئی تھی۔ اُسے یاد آگیا کہ ۶۵ء کی جنگ میں پاکستانی پیراکمانڈوز نے اِس ہوائی اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اُس نے سُنا تھا کہ جن اُن لمحات میں جب انبالہ کے ہوائی اڈے پر بھارتی فضائیہ کے پائلٹ آپریشن روم سے پاکستان پر تباہی نازل کرنے کے احکامات لے کر باہر نکل رہے تھے۔ اور اپنے طیاروں میں بیٹھ کر کسی بھی لمحے اُڑنے کے لیے تیار تھے ـــــ یہ پیراکمانڈوز اُن پر خدا کا قہر بن کر نازل ہو گئے۔

ہوائی اڈے پر مکمل بلیک آؤٹ تھا اور پاکستانی کمانڈوز ان طیاروں پر گھات لگائے بیٹھے تھے ـــــ جیسے ہی یہ پائیلٹ اپنے جہازوں میں سوار ہوئے اچانک ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

دشمن کے عزائم چند منٹوں میں اُس کے سامان حرب و ضرب کے ساتھ ہی راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بھارتی آرمی نے ہوائی اڈے کو گھیرے میں لیا تھا ـــــ

اِن کمانڈوز میں سے بمشکل دو یا تین زندہ اپنے وطن واپس پہنچ سکے اور باقی سب نے وہیں لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر لیا تھا ـــــ ایک بھی اُن میں سے زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

اُسے انبالے کی طرف بڑھتے ہوئے اُن شہیدوں کے لہو کی مہک آرہی تھی ـــ وہ محسوس کر رہا تھا آج جب وہ اُس ہوائی اڈے کی تباہی کا سامان کرنے جا رہا ہے اُن شہیدوں کی روحیں کتنی خوش ہوں گی۔

○

اُسے بتایا گیا تھا کہ یہاں انبالہ میں کم طاقت اور کنٹرولڈ کارروائی موبائل ٹی پی ایس وائی ہے جس میں گو کر جی سی آئی (گراؤنڈ کنٹرول انٹرسیپشن) کی سہولت موجود نہیں لیکن وہ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

اُسے سب سے پہلے اسی اڈے کا کھوج لگانا تھا۔ جہاں ریڈار نصب کر کے دشمن ۶۵ء کی جنگ کی طرح پاک فضائیہ کے حملے سے محفوظ کرنا چاہتا تھا ـــ یہ ریڈار اسٹیشن موبائل تھا اور ایک جگہ پر بیٹھ آئے دن تبدیل کرتے رہنے کی وجہ سے ابھی تک پاکستان انٹیلی جنس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

سب سے پہلے اس نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ناشتہ کیا پھر ایک سرائے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک درمیانے درجے کا ریڈی میڈ کپڑوں کا جوڑا خریدا اور پھر دکان کے رجسٹر پر کچھ لکھنے سے پہلے اُس نے دس روپے کا ایک نوٹ اُس کی مٹھی میں تھماتے ہوئے اپنا نام بتایا تھا۔

"شاکر ـــ!"

"جی بہت اچھا مہاراج" پروہت نے دس روپے کا نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ لیں چابی۔"

اپنے سامنے رکھے ایک لکڑی کے بکس میں سے ایک چابی جو رسی سے بندھی ہوئی تھی اُسے دے کر دی۔

"بہت جی مہاراج" ـــ اُس نے شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ کمرے

Scanned by CamScanner

کو اندر سے کنڈی لگا کر وہ گھوڑے بیچ کر سویا اور صبح سویرے ہی اس کی آنکھ کھلی۔

خان نے جب بریف کیس سے کپڑوں کا جوڑا نکال کر نئے قمیص پاجامے پر کوٹ ٹائی لگائی تو درمیانے درجے کا ہندو نوجوان نظر آ رہا تھا ـــــ اپنے کمرے کو تالا لگا کر وہ باہر بازار میں آ گیا۔

ابھی تک اسے کوئی قابلِ عمل طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ یونہی ٹہلتا ہوا وہ ایک سٹینڈ تک آ گیا اور وہاں ٹرانسپورٹ کی ایک بس اس طرف آ رہی تھی اور اچانک اس کی نظر انڈین ایئر فورس کے ایک کارپورل پر پڑی جو قریباً بھاگتا ہوا اسی بس کی طرف آ رہا تھا۔ فوراً ہی خان نے ایک پلان سوچا اور اسی کے سے انداز میں بس کی طرف لپکا جیسے اس نے بھی اس بس میں جانا ہو۔

کارپورل اور اس کا ٹکراؤ بس سے کچھ فاصلے پر بالکل اچانک ہوا اور وہ تو منہ کے بل سخت کارپورل سے ٹکرایا تھا جب کہ مخالف کا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ کہا" قلابازی کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ اسی انجام سے خان بھی دوچار ہوا تھا لیکن وہ اٹھا کارپورل کے بعد تھا۔

"شاکر نا مہاراج جی!" اس نے کارپورل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے ہاتھ باندھ دیئے۔

"کوئی بات نہیں۔ جلدی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" کارپورل کوئی شریف آدمی دے رہا تھا۔

اس دوران بس نکل چکی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کی طرح مسکرا رہے تھے۔

"بہت افسوس ہوا آپ کی بس بھی نکل گئی" ـــــ خان نے اظہار افسوس کیا۔

"آپ نے بھی تو جانا تھا شاید اسی بس پر۔" کارپورل بولا۔

"ہاں ہوا کیا مہاراج! کاروباری آدمی ہیں، دیر سویر بھی ہو جائے تو کچھ بات نہیں۔ آپ ایئر فورس والے ہیں، وقت کے پابند۔"

"ہاں بھئی لیکن اب تو میں چھٹی کر کے گھر جا رہا تھا۔"

"اوہ۔ تب تو ایک کپ چائے ہو جائے۔ بس تو ذرا دیر سے آئے گی۔" کارپورل مسکرا رہا تھا۔

"شاکر نا مہاراج جی!" اس نے چلتے چلتے کہا۔

"اچھا شاکر نام ہے میرا ـــــ" اس نے چلتے چلتے کہا۔

"اچھا ساہنی کہتے ہیں مجھے" ـــــ کارپورل نے اب اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔

دونوں ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں بنے کیبن میں آن بیٹھے تھے۔ خان نے ان کے لیے خاص پُرتکلف چائے کا آرڈر دیا تھا۔

"ہم تو مہاراج یاروں کے یار ہیں۔ بس محبت کے بھوکے ہیں اپنا کوئی آگے پیچھے کھانے والا نہیں۔ جو کمایا وہی یاروں پر لٹا دیا۔" خان نے گلاب جامن زبردستی اس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "چار دن ہوئے میں بھی رہ آیا ہوں فوج میں ـــــ اپنی تو بھائی جان بندھے پابندی سے ـــــ پھر اتنی سی تنخواہ میں بات ہی کیا بنتی ہے۔ اب یہ دیکھ لو چھوٹی سی نوکری ہے میری اور بھگوان کی کرپا سے ہزاروں کی آمدن ہو رہی ہے۔" اتنا کہتے ہوئے اس نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور ایک نوٹ اچھے ساہنی کو دکھا کر واپس کر لیا۔ باقی گڈی دوبارہ جیب میں رکھ کر اس نے بیرے کو اپنے پاس بلایا۔

"کون سا سگریٹ منگواؤں آپ کے لیے؟"

"کوئی بھی منگوا لیں" ـــــ کارپورل نے انکساری سے کہا

"اور ہاں جی اپنا بل بھی کاٹ لینا اور ایک ڈبی گولڈ فلیک کی لیتے آنا ـــــ" اس نے اب مہنگے سے سگریٹ کا نام لیا۔

کارپورل کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا یار" واقعی اُسے ساری دُنیا سے نرالا لگتا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ ——" اُس نے ہوٹل کے باہر آتے ہی خان سے پوچھا

جواب میں خان نے ایک زوردار لیکن کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور بولا "یہ پوچھ

کہاں نہیں رہتا۔ ابھی سارے بھارت میں رہتا ہوں لیکن میرا اپنا کوئی گھر نہیں:

بس اسٹاپ پہنچنے تک وہ اجے ساہنی کا دل مٹھی میں لے چکا تھا۔ وہ شاید اتنی زیادہ

محنت اس پر نہ کرتا لیکن اس کے بازو پر کندے کے نزدیک گئے اُس خاص نشان نے جو اُسے

ٹریڈ کی حکایت کر رہا تھا۔ خان کے لیے اُس میں خاصی کشش پیدا کر دی تھی۔ اُس نے

کو یہی بتایا تھا کہ وہ یہاں کاروباری صورتحال کا جائزہ لینے ہی آیا ہے۔

اسی دوران اچانک ہی اُس نے بڑے ڈرامائی انداز میں ایک شراب خانے

رک کر "رم" کی ایک بوتل خریدی اور شراب خانے کے باہر آکر اجے کو پکڑا دی۔

"تم دُنیا میں واحد آدمی ہو جس نے میرے دُکھ کو محسوس تو کیا ہے اپنے بھائی

سے تحفہ سمجھنا —— اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو اُس کا نام بھی یقیناً اجے ہی ہوتا۔ میرا

جو ہے۔"

کارپورل اجے ساہنی بے اختیار اس سے بغلگیر ہو گیا: "بھئے اپنا بھائی ہی کہا ہے

چلو میرے ساتھ گاؤں۔ لعنت بھیجو سرائے پر۔ وہیں چل کر رہتے ہیں۔ صبح میں نے واپس

آنے میرے ساتھ ہی آجانا۔"

خان پہلے تو ٹالتا رہا۔ "ماں جی سے اپنے تحفہ لے لو۔ بڑا بھائی آئے

کی بات ہے میں بال بچوں والا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ واقعی سرائے پر لعنت بھیج کر اُس کے

ساتھ بس میں بیٹھا دوں جا رہا تھا۔

بس میں سوار ہونے سے پہلے اُس نے تازہ پھلوں کے دو ٹوکرے بھر لیے

Scanned by CamScanner

اُس پر مٹا جا رہا تھا۔ رم کی خوشبو ہی اُسے پاگل کر دینے کے لیے کیا کم تھی۔

○

شہر سے بیس میل دُور اُس کا گھر تھا —— اجے ساہنی نے اپنے ماتا پتا اور پتنی سے

خان سے اپنے نئے بھائی کا پریچے (تعارف) کروایا تھا۔ وہ لوگ اُس کے ہاتھوں میں پکڑے

پھلوں کے ٹوکرے دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے۔

رات کو اجے ٹھاکر نے تو کھانا کھا لیا لیکن اجے ساہنی نے نہ کھایا۔ وہ تو ٹھاکر کو بھی

اجے کو یہ سے منع کرتا رہا لیکن ٹھاکر کو زندگی میں بہت دیر بعد اس طرح گھر میں

ماں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ اس سنہری موقعے کو ضائع نہیں

کرنا چاہتا تھا۔

شام ڈھلتے ہی دونوں مکان کی دوسری منزل پر بنے کمرے میں چلے گئے۔

"برا مت ماننا بھیا جی! میں تو سمجھ گیا تھا لیکن مجبوری ہے۔ میں ابھی کم از کم چھ ماہ

شراب پینا تو کیا سونگھ بھی نہیں سکتا۔"

"یوں ——" اجے نے اظہارِ افسوس کیا۔

جواب میں اپنی جس بیماری کا نام وہ بٹ کرنے لیا تھا۔ اُس کی ذرا سی سمجھ بھی اجے

ساہنی کو نہ آئی لیکن اُس پر بیماری کا رعب ضرور پڑ گیا تھا۔ شراب کا پیگ اس کے لیے

وہ خان نے ہی تیار کیا اور پھر تیار کرتا چلا گیا۔

"بھائی صاحب فوج میں گزارے تو چار دن ہیں میں وہ زندگی یاد بہت آتی ہے۔

اور میں شاندار زندگی تھی —— بائی دی وے آپ وہاں کام کیا کرتے ہیں ——" اُس

کارپورل کو نشے میں آتے دیکھ کر اپنا کام شروع کر دیا۔

کارپورل اجے ساہنی جس کا پہلا پیگ ختم ہونے سے پہلے دوسرا اُس کے لیے اُس کا

بڑا بھائی تیار کر کے رکھ دیتا تھا تو تک میں آکر شروع ہوا اور اُس نے اپنا سارا کچا

چھٹا اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

درمیان میں کئی باتیں قند مکرر کے طور پر بھی ہوئی تھا کہ اُس سے پوچھا جاتا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد ہی وہ اُس سے ریڈار کے متعلق بہت سی باتیں اگلوا چکا تھا لیکن بڑے نامعلوم طریقے سے ـــــ بالکل یوں جیسے اُس نے اجے ساہنی کی بات سُن کر بھی اُس پر احسان ہو۔ اس سے پہلے کہ اجے "آؤٹ" ہو جائے اُس نے باقی بوتل وہاں سے ہٹالی اور رسوئی خود جا کر اُس کے لیے کھانے کی "تھالی" تیار کر کے لے آیا۔

اجے تو کھانا کھاتے ہی بے سدھ ہو کر سو رہا لیکن خان رات کافی دیر گئے تک جاگتا رہا۔ اُس نے اس درمیان اپنے ذہن میں اجے کی طرف سے حاصل کردہ تمام معلومات نتھی کر لی تھیں ـــــ اُسے اُن مقامات کے چپے چپے کا علم ہو چکا تھا جہاں یہ موبائل ریڈار موجود رہتا تھا۔

اور ـــــ اب دوسرا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ ـــــ اپنی آنکھوں سے اُس موبائل سٹیشن کو دیکھ کر اُس کی جزئیات حفظ کرنا اور پھر اُنہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے دہلی تک پہنچانا جہاں اُن کی ضرورت بہت شدید تھی۔

○

صبح اُٹھ کر سب نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ اجے ساہنی کا سر خاصا بوجھل تھا۔ رات کے نشے نے بڑا اثر دکھایا تھا۔ نہانے کے بعد وہ قدرے نارمل ہوا۔ صبح اُٹھ کر کافی دیر گئے تک وہ ٹھاکر کی محبت کو "سلام عقیدت" پیش کرتا رہا۔ وجے نے اُسے بتایا تھا کہ فوجی اُسے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اُس نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ اجے ساہنی اُسے جنگی ہوائی جہاز دکھائے اور اجے نے رات شراب کے نشے میں کوئی دس مرتبہ قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے نئے بھائی کو بہر صورت سب کچھ دکھائے گا۔

آج اس نے شام کو ڈیوٹی جائن کرنی تھی۔ یہ تو خان کو علم ہو ہی گیا تھا کہ اُس کا

ریڈار پر ہے جس کی خان کو تلاش تھی۔ ناشتے کے بعد کافی دیر تک وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔

"دوپہر کا کھانا ہم انبالے میں کھائیں گے بھائی جی" ـــــ اُس نے اجے ساہنی کو فرمائش کی۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" ـــــ اجے ساہنی تو جیسے اس دعوت ہی کا منتظر تھا۔

دونوں سورج چڑھنے کے تھوڑی دیر بعد ہی شہر کی طرف چل دیے۔ روانگی سے قبل خان اجے ساہنی کی بیوی اور اپنی "بھابی" کو سو روپے کا نوٹ دینا نہیں بھولا تھا۔ اُس نے اس بات پر بڑی شرمندگی کا اظہار کیا تھا کہ وہ اُن لوگوں کے لیے شہر سے کچھ نہیں لا سکا۔

انبالہ پہنچتے ہی اجے ساہنی اُسے لے کر ایک گھٹیا سے سینما ہال میں داخل ہو گیا۔ خان بھی اجے نے خود ہی خریدے تھے۔ باہر کسی انگریزی فلم کا بورڈ لگا رہا تھا۔ خان کے لیے یہ اطلاع نئی تھی کہ یہاں ہر روز سینماؤں میں چار سے پانچ شو روزانہ فلم دکھایا کرتے تھے۔

فلم کا آغاز بندے ماترم سے ہوا! خان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سینما ہال میں بیٹھے ہوئے بے درجے کے تماشائی بھی اس کے احترام میں فوراً کھڑے ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی اُس نے دیکھا تھا کہ ان لوگوں میں "بھارتی" ہونے کا احساس بہر حال موجود ہے۔

ترانہ ختم ہوتے ہی ایک مخش فلم پردۂ سکرین پر چلنی شروع ہو گئی اور خان کو جلد ہی محسوس ہو گیا کہ اجے اُسے یہاں کیوں لایا تھا؛ بے چارہ کارپورل جسے اپنی معمولی تنخواہ پر اتنا بڑا کنبہ پالنا پڑتا تھا، زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم تھا۔ اپنی فرسٹریشن کو دبانے کے لیے سوائے اس گھٹیا تفریح کے شاید اور کچھ اُس کے پاس نہیں تھا۔

دوپہر کا کھانا اُس نے اجے ساہنی کو ایک شاندار ہوٹل میں کھلایا۔ یہاں اُس نے

Scanned at the Digital Archive Center Abbas

بطور خاص اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اجے شراب بالکل نہ مانگے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیوٹی پر بھی وہ نشے کی حالت میں جائے! گو کہ اجے نے دبی دبی زبان سے ایک دو مرتبہ اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن خان نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی۔

اجے شاید فلمیں دیکھنے کا زیادہ ہی شوقین تھا یا پھر پہلے بے عزتے کی کسر آج اس نے پوری کرنا چاہی تھی۔ کیونکہ اس نے کھانے کے خاتمے پر دوسری فلم دیکھنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ خان بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کی ڈیوٹی جو شام سات بجے کے بعد شروع ہونے والی تھی تب تک اسے کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھے۔

اس دفعہ پھر اس نے فلم کا انتخاب خود ہی کیا تھا۔ یہ فلم نئی تھی اور خان کے لیے چونکا دینے والی بھی!

فلم شدید کی جنگ کے حوالے سے بنائی گئی تھی اور پاکستان کے خلاف خوب خوب زہر اگلا گیا تھا۔ خان نے دیکھا فلم کے دوران کئی مرتبہ سینما ہال میں بیٹھے تماشائیوں نے تالیاں اور کرش پاکستان کے نعرے لگائے۔

یہ سرد جنگ کا دور تھا:

بھارت نے مشرقی پاکستان میں خلیج گی کے فتنے کی بنیاد تو تقسیم ملک کے فوراً بعد ہی رکھ دی تھی لیکن اب صورتحال ایسی ہو چکی تھی کہ ہندوستان کھل کر اس فتنے کی پشت پناہی کر رہا تھا! بین الاقوامی فورم میں بھارت ننگا ہو کر بھی خود کو زہریلے پروپیگنڈے کے ہتھیار سے بے گناہ اور معصوم ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ سارا بھارت ایک جنگی جنون میں مبتلا تھا۔ ہر طرف پاکستان کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

فلم دیکھ کر جب وہ باہر نکلا تو اس کا دل خاصا بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے دو تین ہی میں اس قوم میں ہزار برائیوں کے باوجود جو ایک چیز دیکھی تھی اور جسے وہ ان کی مثبت بات کہہ سکتا تھا وہ تھی: پاکستان دشمنی۔

وہ بھی وہ جو اس پڑھ تھا۔ وہ جو پڑھا لکھا تھا اور وہ جو ابھی پڑھ رہا تھا یہ سب اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ پاکستان کو تباہ کر دیں! ان کے سینما ہال، ریستورانوں، گھروں، دفتروں کے باہر بڑے بڑے حروف میں "کرش پاکستان" "کرش پاکستان" لکھا ہوا تھا۔

اس کے برعکس اس کے اپنے ملک میں اقتدار کی سیاست کا کیا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے!۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔

○

سینما ہال سے نکل کر وہ دونوں اجے کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اجے نے اسے کہا تھا کہ وہاں کسی بھی رشتہ دار کو آنے کی اجازت نہیں پھر بھی وہ اپنے بھائی کو اپنے کسی افسر کی منت سماجت کر کے سب کچھ دکھا ہی دے گا لیکن اس کا جیتا اپنے پیارے دوست اجے کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

"یار کہتے کیوں نہیں۔ اس میں بھی دلیش کی کوئی بھلائی ہو گی جو ادھر کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ بس تم کل مجھے ہوائی اڈہ ہی دکھا دینا۔ مجھے کیا پتہ یہ ریڈار کمبخت کیا بلا ہے!"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی ——— اجے سانہی بولا۔

دونوں ایک بس میں بیٹھ کر اپنے سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں کے نزدیک اتر گئے۔ اندھیرا گہرا ہو کر پھیل چکا تھا لیکن خان کو گاؤں سے کچھ فاصلے پر بنے ایک اونچے ٹیلے پر ریڈار کا ایک انٹینا گولائی میں حرکت کرتا نظر آ ہی گیا تھا۔ اجے تو اسے دیکھ کر واپس لے جانے پر مصر تھا لیکن اس نے اپنی جان چھڑا لی۔

"میں جا رہا ہوں واپس جاتا ہوں۔ کل سرائے میں مل لینا۔ اگر مجھے کوئی اچھا آرڈر مل گیا تو پرسوں کے روز تمہارے گھر ہی ملاقات کو آؤں گا۔"

سے پیدا ہی چل دیا تھا۔ جبکہ وجے تھا کرنے واپسی کا اپنا علیحدہ راستہ ناپا۔ دونوں ایک دوسرے کو مڑ مڑ کر دیکھتے اور مسکراتے رہے پھر ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ——

لیکن نہیں —— اجے کی نظروں سے وجے مزید اوجھل ہو گیا تھا۔ وجے نے اجے پر نظر رکھی تھی۔ اُسے دُور جاتے دیکھ کر خان پیشاب کے بہانے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے سلسلے میں گھس گیا۔ پھر اُس نے بڑی تیزی سے سڑک عبور کی اور اب وہ اسی راستے پر دبے قدموں اجے ساہنی کا تعاقب کرتا جا رہا تھا۔ جس راستے پر اجے گیا تھا اس کی تمام خوابیدہ طاقتیں جیسے ایک ایک کر کے جاگ اُٹھی تھیں۔ یہاں سے آگے ساہنی کا صرف ایک بیوپاری نظر آ رہا تھا جس کا تعاقب وہ چیتے کی طرح دبے پاؤں کر رہا تھا۔ اب اُسے خطرہ کا احساس بھی نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔

اجے تو ان راستوں سے آشنا تھا اسی لیے وہ بڑے اطمینان سے چلتا چلا جا رہا تھا جبکہ خان کے لیے فی الوقت یہ راہیں اجنبی تھیں۔ وہ بڑے محتاط انداز میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔

کھیتوں کا سلسلہ اب ختم ہو گیا تھا۔ جھاڑیاں اور سرکنڈے شروع ہو گئے تھے جو اس بات کا واضح اعلان کر رہے تھے کہ یہاں سے ایئر فورس کا علاقہ شروع ہو چکا ہے۔

اب دونوں ایسے چوراہے پر پہنچ چکے تھے جہاں سے مختلف اطراف میں راستے پھوٹ رہے تھے۔ اجے اچانک ہی ایک راستے پر مڑ گیا۔ سامنے سے کچھ لوگ اونچی آواز میں گفتگو کرتے ادھر آ رہے تھے۔ یہ انجانی اندھیرا اتنا زیادہ نہیں پھیلا تھا کہ وہ خود کو محفوظ تصور کر لیتا۔ وہیں سرکنڈوں کی آغوش میں دُبک کر بیٹھ گیا۔

سامنے سے آنے والے شاید اجے سے شناسا تھے۔ وہ اونچی آوازوں میں ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ دو تین منٹ تک وہ باتیں کرتے رہے۔ خان کو ان

کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ یہ لوگ چھٹی کر کے جانے والی شفٹ کے ہیں۔ سات بجنے والے تھے اور اجے نے ان سے ملاقات کر کے اندازہ لگا لیا تھا اس لیے وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

وجے اُسی جگہ دُبکا رہا۔ کیونکہ بہت سے لوگ اس راستے پر اب آنے جانے لگے تھے۔ اجے کو گئے کافی عرصہ بعد سکون ہوا۔ پھر بھی وہ احتیاطاً وہیں بیٹھا رہا۔ کچھ عرصہ اور گن گن لینے کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دُور دُور تک فضا میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا! اس لوگوں نے اس ریڈار سٹیشن کو اتنی خوبصورتی سے کیموفلاج کیا ہوا تھا کہ ابھی تک یہاں ریڈار سٹیشن کے کوئی اثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

وہ بڑی احتیاط سے قدم دھرتا اندازے سے ایک طرف بڑھ رہا تھا۔ جب اچانک ہی اُس کا پاؤں تاروں کے ایک گچھے میں اُلجھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو خان کا دماغ جیسے ماؤف ہو کر رہ گیا۔ تاروں کے یہ گچھے احتیاطاً راستے میں پھینکے گئے تھے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان تاروں میں برقی رو ابھی نہیں دوڑائی گئی تھی ورنہ شاید اُسے اگلی سانس لینا بھی نصیب نہ ہوتا۔

ابھی تو اُس کی پتلون کا پائنچہ ہی پھٹا تھا، اگر اس نے چمڑے کے بوٹ نہ پہنے ہوتے تو شاید اب تک اُس کا پاؤں بھی کٹ چکا ہوتا —— کچھ خراشیں اُس کے پاؤں پر آئی تھیں۔

اپنا پاؤں خاردار گچھے سے نکال کر کچھ دیر تک تو وہ چپکا بیٹھا رہا پھر اٹھ کر قدم آگے بڑھائے۔ اس دوران راستے میں دو تین مرتبہ تاروں کے اور گچھے بھی آئے لیکن اب وہ ہوشیار ہو چکا تھا! جلد ہی اس بڑی بڑی جھاڑیوں کی حد بندی کے درمیان اُسے لکڑی کے پول بھی دکھائی شروع ہو گئے تھے جن پر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں —— یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ آپریشنل ایریا میں پہنچ چکا ہے۔

خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ وہ گھومتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ اُسے خاصا گڑھا نظر آیا جس کو توڑتا ہوا خان دوسرے ہی لمحے اندر پہنچ چکا تھا۔ وہ اب گھنی اور اونچی گھاس میں رینگ رہا تھا۔

گھاس میں اونچے اونچے درخت لگے ہوئے تھے۔ خان درختوں کے نزدیک پہنچ کر رکا اور زیادہ محتاط ہو گیا! ایک ایسے ہی درخت کے قریب سے جیسے ہی وہ آگے بڑھا! اچانک ہی زمین نے اُس کے قدم تھام لیے: درختوں کی اوٹ سے اژدھا کی طرح پھن پھیلائے اجے ساہنی نمودار ہوا تھا۔

○

اندھیرا گہرا ہو چکا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ خان کو اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور دکھائی نہ دیتا — اُس کے ہاتھ مشینی انداز میں اُوپر اُٹھتے چلے گئے۔ اجے کی "ہینڈز اپ" کہنے کی تکلیف بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

"چپ چاپ جدھر سے آئے ہو اُدھر ہی واپس چلتے رہو۔" اجے پھنکارا۔

ایک مسکراہٹ نہ چاہنے کے باوجود خان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

— یہ امر اس کے لیے باعثِ حیرت بھی تھا اور کسی حد تک باعثِ تسکین بھی کہ اجے نے اپنی آواز بالکل نیچی رکھی تھی — شاید وہ اس بات سے خوفزدہ تھا کہ دوسرا کوئی اُن کی موجودگی وہاں محسوس نہ کر لے۔ خان قدرے پُرسکون ہو کر گھوما اور اس طرف چلنے لگا جس سمت سے وہ یہاں پہنچا تھا۔

اجے نے اُس کے اور اپنے درمیان کم از کم پانچ سات قدم کا فاصلہ رکھا تھا۔ خان اگر چاہتا تو اُس فاصلے سے بآسانی فائدہ اٹھا کر اُسے ڈاج کر سکتا تھا لیکن وہ ابھی اس کھیل کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسلسل بھاگ دوڑ نے اُس پر قدرے جھنجھلاہٹ بھی طاری کر دی تھی۔

دونوں بلی کی طرح دبے قدموں انتہائی احتیاط سے بغیر آواز پیدا کیے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اب کھیتوں کے وسیع سلسلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ جگہ مذاکرات کے لیے موزوں تھی۔

خان نے چلتے چلتے ہاتھ گرا دیے۔

"ہاتھ اٹھائے رکھو تم — ابے ساہنی نے دھمکی دی۔

"دیکھو بھیا! اول تو مسلسل اُٹھائے رکھنے سے میرے بازو ہی تھک گئے ہیں اور دوسری بات یہ کہ تمہارا ریوالور خالی ہے یا اگر لوڈڈ بھی ہے تو تم گولی نہیں چلا سکتے۔"

خان کا لہجہ خاصا پُرعزم تھا اور اب وہ باقاعدہ اُس کی طرف مُنہ کیے کھڑا تھا۔

کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ کارپورل اجے ساہنی نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن وہ ابھی تک اپنے پر قابو نہ پا سکا تھا۔

"میں کبھی کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہیں رہا کارپورل اجے ساہنی! میری حیثیت کھیل کے اُس میدان میں رینگنے والے کیڑے جیسی تھی اور آج لاکھوں میں کھیل رہا ہوں تو اس کی وجہ صرف میرے اندازے کی درستگی ہی ہے۔ پھر تم یہ کیوں بھول گئے کہ اگر یہ کوئی جرم ہے تو اس میں تمہارے ساتھ تم بھی اس میں برابر کے شریک ہو۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو — کارپورل واقعی بوکھلا گیا تھا۔

"بے وقوف یہ بات مت بھولو کہ میں نے تمہارے ساتھ مسلسل چوبیس گھنٹے گزارے ہیں اصلاً کوئی افسر اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ تم اس دوران غلط فہمی میں مبتلا رہے ہو۔ اور تم کوئی شریف آدمی (شہری) سمجھتے رہے — تم میرے ساتھ اس جرم میں برابر کے گرفتار ہو جاؤ گے — اجے کے چہرے پر باقاعدہ ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ اور شاید گناہ ہی مارے جاؤ۔"

"دیکھو مجھے بلیک میل مت کرو۔ میں تمہیں....."

"ہاں! ہاں تم مجھے گرفتار کروا کے انعام حاصل کر لو گے۔ مسٹر اجے ساہنی میں نے کہا

کر نیاں نہیں کھیلیں۔ بیوقوف مت بنو۔ مطلب کی بات کرو۔ اپنا حصہ لو اور اس کھیل سے نکل جاؤ۔" خان اُسے سوچنے کا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

"دیکھو دے بھیا! میں بھی تمہیں اسی لیے یہاں لایا ہوں۔ مجھے تم پر پہلے ہی روز شک ہو گیا تھا۔ میں نے پورے دو سال آرمورڈ یونٹ (انٹیلی جنس) کی ہے۔ آج مجھے چھٹی تھی اور میں جان بوجھ کر تمہیں یہاں لایا ہوں۔"

"بس زیادہ چالاک نہ بنو۔" خان کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا قہر چھپا تھا کہ اجے میں ریوالور ہونے کے باوجود اجے کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ "مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے! تم نے تو یہ چاہا تھا کہ مجھے بیوقوف بنا کر مجھ سے جان چھڑا لو گے کا وعدہ کر کے رقم بٹور لو گے — رقم تمہیں ضرور ملے گی مسٹر اجے۔ تمہاری توقع سے بھی زیادہ — لیکن یوں نہیں —" خان نے دوبارہ اُسے ڈانٹ دیا۔ وہ اجے کے ذہن کی مرمّت کر رہا تھا اور اُسے کچھ سوچنے کا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

"کیسے ملے گی؟" اجے نے حلق سوکھتے ہوئے پوچھا۔

"کام کرنا ہوگا — تمہارے لیے یہ معمولی کام ہے اور کام بھی آج اور ابھی کرنا ہوگا کیونکہ میرے پاس آج کے بعد شاید اس کام کے لیے وقت نہ ہو۔"

"وہ کیا کام ہے؟" اجے نے بمشکل ہی دریافت کیا۔

"مجھے آج رات ہی اس ریڈار کا بلیو پرنٹ چاہیئے۔ تم جانتے ہو اس وقت ایئر فورس کے دفاتر بند ہیں — جاؤ اور کوئی ایکر سکیچ لے آؤ۔ اسی میں تمہارا بھلا ہے۔" خان کو باقاعدہ حاکم بن بیٹھا تھا۔

لیکن ابھی یہ کیسے ممکن ہے۔ آج میری چھٹی ہے۔ میں کل....."

"مسٹر اجے۔ کل نام کال کا۔ تم بچے نہیں ہو۔ کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہو۔ دیکھو پرماتما کے لیے کل تک کا وقت دے دو۔ میرے لیے ابھی یہ ناممکن ہے۔"

"ایک شرط پر کل تک کا وقت دے سکتا ہوں۔" خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کہیے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

"کل تک تمہاری سروس بک میرے پاس رہے گی۔"

خان کے اس فقرے نے کارپورل اجے ساہنی کو لرزا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

بلیو پرنٹ کا حصول اُس کے لیے بالکل آسان تھا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔ وہ پیسوں کے لیے بھی باؤلا ہوا جا رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خان بُری طرح اُس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا، سروس بک کو ایک منٹ کے لیے بھی خود سے علیحدہ کرنا کتنا سنگین جُرم ہے لیکن روزانہ کون چیک کرتا ہے، اُس نے سوچا۔ آٹھ گھنٹے ہی تو بات ہے۔

"ٹھیک ہے۔" اُس نے ہامی بھر لی۔

خان نے اپنا ہاتھ دوستی اور ڈیل کے لیے اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اجے کے ہاتھ کی لرزش وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ اُس نے ریوالور اب اپنی جیب میں واپس رکھ لیا اور بیگ پاکٹ سے سروس بک نکال رہا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اُس نے سروس بک خان کی طرف بڑھا دی۔ خان نے ایک سرسری سی نظر اُس پر ڈالی۔

"ہم یہاں سے الگ ہو جائیں گے۔ تمہاری ڈیوٹی پانچ بجے آف ہوتی ہے۔ میں چھ بجے سے ساڑھے چھ بجے کے درمیان تمہیں اُسی بس سٹاپ پر ملوں گا جہاں ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔" اب ساہنی نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ خان "شب بخیر" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

اجے بے بسی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زخمی چڑیا کی مدد کرنے کے لیے وہ خود ہی پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائے گا۔

ایک لمحے کا توقف کیے بغیر وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا اور اجے ساہنی آتے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اندھیرے میں چند قدم دور تک تو اس کا بیولا نظر آتا رہا پھر وہ تاریکی کے حصے کر کے رپورل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ اُس کی خود اعتمادی کا کمال تھا جس نے کہ پورل اجے ساہنی کے سارے کھیل کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا تھا اور وہ اُس کے جال میں پھنس گیا تھا اگر خان کو واسطہ کسی معمولی کے آدمی سے پڑا ہوتا تو معاملہ اُلٹ بھی ہو سکتا تھا۔

"سردس بک" اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اگرچہ خان مطمئن ہو چکا تھا لیکن اعتماد کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا تو جیسے اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اُسے اپنی تربیت کا ایک ایک سبق ازبر تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ کہ سے بڑی بُری خود اعتمادی بھی کبھی کبھی بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اجے ساہنی کی بغلیں اُس کے ہاتھ میں تھیں لیکن اُس نے اپنی گرفت حالت پر ڈھیلی نہ ہونے دی۔

کھیتوں کے نیچوں نیچ چلتا وہ اب سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اُس نے اجے ساہنی کی طرح سڑک کا جائزہ لینے کے بعد اسے عبور کر لیا اور پھر کھیتوں کے سلسلے تک پہنچ گیا۔

راستے میں تین چار دیہات بھی آئے لیکن خان انہیں نظر انداز کر کے آگے نکل گیا۔ اُس نے دورانِ تربیت اتنی مشق کی تھی کہ اس طرح مسلسل پندرہ بیس گھنٹے بھی اگر وہ بھوکا رہتا تو اُسے کوئی فرق نہ پڑتا۔

بالآخر آدھی رات کے بعد وہ تھوڑی دیر سستانے کے لیے ایک ٹھکانہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ کسی کھیت کے درمیان بنی وہ جھونپڑی تھی جو کسان عموماً دن کی دھوپ سے بچنے یا کچھ دیر آرام کرنے کے لیے بنا لیا کرتے ہیں۔ جھونپڑی کا اُس نے محتاط اندازے سے جائزہ لیا اور اس یقین کے بعد کہ اس پاس کوئی نہیں ہے وہ اندر چلا

گیا۔ زمین پر کر سیدھی کمر کے کو لیٹ گیا۔ اُس کے بازو سے بندھی گھڑی کی سوئیاں رات کے ڈھائی کا اعلان کر رہی تھیں۔

"صبح چار بجے تک" ــــ اُس نے اپنے آپ سے کہا اور لیٹ گیا۔

پیشتر اس کے اُس نے اکثر کی تھی جس کی مدد سے وہ ایک خاص وقت پر بیدار ہونے میں اب ہو جاتا تھا ــــ بمشکل دس پندرہ منٹ بعد ہی وہ نیند کی دیوی کے بازوؤں میں جھولا جھول رہا تھا اور ٹھیک چار بجے اُٹھا۔

جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے سے اُس نے پانی پیا پھر وہاں کے وہیں نماز ادا کی۔ اس دیارِ غیر میں گو کہ خدا کی یاد اُسے پہلے سے زیادہ آنے لگی تھی لیکن اُس روز نوافل پڑھتے ہوئے جو روحانی سکون اُس نے محسوس کیا وہ اُسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی میسر نہ آیا تھا۔

خدا کے حضور بندگی گزارتے ہوئے اُس کا ذہن ماضی کی طرف پلٹا اور اُسے یاد آ گیا کہ جس جس پر وہ آج چھپ کر نماز ادا کر رہا ہے کبھی اُس کے اجداد کی آماجگاہ رہی تھی۔ یہ فضائیں اللہ کی وحدانیت کا درس صدیوں سے پڑھتی چلی آ رہی تھیں اور آج وہاں کی مٹی سے شہیدوں کے لہو کی مہک اُٹھ رہی تھی۔

خان اُن سرفروشوں کو یاد کر رہا تھا جو یہاں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے پہنچے تھے۔ اس لیے کہ نگر کدے میں ایمان کی شمع روشن ہو جائے ــــ اُن کے لہو سے روشن ہونے والے چراغوں کی لو میں ہی آج عابد خان کو اپنی منزل تلاش کرنی تھی۔

جب وہ ذکر الٰہی سے فارغ ہو کر مائم سفر ہوا اک ولولہ تازہ بھی اُس کے اندر موجزن تھا۔ وہ ایک انجانی کائنات جیسی جنس کو تسخیر کرنے کا عزم لے کر چلا تھا۔

○

صبح زندگی بیدار ہونے سے پہلے وہ سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ جان بوجھ کر

اُس نے دو تین بسیں گزر جانے دیں ان کے بعد آنے والی ایک بس میں سوار ہو کر وہ
پہنچ گیا۔

شہر کے آثار ہی میں وہ اُتر گیا تھا! ایک ویلفیئر ڈھابے پر اُس نے ڈٹ
کیا اور گیارہ بجے تک کا وقت ایک سرگاہ میں گزارنے کے بعد سینما ہال میں گھس گیا۔

دوپہر کا مختصر سا کھانا اُس نے چار بجے کھایا اور پیدل ہی اب اپنی "آر۔ وی" (جاسوس بلا کرتے ہیں) کی طرف جا رہا تھا۔ احتیاطاً اُس نے پچھلے چار پانچ روز سے بڑھی ہوئی ڈاڑھی سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اور کلین شیو ہونے کے بعد اب درمیانے سے کوئی کلرک نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں پر لگا چشمہ اُس نے تھوڑی دیر پہلے ہی خریدا تھا۔ کے سفید شیشے بادی النظر میں یہی ثابت کرتے تھے کہ اُس کی نظر بہت کمزور ہے
چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھوں کی موجودگی اور نئی ہیٹ نے اُس کا حلیہ خاصا
دیا تھا۔ کارپورل کی آمد سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ بس سٹاپ کے نزدیک
تھا۔ وہ یہاں بے مقصد ہی نہیں چلا آیا تھا۔ اُسے اپنی تربیت کے مطابق اس بات
لینا تھا کہ اس کے لیے یہاں پہلے ہی سے کوئی جال تو نہیں بُنا گیا؟ اگر کارپورل
کو اس نے ٹیک سیل کر کے پھنسا لیا تھا تو یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود مشکوک ہو گیا۔
ایئر فورس والے اجے ساہنی ہی کی نگرانی نہ کر رہے ہوں ——!!

اجے ساہنی کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کو بھی اُس نے نظر انداز نہیں
ممکن تھا کہ اُس نے انٹیلی جنس کو اصلیت سے آگاہ کر دیا ہو اور اب وہ لوگ
کے منتظر ہوں۔ ایک گھنٹے کی مسلسل جستجو کے بعد بھی اُسے یہاں فی الحال کوئی
شخصیت نظر نہیں آئی تھی۔

اب اُس کی نظریں شہر کی طرف سے آنے والی بسوں پر جمی تھیں۔ چند منٹ
نے اُسے کو ایک بس سے برآمد ہوتے دیکھا —— اُسے یہ دیکھ کر بڑی خوشگ

ی کرنا پڑا۔ کہ اجے نے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے۔ پہلے اُس کا دھیان تصویر کے
ا ہی کی طرف گیا تھا، لیکن اُسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ اقدام اجے ساہنی نے
احتیاط کے طور پر ہی کیا ہو گا۔

خان خود ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ اجے کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اجے بس سے اُتر
ل چلتا ہوا اُس بس سٹاپ کی طرف آ رہا تھا جہاں سے اُسے گاؤں جانے کے لیے
ا سکتی تھی اور جہاں اُس نے "وجے" سے ملاقات کرنی تھی۔ بس سٹاپ کی طرف
لے وہ چور نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اُس کی معمولی حرکت
ان کی کڑی نظریں لگی تھیں۔ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کو
ا ئے اور خان کی نظریں نہ آ سکے۔ بس سٹاپ پر پہنچ کر وہ ایک قدرے ویران گوشے
ط ہو گیا۔

اجے ساہنی نے اب بے چینی سے گھڑی کو بھی بار بار دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ قریباً دس
ا ج گزر گئے اب کارپورل کی پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ اس نے بس سٹاپ کے
حلقہ حاشیے میں ٹہلنا بھی شروع کر دیا تھا۔

اس منٹ کے بعد خان نے اپنے نزدیک سے گزرنے والے ایک سائیکل رکشہ کو رُکنے
ا ا اور اُسے ایک منزل بتا کر سوار ہو گیا۔ اُس نے سائیکل رکشہ والے سے کارپورل اجے
ے قریب پہنچنے پر اتنے اچانک بریک لگوائے تھے کہ اجے ساہنی کے علاوہ خود رکشہ
ا ھی اکسا کر رہ گیا۔

ا بھیا! آؤ ناں۔ اِدھر آؤ۔ ارے کہاں گھوم رہے ہو؟" اس نے رکشہ میں بیٹھے
ا ئی۔

ا بوذر رہ گیا۔ پھر اُس کے نزدیک پہنچا۔ اُس کے حواس ابھی تک مختل تھے۔ خان
ا ا نہ پکڑ کر قریباً کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ پہلی نظر میں تو اجے اُسے

پہچان ہی نہیں پایا تھا جیسے ہی وہ خان کے ساتھ بیٹھا، خان نے سائیکل رکشہ والے کو جلدی چلنے کا حکم دیا اور اُس کی ٹانگیں حرکت میں آگئیں۔

○

"کیا حال ہیں بھیا! ٹھیک تو ہو نا ــــ؟" اُس نے حیران اجے کو اپنی طرف دیکھتے پا کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں۔ سب ٹھیک ہو گیا ــــ" وہ انگلی پر کھایا ہوا تھا۔

"ہر شش میں آؤ ــــ کیوں بچوں ایسی حرکتیں کر رہے ہو؟" خان نے اُس کی طرف ہوئے اجے کے کان میں سرگوشی کی۔

جواب میں اجے ساہنی نے خوامخواہ دانت نکال دیے۔ خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش میں اُس کی شکل پہلے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز نظر آنے لگی تھی۔ لیکن جلد ہی اُس نے قابو پا لیا۔

"کام ہو گیا؟" ــــ خان نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں" ــــ اجے نے بھی مختصر سا جواب دیا۔

سائیکل رکشہ نے جیسے ہی گاندھی باغ کا موڑ کاٹا خان نے اُسے رُکنے کو کہا۔

"بس یار ایک کام یاد آ گیا ــــ اُس نے رکشہ والے کو پورے پیسے تھما دیے بے چارا واپسی پر بڑبڑا کر بھی اُس کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

دونوں نپے تُلے قدموں سے چلتے باغ میں داخل ہو گئے۔ داخلے کے لیے ما جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس دوران اُس نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کا تعاقب نہیں کیا جا رہا۔ اجے ساہنی حسب معمول کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ ایک ویران گوشے میں دونوں درخت کے نیچے رکھی پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔

اجے نے بھی احتیاطاً چاروں اطراف کا جائزہ لیا اور کچھ کہے سُنے بغیر اپنے

Scanned

بیگ سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر خان کی طرف بڑھا دیا۔ خان نے بڑے اطمینان سے اُسے کھولا اور کن انکھیوں سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اُسے دیکھنے میں مگن ہو گیا۔

ریذیڈنسی کی تمام تفصیلات اُس کے سامنے پھیلی لکیروں میں بکھری پڑی تھیں اور وہ اس عطیہ خداوندی پر احساس تشکر سے سرشار ہو رہا تھا۔

"ونڈرفل! تم تو یار بڑے کام کے آدمی ہو" خان نے کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"میری پاس بک" ــــ اجے ساہنی بولا۔

"یہ لو ــــ اور ہاں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کی مکمل نقل میرے پاس رکھا ہے"

"کیوں؟" ــــ اجے کے منہ سے گھبراہٹ کے مارے اچانک ہی نکل گیا۔

"تاکہ تم آئندہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو"

"دیکھو مجھے دھمکاؤ نہیں ــــ میں نے یہ کام تمہاری بلیک میلنگ سے ڈر کر نہیں صرف اس کے لیے کیا ہے۔ مجھے بھی تمہاری طرح دولت اکٹھی کرنے کا شوق ہے"

"بری نہ بات ــــ اس کا مطلب ہے ہم مستقبل میں اچھے دوست ثابت ہوں گے"

"ہاں" ــــ اجے کا لہجہ قدرے مضبوط تھا ــــ "اگر پہلا سودا اچھا ہوا"

"کیوں نہیں ــــ کیوں نہیں" ــــ خان نے اپنی دوسری جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

یہ چھوٹے نوٹ تھے۔ دس دس روپے والے اور ایک ہزار روپیہ ــــ لیکن اجے کے لیے یہ لاکھوں سے کم نہیں تھے۔ اُس نے زندگی میں اتنی بڑی رقم کبھی شاید دیکھی ہی نہیں تھی۔ خان نے محسوس کیا جیسے واقعی اس کی باچھیں کھل گئی ہوں۔ اُس کے لیے باعث تسکین تھا کہ ابتدا ہی میں اُسے ایسا شاندار "مقامی دوست" میسر آ گیا تھا۔

"ویسے بھائی صاحب تم ہو کون ـــــ ؟" اجے نے نوٹ جیبوں میں ٹھونستے ہ
پوچھا۔

"آخری مرتبہ سن لو بھارتی ناگرک (شہری) ہوں اور آئندہ کبھی یہ فضول سو
نہ پوچھنا۔"

"لیکن کم از کم مجھے یہ جاننے کا حق تو ہے کہ میں کس ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

جواب میں خان نے اُس کے سامنے ایک بہت بڑی عالمی دہشت کی ایجنسی کا نا
لے کر اُسے سہرا بوکھلا دیا تھا۔ اجے ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ خان پاکستانی انٹیلی جنس
کوئی مقامی ٹاؤٹ ہے لیکن جب اُسے علم ہوا کہ اس کا واسطہ دنیا کی سب سے بڑی جاسو
ایجنسی سے پڑا ہے تو وہ خود حیران رہ گیا ـــــ اُس نے اپنے "پہلے اہم شکار" کو یہ بتا
کہ اس بزنس میں کسی کو اپنا اصل نام اور پتہ نہیں بتایا جاتا اور آئندہ وہ خود ہی اجے سے
رابطہ قائم کرے گا۔

اس دوران اُس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اُسے یہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ کہ
بھی راز منکشف ہونے کی صورت میں اُسے بہرحال جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے

اجے ساہنی سے الگ ہو کر وہ سیدھا انبالہ ریلوے سٹیشن پر آیا۔ جب وہ گاڑی نیا
ہوا تو گزشتہ چوبیس گھنٹے کے واقعات ایک ایک کر کے اُس کے سامنے آنے لگے۔ کرنل پاکستان کے
اُس کے کانوں میں گونجتے تو شدہ کے شدائے لہو کی مہک بھی اُس کا حوصلہ بڑھانے لگتی۔

اگر وہ لوگ اس مرتبہ بڈار سٹیشن کو کبھی یہاں سے ہٹا بھی لیتے تو بھی اس
اندرونی ساخت کی مکمل ڈرائنگ اُس کے ٹھک کے پاس محفوظ تھی۔

کچھ باتیں، کچھ گھاتیں

ترین رات کافی دیر گئے اور اپنے مقررہ وقت کے قریباً تین گھنٹے بعد چلی۔ یہ تین گھنٹے
اجے بھی باقی مسافروں کی طرح بڑی اذیت سے کاٹے تھے۔ لیکن یہ تو یہاں کا معمول تھا۔ راستے
میں کوئی رکاوٹ آنے کی وجہ سے ڈاک گاڑیاں لیٹ آ رہی تھیں اور تمام گاڑیاں
گزرنے کے بعد ہی اس پسنجر ٹرین کی باری آتی تھی۔

اس مرتبہ خان نے تیسرے درجے میں سفر کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے چہرے سے
داڑھی غائب ہو چکی تھی اور کرتے پائجامے میں ملبوس سر پر بازار سے خریدی ہوئی کھدر کی
ٹوپی اور گرم چادر اوڑھے وہ کوئی سماجی کارکن یا پھر منسٹر کا سیکریٹری دکھائی پڑتا تھا۔
ڈبے کے اندر ہی میں خوش قسمتی سے اُسے خالی بنچ اونگھنے کو مل گئی تھی۔

پرانی دلی کے سٹیشن پر جب یہ پسنجر ٹرین پہنچی تو رات کی سسکیاں دم توڑنے لگی
تھیں۔ سورج نے اونگھتی دہلی کے کارخانوں کی مہربلب چمنیوں کی اوٹ سے سر نکالنا شروع
کر دیا تھا لیکن سڑکیں ابھی تک ویران تھیں۔

انبالہ سے وہ تھکاوٹ سے سوتا ہوا آیا تھا۔ محض دو تین گھنٹے کی اس کچی پکی نیند نے بھی
اس کی کسلمندی دور کر دی تھی اور اب وہ خود کو خاصا ہشاش بشاش اور تازہ دم
محسوس کرنے لگا تھا۔

پلیٹ فارم کے دونوں اطراف موجود گرمھوں میں اُس نے ہاتھوں میں گڑویاں اٹھائے

ایک ہجوم بے کراں کو اُترتے دیکھا تھا ـــــ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق اُس نے بچپن میں کہانیاں سُنیں، ٹریننگ کے دوران میں تصویریں دیکھیں اور آج اپنی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

مُنہ سے زام رام پہتے ان انسانی بھیڑیوں نے اپنی بغلوں میں چھُرے دبا رکھے تھے اور وہ اصل میں یہاں اسی لیے تو آیا تھا، کہ ان انسان نما بھیڑیوں کی بغلوں میں چُھپی خنجریاں سے اپنی حکومت کو باخبر کر سکے ـــ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ اپنی فطرت کے عین مطابق پیٹھ میں خنجر گھونپ دیں۔

پُرانی دہلی ہی میں اُس کے لیے آج پہلے اور دوسرے وقت کی دو "آر۔ وی" رکھی گئی تھیں! اگر وہ صبح دیر سے پہنچتا تو شام کے بعد دوسری جگہ "مقامی دوست" اُس کا منتظر ہوتا۔ حُسنِ اتفاق سے اُسے دونوں "آر۔ وی" کی سہولتیں حاصل تھیں۔

امانت کا جو بارِ گراں وہ انبالے سے لے کر یہاں تک آیا تھا اُسے جلد از جلد انہیں ہاتھوں تک پہنچانے کے لیے اُس نے شام کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے بتایا گیا تھا "صبح گیارہ بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک اُسے مقبرۂ ہمایوں پر اپنے مقامی دوست سے پہلی ملاقات کرنی تھی"۔

باقی مسافروں کی طرح اُس نے بھی بڑے بوجھل قدموں سے ریلوے اسٹیشن کا آہنی پُل عبور کیا۔ اِس پُل پر شاید ایک انچ جگہ بھی ایسی خالی نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کسی نے کچھ لکھا نہ ہو۔ ایک فقرہ جو زیادہ تواتر کے ساتھ ہر جگہ تحریر تھا وہ "بھارتیوں کے ایک ہونے" سے متعلق تھا۔ یہاں تسلسل سے "ایکتا" کا فقرہ دیکھ کر اس شہر میں آنے والے کسی بھی اجنبی مسافر پر پہلا تاثر یہی قائم ہوتا تھا کہ جیسے حکومت اس ملک میں بسنے والے درجنوں مذاہب کے پیروکاروں کو زبردستی "ایک قوم" بنانے پر تُلی ہوئی ہے۔

پُل کے دوسری طرف والی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا سکھ "فلگر" مسافروں کے ٹکٹ

رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر کچھ ہندو نوجوانوں نے جان بوجھ کر سگریٹ سُلگا لیے تھے ۱۰۰ جزوں کا پرانا زور لگا کر بوڑھے سکھ کی طرف دھواں اُچھالنے لگے تھے۔ یہ دیکھ ۱۰۰ اس ہوا کہ "ایکتا" کا درس "آخر بھارت سرکار اتنی شدت سے کیوں دیتی چلی آئی ہے! لے دھوئیں سے گھبرا کر بوڑھا سکھ ٹکٹ کلکٹر ہجوم کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر غائب ہو ۱۰۰ اس کے تعاقب میں ابھی تک ہندو سکریٹ نوش نوجوانوں کے قہقہے گونج ۱۰۰

۱۰ ی اڈے کے ایک ویشنو ہوٹل میں اُس نے ہلکا سا ناشتہ کیا اور اِس بس میں سوار ۱۰۰ ولی کی طرف جاتی تھی۔ دہلی کی خوابیدہ سڑکوں پر زندگی اب بھرپور انگڑائی ۱۰۰ ہو چکی تھی۔ انسانوں کا ایک ندی نُما سیلاب کے ریلے کی طرح ایک سے دوسری ۱۰۰ رہا تھا۔

۱۰ ولی کے نزدیک سکاؤٹ کیمپ کے قریب سے گزرتے ہوئے جب اُس کی نظریں سکاؤٹ ۱۰۰ اِس جھاڑیوں کے نیچے دبی ہوئی چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی پرانی قبروں پر پڑیں۔ ۱۰۰ اِس یہاں سے ہر گزرنے والے کو اپنے دیدۂ عبرت نگاہ ہونے کی دُہائی دے رہی ۱۰۰ ہتے ہوئے بھی وہ چند لمحوں کے لیے وہاں رک گیا۔

اُسے یاد آ گیا۔ تاریخ کے اُستاد نے انہی قبروں کے متعلق بتایا تھا: "کبھی یہ میدان جس ۱۰۰ سکاؤٹ کیمپ لگا ہوا ہے مقبرۂ ہمایوں ہی کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا"۔ وہ سوچنے ۱۰۰ قبریں بھی شاید اُنہی بدقسمت مُغل شہزادوں کی ہی ہوں گی جو جنگِ آزادی کے ۱۰۰ یہاں پناہ لینے چلے آئے تھے ـــ اور جنہیں فرنگی غنڈوں نے شہید کر ڈالا۔

اس ماحول میں وہ ہاتھ اٹھا کر اُن کے لیے دعائے خیر تو نہ کر سکا لیکن اِس کا دل ۱۰۰ کے آنسو رونے لگا تھا اور اس کے دل کی گہرائیوں سے راہِ آزادی کے ۱۰۰ ۱۰۰ ازوں کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں جنہوں نے اپنا آج آنے والی مسلمان

Scanned and ... by Qamar Abbas

نسلوں کے کل کی نذر کر دیا تھا۔

○

ایک سائیکل رکشہ کے ذریعے تھوڑی دیر بعد ہی وہ شاہجہان آباد سے کوئی ڈھائی میل جنوب کی طرف ہمایوں کے مقبرہ میں پہنچ گیا۔

مقبرے کی عمارت دیکھ کر پہلے تو وہ واقعی دنگ رہ گیا: روئے زمین پر ایسی ... کی نظیر تلاش کرنا ممکن نہیں تھا ــــ سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی یہ حسین عمارت اپنے ... میں کئی قبریں سمیٹے نہ جانے کب سے اسی طرح ایستادہ کھڑی تھی۔ اس مقبرے کو فردوس بریں کہا گیا تھا اور خان اندازہ لگا سکتا تھا کہ ایسا کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔

لیکن اب تو عالم ہی اور تھا۔ وسیع و عریض اندرونی احاطے میں چاروں طرف زوال عمارت کے آثار بکھرے دکھائی دیتے تھے۔ نہ کوئی نہر نہ آبشار نہ فوارہ نہ حوض، نہ پھول، نہ پھل، نہ گلزار نہ اس کے رکھوالے۔ خستہ حال مرکزی عمارت کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا تھا جس کے پچھلے دروں کے گھپ اندھیروں میں دن کے وقت بھی چمگادڑیں دیوار... سر پٹخ رہی تھیں ــــ ہر سو ایک دہشت، ایک نامرادی اور نحوست طاری تھی۔

اس مقبرے نے ایک بے نام سی یاسیت خان پر طاری کر دی تھی۔

مقبرے میں مقامی لوگ بہت کم اور غیر مقامی بہت زیادہ نظر آ رہے تھے ــــ ... یادداشت کے سہارے باغ کے کونے میں رکھی ایک لوہے کی بنچ پر بیٹھ گیا! ایک ... والا لڑکا کب سے اس کا منتظر وہاں دوسرے کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ خان کو دیکھتے ... تیزی سے اس کی طرف دہلی کی مخصوص کرخنداری زبان میں دال کی صفت بیان ... اور نہ چاہنے کے باوجود خان نے اس سے دال کا پیکٹ خرید لیا۔

لڑکا اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا واپس چلا گیا ــــ خان کا دل بالکل کچھ کھا ... کو نہیں چاہ رہا تھا۔ یہاں اس مزار کے احاطے میں بیٹھ کر اسے اپنا سب کچھ ...

... ہوا سا محسوس ہوا جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا ــــ کہ اس احاطے میں موجود ... قبروں کے کھنڈرات سے اپنی قوم کا شاندار ماضی بیدار ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ قرونِ ... کے خلیہ مکرانوں کا جاہ و جلال یہاں کی ایک ایک سال خوردہ اینٹ سے جھلکتا تھا، ... ان ماضی کی تاریخ کے کھنڈرات میں پناہ لینے کے بجائے حال کی چیرہ دستیوں کا ... کرنا چاہتا تھا۔

ٹھیک گیارہ بجے اس نے اپنی جیب سے ایک نیلے رنگ کا رومال نکالا اور دہلی ... کے جوان لڑکوں کے سے انداز میں اسے باندھ لیا۔ لوہے کی اس ٹھنڈی بنچ پر اپنے ... اس نے اپنی دوسری جیب سے چارمینار سگریٹ کی ایک ڈبی اور ماچس نکال کر ... اور لب و دال سے بے بہرہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

... گیارہ بجے تک اس کے دل کی دھڑکنوں نے اپنی رفتار بڑھا لی تھی۔ اس ... وہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے کوئی اچانک ہی اس کے پیچھے سے نمودار ہوا! نووارد ... سے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی اور اس سرخ پگڑی کے نیچے ایک نیلے رنگ ... اسی کپڑے کی بنی ہوئی پٹی بھی دکھائی دے رہی تھی جیسا کہ اس کا رومال تھا۔

... ست سری اکال جی: آنے والے نے بڑی بے تکلفی سے اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے ... اب سکھ کا اتنا احترام تو کیجئے مہاراج کہ 'چارمینار' جیب میں رکھ لیں: اس نے ... اپنی پہچان کرانے کے لیے پہلا کوڈ ورڈ استعمال کیا۔

... گر نا سردار جی! لیکن مینار تو ایک بھی جیب میں نہیں رکھا جاتا۔ آپ چار کی بات ... خیر چھوڑیے ایک چار کے چکر میں کیا پڑنا۔ کیا شبھ نام ہے آپ کا؟"

... سنگھ ــــ جواب نے اس کے تمام شکوک ختم کر دیے۔

... راج کہتے ہیں: خان نے اپنا کوڈ نام دہرایا۔

... ہم فقروں کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی شناخت مکمل کروا دی تھی

نوراد سکھ نے اُسے وہاں سے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں پیدل چلتے آپس میں بے تکلفی سے باتیں کرتے باہر تک آگئے۔ ایک نزدیک ہوٹل شاید گیان سنگھ نے پہلے ہی سے اس مقصد کے لیے تاڑ رکھا تھا۔ خان کو وہ اُس ہوٹل کے ایک میلے کچیلے کیبن میں لے آیا۔

چائے کا آرڈر دیکر دونوں نے ایک ایک لفافے کا تبادلہ کیا: خان والے لفافے میں ریذرسٹیشن کا بلیو پرنٹ، سیف ہاؤس کا رادر اجے ساہنی کے متعلق معلومات درج تھیں اور گیان سنگھ والے لفافے میں اُس کے لیے تازہ ہدایات اور احکامات تحریر تھے۔

دونوں نے ایک بات بھی فالتو نہیں کی تھی اور جیسے ہی خان نے چائے کی پیالی ختم کی اُس کے ہمراہی نے کھڑے ہوکر دست سری اکال کہتے ہوئے اُس کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔

—— یہ اشارہ تھا اُس کے لیے یہاں سے چلے جانے اور گیان سنگھ کو تنہا چھوڑ دینے کا۔ دم رخصت اُس نے گیان سنگھ کی آنکھوں میں نمی تیرتی ہوئی محسوس کر لی تھی۔

گیان سنگھ سے الگ ہوکر وہ بھی قدرے پریشان سا ہو گیا تھا۔ جانے یہ کون تھا، اس کا نام کیا تھا؟ اُس کی آنکھوں میں تیرتی نمی نے اِس بات کا احساس تو خان کو دلا دیا تھا کہ گیان سنگھ نے بھی اسکی طرح اپنی شخصیت پر جانے کتنے خول چڑھا رکھے ہیں اور وہ کوئی غیر نہیں اُس کا ہی ہم وطن اور ہم مذہب ہے! جانے اِس جیسے کتنے پاکستانی اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے یہاں سرگرم عمل ہیں! یہ لوگ —— دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے وطن کی آنکھیں بنے یہاں بھیس بدلے وطن کے مفادات کی نگرانی کر رہے ہیں —— جانے اس راہ پُرخار میں کتنی صعوبتوں کا سامنا انہیں کرنا ہوتا ہوگا۔ سائکرا اپنی جان سے بھی گزرتے ہوں گے —— لیکن کون یاد رکھتا ہوگا انہیں۔ کیسے احساس ہوگا اس بات کا کہ کوئی جیالے وطن سے دور غیر میں اپنی زمین کی سلامتی کی خاطر ہو چکے ہیں —— تاریخ میں بھی کہیں

۰

۲۰۳ Scanned with CamScanner

انہیں آئے گا کیونکہ وہ مرتے وقت بھی پرایا بھیس بدلے ہوئے تھے۔

گیان سنگھ کو امانت سونپ کر وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا یہ واقعات نہیں تھی۔ ابتدا ہی میں اُس کے پاس کمار، جیسا سیف ہاؤس اور کمار پورل اجے جیسا مقامی دوست موجود تھے اب اُسے اپنا زیادہ تر کھیل انہی دو مہروں کے گرد کھیلنا تھا۔

وہ چاہتا تو ابھی مسٹر سہائے کے ہاں پہنچ جاتا جہاں اُسے مکمل امان ہر طرح میسر تھی، لیکن اُس نے سوچا پہلے اُسے اپنا حلیہ بدلنا تھا۔

ٹیکسی میں اُس نے دہلی میں اپنے نئے اور مستقبل کے گھر کے متعلق تفصیلی رپورٹ پڑھ لی تھی اور اُسے اُمید تھی کہ اس لفافے میں دہلی کے متعلق ہی ہدایات موجود ہوں گی۔ لفافہ کھول کر دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اور اُس مقصد کے لیے تنہائی درکار تھا۔

"کوں نہ کناٹ پیلس چلوں" اُس نے خیال کیا۔

وہ ایک رکشہ میں اُس طرف روانہ ہو گیا۔

کناٹ پلیس جہاں کنارے بنی وہ بستی تھی جو کبھی دلی کے شرفا کا مسکن رہی ہو گی لیکن اب اس نام کی کوئی شے اُسے دکھائی نہیں دے رہی تھی، بلکہ بے حیائی کا مسکن تھا۔ باغ کے ایک ایک ویران کنج میں جو مقامی کالجوں کی لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے پسندیدہ ماحول سے ابھی تک محفوظ تھا وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس طرف دھوپ رقص کر رہی تھی۔ نرم اور پُرسکون دھوپ نے اپنی گود ساری پھیلا رکھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ اس دھوپ نے اُسے بہت سکون بخشا

اس طرف ماحول کا سرسری نظروں سے جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر لفافہ چاک

کرلیا۔ سب سے اوپر ایک مقامی بنک کا بیس ہزار روپے کا چیک اُس کے لیے موجود تھا جس
کے ساتھ ایک خالی کاغذ ــــ کاغذ پر کہیں کہیں پیلے دھبے اُسے دکھائی دے رہے تھے! اپنی
جیب سے اچھی نکالی کر اُس نے تیلی سلگائی اور کاغذ کو آنچ دینے لگا۔ جلد ہی لفظ نمایاں ہو
کر اُبھر آئے۔

اُس کی اب تک کی بھاگ دوڑ کو خصوصاً نتھا سنگھ جیسے غنڈے اور ڈبل کراس کو اس کے
ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جانا بہت مزا آیا گیا تھا اور اس کارنامے پر اُسے باقاعدہ سراہا گیا تھا
گئی تھی۔ خان کو اِس بات کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ دہلی میں سہنائے گھرانے کا کام
حاصل کرلے۔ اِس کے ساتھ ہی مختصر ترین الفاظ میں ایک مقامی کام بتایا گیا تھا اور اگلے
احکامات حاصل کرنے اور مقامی کام کو اپنے دستوں تک پہنچانے کے لیے اگلے چند
کی آر۔ وی لکھی گئی تھی۔

کاغذ اور لفافہ اُس نے جلا کر راکھ کر دیا اور راکھ کو باؤں سے اچھی طرح مسل ڈالا۔
اب اُس کا رُخ کناٹ پلیس کی مقامی آبادی کے کسی بڑے ریڈی میڈ گارمنٹس سٹور کی
طرف تھا۔

گھنٹہ ڈیڑھ کی مغز کھپائی کے بعد بالآخر اُسے مطلوبہ اشیاء مل گئیں اور جب وہ
سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو نہ صرف یہ کہ اُس کے ہاتھ میں موجود اٹیچی کیس میں ضروری
زندگی کی ہر شے تھی بلکہ اُس کا اپنا حلیہ بھی بالکل بدل چکا تھا۔ اب وہ پہلے والا خان
بڑا بن چکا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اردو کہ بڑا ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر
بڑے اطمینان سے بیٹھا رگھوناتھ سہائے کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

○

پہاڑ گنج کی اُس آبادی تک پہنچنے میں اُسے بمشکل آدھ گھنٹہ لگا تھا۔ یہاں
چھوٹی سی سرکاری کالونی میں وہ لوگ رہتے تھے۔ یہ کالونی ایک طرح سے نئی اور پر

اسٹاف بھی تھا۔ اُس نے ڈرائیور کو مسز سہائے کا نمبر بتا دیا تھا اور اب وہ خود ہی مکان ڈھونڈنے
کا کہہ کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی گیٹ کے عین سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ دروازے کے باہر
سے لشور کھڑا نظر آیا جو خان کی نظر پڑتے ہی تیزی سے بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔ شاید گھر
والوں کو خبر کرنے گیا تھا کیونکہ خان کے ٹیکسی والے کو فارغ کرنے تک دوبارہ کشور، آشا اور اپنی
ماں کے ساتھ گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔

"ارے بھیا ــــ" آشا نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا۔

"پہلے لوگوں ماتا جی ــــ" خان نے جھک کر مسز سہائے کے پاؤں چھوئے جنہوں نے
اٹھ کھڑے ہوتے ہی اپنے لوپلے منہ سے بے شمار دعاؤں اور بوسوں سے نواز دیا تھا۔

کشور نے اُس کا ننھا سا اٹیچی کیس تھام لیا اور وہ گھر والوں کی معیت میں اندر داخل ہو
گیا۔ عین کردی ایک سٹور، کچن اور ڈرائنگ روم پر مشتمل یہ خوبصورت سا مکان ہی شاید سہائے
کا۔ گی بھر کی کمائی کا نچوڑ تھا۔ خان کے لیے جن لوگوں نے پہلے ہی سے الگ بندوبست کر رکھا تھا۔
ہ۔ انے کے بالکل ساتھ والا کمرہ دے دیا گیا۔ خان کی نظریں ابھی تک بڑی بے تابی سے
ا ہ بڑھے رہی تھیں۔

"آپ جسے ڈھونڈ رہے ہیں وہ ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی!" اُسے چند منٹ کے
لیے اکیلا پا کر آشا نے جھٹ سے کہہ دیا۔

"اوہ! نہیں نہیں بھئی میں تو آپ کا مکان دیکھ رہا ہوں۔"

"اے سرکار ہم سے کیا پردہ ــــ" آشا نے بڑی بے تکلفی سے اُس کے بازو پر
ا ہلکا سا دھول قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ خان نے بھی اُس کے ساتھ ہنسنے میں کسی بخل سے کام
نہ لیا تھا۔

کہ شاید اُن لوگوں نے بھنڈ سے واپس آنے کے فوراً ہی بعد اُس کے لیے مخصوص
کمرہ خاص کمرے میں پلنگ نیا نیا لگایا گیا تھا اور دیوار پر ایک خوبصورت پینٹنگ بھی ٹنگ

رہی تھی۔ جب اُس نے ایک کونے میں رکھی میز پر بچے پھولوں کے ایک گلدستے کو ا
سے عادت کے مطابق ہٹا کر دیکھنا چاہا تو نیچے دھرے ایک کارڈ پر رُما نے بڑے خوبص
الفاظ میں لکھا تھا:

"اس گھر میں آنے والے نئے مہمان کے لیے ایک خوبصورت سی تمنا ــــ کہ وہ
یہیں کا ہو کر رہ جائے۔"

ایک معصوم سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اُسے اس آرٹسٹ لڑکی
آنے لگا تھا جس نے ایک ہی ملاقات میں اپنا مقدر اُس سے وابستہ کر لیا تھا۔ وہ
کے ایک جھونکے کی طرح یہاں آیا تھا، جانے کب کہیں اور نکل جاتا۔

ماتا جی تو اُسے کمرے میں چھوڑ کر رسوئی میں جا گھسی تھیں اور کشور کو اُنہوں
دوڑا دیا تھا۔ آشا کو بھی وہ بار بار ہاتھ بٹانے کے لیے رسوئی میں بلاتی تھیں جو خا
چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی اُس کے سامنے ہندو گھرانوں کی روایتی مہمانداری کے
پڑے تھے، جو پاپڑ اُس کے سامنے رکھے تھے اُس سے پہلے خان نے شاید کبھی
نہیں تھے اور ابھی اِسی طرح کی الم غلم اشیاء پڑی تھیں۔ اُس نے اُن لوگوں کا دل
لیے بادلِ نخواستہ کچھ زہر مار کر ہی لیا۔

رُما کے کالج میں آج شاید کوئی فنکشن تھا آشا نے تو چاہا کہ وہ جا کر
آمد سے مطلع کر دے لیکن خان نے اُسے بڑی سختی سے منع کر دیا۔

"میں اُسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔" اُس نے آشا کی تسلی کرواتے ہو
بوڑھا سہائے بھی گھر والوں کی لعن طعن سے بچنے کے لیے صبح کو گھر سے
شام ڈھلے واپس لوٹا کرتا تھا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کی اب اس میں ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ ماتا جی

لے کر وہ آشا اور کشور کو اپنے ساتھ لے کر کہیں سیر کے بہانے باہر نکل آیا۔

اُس نے اِس دوران دونوں بہن بھائیوں کی خواہشات اور کمزوریوں کا اندازہ لگا
لیا تھا۔ کشور کو اپنے ہاتھ میں رکھنا یوں بھی اس کے لیے ناگزیر تھا۔ یہ لڑکا کسی بھی وقت
گڑبڑ کر اُس کے لیے دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔

دونوں کو ساتھ لے کر سب سے پہلے وہ بنک پہنچا۔ اتنی بڑی رقم کا چیک کیش کرواتے
ہوئے اُنہوں نے شاید پہلی مرتبہ کسی کو دیکھا تھا۔ یوں تو اِس گھر کے سب ہی ممبران اس
امارت کے قائل تھے لیکن اُس نے کشور کو بطورِ خاص آج مرعوب کیا، یہاں سے دونوں
بہن بھائیوں کے ساتھ وہ دہلی کے ایک بڑے ہوٹل میں جا پہنچا۔

خان نے واضح طور پر محسوس کیا جیسے اُس نے دونوں کی کئی جنموں کی چھپی ہوئی خواہش
پوری کر دیا ہو لیکن وہ بیچارے احساسِ کمتری کے ہاتھوں خائف و دبے دبے نظر آ رہے
تھے۔ جس خیالی دُنیا کو انہوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا وہاں ایسے ہوٹلوں میں جانے کی
خواہشیں تو مرد جنم لیا کرتی ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں شاید وہ اس کے نزدیک پھٹکنے کا تصور
بھی نہیں کر سکتے تھے اور آج بھگوان کی دیا سے انہیں ایسا بھائی مل گیا تھا جس نے اُن کے
خواب کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ دونوں اس پر مٹے جا رہے تھے۔

ہوٹل سے فارغ ہوتے ہی وہ لوگ اب ایک بڑی مارکیٹ کا رُخ کر رہے تھے ــــ
اِس بات سے وہ اس خاندان پر بڑا بھرپور حملہ کرنے جا رہا تھا۔

اُس نے اِس گھر میں بسنے والے ایک ایک فرد کی نفسیات کو سمجھ لیا تھا۔ وہ جان گیا
تھا، سب لوگ محرومی کی ایک اَن دیکھی آگ میں سُلگ رہے تھے۔ گھر میں موجود اسباب
کو وہ بھی اُس نے بخوبی بھانپ لیا تھا اور اُسے یقین ہو چلا تھا کہ بوڑھے سہائے نے زندگی
کا بڑا حصہ بڑی گزلری ہے۔

شام کے جب وہ شاپنگ سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو سہائے گھر میں موجود تھا۔ دونوں

میاں بیوی کی آنکھیں خوشگوار حیرت سے جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ جب انہوں نے کشور اور آشا اور خان کے علاوہ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی بڑے بڑے ڈبے اور پیکٹ اٹھائے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ خان نے ان پر بڑا گہرا اثر کیا تھا۔ ایک ڈبے میں ٹی۔وی تھا اور دوسرے میں کشور اور آشا کے لیے ڈریس۔

"یہ یہ بیٹا ــــ" سہائے کی تو جیسے زبان نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔

"بس بابو جی! ایک لفظ بھی نہ کہیئے اس سے آگے! میرا من گواہی دیتا ہے کہ آپ پچھلے جنم میں آپ مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔ ہاں آپ سب لوگ۔ اب میں سارے جنموں کا ملا چکا دوں گا۔" اس نے شاندار اداکاری کا مظاہرہ کیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر باپو جی سے لپٹ گیا۔

ماحول خاصا مذبذب ہو گیا تھا۔ سہائے اور مسز سہائے کے علاوہ دونوں بچے بھی رو رہے تھے اور چاروں خان سے باری باری لپٹ کر اسے نذر و عقیدت پیش کر رہے تھے جانے بے چارے کب سے ترس رہے تھے ان دونوں چیزوں کے لیے؛ وہ بے شمار پیکٹ دونوں چیزوں کے علاوہ تھے جن میں آشا اور کشور کی جینز، باپو جی اور ماتا جی کے بے اور ان بلے کپڑے اور رما کے لیے دو ساڑھیاں رکھی تھیں۔ خان نے اس موقعے پر سوشیل اور اس کے بچوں کو بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا آج کی مضبوط ہی پر اس نے اپنے مستقبل کی بنیادیں استوار کرنی ہیں۔

کشور اور آشا تو خوشی سے دیوانے ہوئے جاتے تھے۔ دونوں بوڑھے بار بار نی اور ڈبک کو چھو کر شاید اس بات کا یقین کر لینا چاہتے تھے کہ واقعی وہ خواب تو دیکھ رہے۔

○

شام ڈھلے جب رما گھر پہنچی تو گھر کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر اس کی آنکھیں

Scanned with CamScanner

کھلی رہ گئیں۔ خان بونسی ہوا خوری کے بہانے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل گیا تھا۔

وہ جس علاقے میں قیام پذیر ہونے والا تھا۔ اس کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ یہ تو اچھی خوش قسمتی تھی کہ یہ کالونی مخلوط ٹائپ جگہ نہیں تھی۔ ورنہ اب تک اس کی شہرت کے نے زبان زد خاص و عام ہو چکے ہوتے۔ یہاں زیادہ تر دوسرے درجے کے سرکاری ور کاری افسران ہی رہائش پذیر تھے اور یہ لوگ خود کو مہذب اور تعلیم یافتہ ظاہر کرنے ایک دوسرے کے معاملات میں کم ہی دخل دیا کرتے تھے ــــ نہ ہی کسی گھر کو اگر دوسرے گھر میں کیا ہو رہا ہے لیکن ٹی۔وی کا انٹینا دیکھ کر وہ یہ بات ضرور لگائے تھے کہ جگی نامحرم سہائے کے گھر ٹیلیویژن آگیا ہے۔ زیادہ نے یہی اندازہ لگایا خالی پلے سے اپنے بقیہ جات حاصل کرتے ہی بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو اس صول خرچی شروع کر دی۔

رات گئے جب اروڑن کمار گھر واپس لوٹا تو اس کے کمرے کا حلیہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک کے بجائے وہاں تین پیشنگز نصب تھیں۔ کرسیوں کے کشن بدلے جا چکے تھے۔ ٹیبل پر نیاں سلیقے سے ایک طرف رکھی تھیں اور شیو کا سامان ایک چھوٹے سے سنگھار میز پر تھا۔ یہ سنگھار میز اس کے کمرے کے ایک کونے میں رکھا گیا تھا اور تازہ خریدا ہوا لگ رہا تھا۔

رات کی دہشت میں وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا تھا۔ گھر کے تمام افراد اماتک روم میں جمع تھے اور باہر کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔

اس نے بشکل کپڑے تبدیل ہی کیے تھے جب دروازے کا پردہ سرکا اور رما داخل ہوئی شاید وہ کسی کام سے ادھر آئی تھی! خان نے جان بوجھ کر کمرے کی لائٹ نہیں کی تھی ــــ جیسے ہی رما نے بٹن دبایا اور روشنی میں اس کی نظر خان پر پڑی وہ ایک لمحے کے لیے جیسے اس کی قوت گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی۔ پھر اس کے

ہونٹ کپکپائے۔

"نسکار" اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لیے۔ ابھی تک رما نے اپنے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے اور وہ اس کے کمرے کو بنانے سنوارنے میں جُتی ہوئی تھی

"بے ہند ـــــ" خان نے مسکراتے ہوئے بڑے متفکر خیز انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔ رما مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"آپ ہر بات میں سنسنی ضرور پیدا کرتے ہیں" رما نے بے اختیار کہہ دیا۔

"ہاں رما جی! جب زندگی بالکل کھوکھلی ہو جائے تو آدمی اپنے اردگرد یونہی شور کھڑے کر کے اس خلا کو پورا کرنے لگتا ہے"

"آپ! آپ کیا ہیں لرڈن کمار جی! آپ نے ہم سب کو لوٹ لیا ـــــ ہم سب" رما خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔

"نہیں رما۔ ایسی بات نہیں حقیقت تو یہ ہے رما کہ تم نے مجھے دوبارہ زندہ رہنے کی تحریک دی ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا: بس مشین کی طرح دن رات پیسے کماتے رہو۔ مجھے اس روز بس میں سفر کرتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں زندگی دکھائی پڑی تھی۔ رما میں جانے کس جنم سے کچھ کھو رہا تھا۔ تمہیں مل کر ـــــ تم سب اگر مل کر بھی لگتا ہے جیسے میری تلاش مکمل ہو گئی ہو۔

"یہ رما سوبھاگیہ (خوش قسمتی) ہے لرڈن کمار جی!" وہ شرم سے دوہری ہوتی ہوئی تھی۔ خان نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اُسے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ وہ خود اپنی اس پر چونک پڑا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رما کے سامنے بھی وہ آخر ایکٹر کیوں نہیں بن سکتا ـــــ اُس کی ساری اداکاری رما کو دیکھ کر دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ یہ کوئی کھیل نہیں تھا اُس کے لیے۔ وہ یہاں عشق کرنے نہیں آیا تھا۔ دورانِ تربیت اُس کے استاد نے اُسے فولادی اعصاب کے مالک کے خطاب سے نوازا تھا لیکن آج اُسے لگا

Scanned with CamScanner

اس روئے زمین پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کی طرح ایک بہت ہی کمزور انسان ہے۔ اس نے رما سے جو کچھ کہا یقیناً اُس کے دل کی آواز تھی۔ آج تک اُسے دماغ کے استعمال کی تربیت ہی دی گئی تھی۔ یہ دل کا معاملہ کیا تھا؟ کتنا جان لیوا تھا؟ اس کا احساس تو اُسے کبھی نہ ہو سکا۔

"کیسا لگا آپ کو ہمارا گھر؟ ـــــ" رما نے اُسے کہیں دُور کھوئے دیکھ کر قریب لانے کی کوشش کی۔

"ہمارا گھر؟ کیا مطلب۔ بھئی میرا گھر کہو۔ اپنا گھر کیسا ہی ہو سورگ لگتا ہے سب کو۔ پینٹنگز بھی خوبصورت ہیں" خان نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا۔

"واقعی ـــــ؟" رما نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر بجلی گرائی۔

"ہاں تمہیں یقین نہیں آتا کیا؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"اس لیے لرڈن کمار جی! کہ یہ تو ایک نادرِ مصورہ کی بنائی ہوئی ہیں"

"یعنی مس رما سمائے گی ـــــ" آشا اچانک ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ خان کو یقین تھا کہ وہ چھپ کر ابھی تک دونوں کی گفتگو سُنتی رہی ہے۔ اُس کی اس طرح کی حرکت رما کو واقعی ناگوار گزری تھی۔ لیکن آشا چُپ نہ رہ سکی۔

"میں بھی کہوں آخر رما جی کہاں غائب ہو گئیں" اس نے بڑے شرارتی لہجے میں کہا۔

"سنا اگر یہ تمہاری بنی ہوئی پینٹنگز ہیں تو واقعی لاجواب آرٹسٹ ہو۔ تمہارے ذہن کی ساری خوبصورتی تمہاری انگلیوں کے راستے اس کینوس پر بکھر گئی ہے: خان واقعی پینٹنگز بھی اتنا شاندار نظر آ رہا تھا ـــــ

○

تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ دونوں میاں بیو
اور کشور اُسے آتے دیکھ کر اس طرح احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے جیسے اُن کا مرشد اندر
داخل ہوا ہو۔ کشور نے بھیا جی! بھیا جی! کا ورد کرتے اُسے زبردستی اپنی کرسی پر بٹھایا
اور خود اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے ابھی سے بین پہن لی تھی۔

رات گئے تک وہ لوگ ٹی وی کے گرد جمع رہے۔ کھانا سب نے وہیں کھایا۔ اپنی اپنی
تھالیاں سامنے رکھے وہ ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ اُن کی بھوک تو
جیسے بالکل ہی غائب ہو کر رہ گئی تھی۔ خان اور سمائے خان کے کمرے میں چلے آئے۔

خان نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اب اُس کی چوکھٹ سے آ
لگا ہے۔ اُس نے سمائے کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ٹنکی بھر میں اُس کا بیس دس روپیہ اُدھار تھا
ہوا ہے جو کل ملا کر ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم بنتی تھی اور اُس کے بھائیوں نے
بڑی چالاکی سے یہ سارا اُدھار اس کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔

اُس نے اپنے پاس موجود پندرہ ہزار روپے سمائے کے سامنے رکھے تو اُس کی آنکھیں
پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سمائے کے پاس اس وقت تک اپنی سروسز کے بقایاجات میں سے
بمشکل آٹھ دس ہزار روپے ہی بچے تھے۔

خان نے اُسے اس بات کے لیے رضامند کر لیا تھا کہ سمائے اور وہ مل کر ایک
کمپنی بنائیں اور خود کو فوج، پولیس وغیرہ میں رجسٹر کروا کر وہاں سے چھوٹے چھوٹے سپلائی
آرڈر وصول کر لیا کریں۔ رجسٹریشن کا ذمہ بھی اُس نے خود ہی لے لیا تھا۔ سمائے نے
اس کی ہدایات پر آمنا صدقنا کہا۔

خان نے اُس کے سامنے مستقبل کی ایک ایسی شاندار تصویر کھینچی تھی کہ بوڑھا سمائے
ابھی سے خود کو مکھ پتی نہیں بلکہ لکھ پتی تصور کرنے لگا تھا۔

خان کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ضرور بطور سویلین یا فوجی کلاس سپلائر خود کو رجسٹر

ثوت سے یہاں کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا؟ اس کا اندازہ اُس نے بخوبی لگا لیا تھا! ایک
اندی کی بیرکوں تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد وہ اپنے ملک کے لیے کیا کچھ کر سکتا
تھا! اس کا بھی اُسے بخوبی اندازہ تھا۔ سمائے کے نہ نہ کرنے کے باوجود خان نے وہ ساری
رقم زبردستی اُس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

جاتے جاتے اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اور بڑے رقت آمیز لہجے میں ملگن ہاتھ
سمائے سے التجا کی تھی ــــ "باپو جی! بھگوان کے لیے کبھی بھول کر بھی میرے ماضی سے
متعلق کوئی بات مجھ سے نہ پوچھیے۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں یہ سمجھ رہا ہوں
کہ میں نے آج ہی آپ کے گھر جنم لیا ہے اور پچھلا جنم میں بھول چکا ہوں۔"

سمائے نے بیقرار ہو کر اُسے سینے سے لگایا اور اس بات کا تو شاید دلایا: کہ اس
علاقے اور برادری کا کوئی فرد کبھی یہ تصور بھی نہیں کرے گا کہ وہ کوئی اور ہے ــــ وہ
سب اس کے جذبات کا ہر طرح احترام کریں گے۔

خان کے سمجھانے پر سمائے نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہر ملنے والے کو یہی بتائے گا کہ
ملگن نام، اُس کے مرحوم دوست کا اکلوتا بیٹا ہے جس کے ماں باپ حادثے میں مر چکے
ہیں، اب وہ اُسی کے پاس رہے گا۔"

"بہت دھنواد آپ کا باپو جی! جانے آپ کے احسانات کا بدلہ کبھی چکا بھی پاؤں گا یا
نہیں ــــ اُس نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے سمائے کو کہا۔

اور اتنی دیر میں رما بھی اپنی ماتا، بہن اور بھائی کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔

اس وقت وہ دونوں ــــ اُس کا باپو اور خان گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔
اُس کا باپ ــــ تو ایک جوان بیٹے کے مل جانے پر بھگوان کا جی ہی جی میں شکریہ
ادا کر رہا تھا اور ــــ خان ان خیالوں میں گم تھا کہ مستقبل کی اس منصوبہ بندی میں کوئی
خلا باقی نہیں رہ گیا ہے۔

"آپ لوگ کہاں کھو گئے ہیں؟" اُس کی ماتا نے سہائے کو جھنجوڑا تو وہ بولا۔

"یہیں تو ہم ہیں ـــــ اسی کمرے میں!"

"تو پھر بچوں کو سونے دیں ناں۔" ماتا بولی۔ "رات کافی بیت گئی ہے۔"

یہ سنتے ہی سب نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔

○

رات کافی دیر تک وہ مکان کی چھت پر رما سے باتیں کرتا رہا: اُس کے کالج کی باتیں، اُس کی دوستوں کی باتیں۔ اُس کے مشاغل کی باتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے اور اُس کے مستقبل کی باتیں۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

وہ رات اُس نے کروٹیں بدلتے ہی گزار دی۔ رات دیر گئے اُسے نیند آئی تھی۔ گھر والوں نے بھی اُسے جگانا مناسب نہ جانا اور جب وہ بیدار ہوا تو سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔ رما، آشا اور کشور پڑھنے جا چکے تھے۔ سہائے دوپہر کا سودا سلف لانے چلا گیا تھا۔ اُسے بیدار ہوتے دیکھ کر ماتا جی اُس کے لیے چائے لے آئیں۔

نہا کر اس کی طبیعت خاصی نکھر آئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے تک سہائے بھی آگیا اور تھوڑی دیر بعد دونوں باپ بیٹا اپنے نئے بزنس کا آغاز کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہو رہے تھے ـــــ اُنہیں آج ہی رجسٹریشن کے لیے درخواست داخل کرنی تھی۔ رجسٹریشن کا مسئلہ اُس نے چٹکی بجاتے ہی حل کر لیا۔ سہائے نے تو اُسے صرف خادم کر دیا تھا اور اُس کے ساتھ اُس فوجی دفتر تک گیا تھا۔ جہاں اُنہیں درخواست جمع کرانی تھی۔

ـــــ یہاں اُس کے دھرم پتر اُدھن کمار نے جانے کیسے اُس چپراسی کو تاڑ لیا جو بڑے صاحب کے دفتر کے باہر پہرے پر کھڑا تھا ـــــ ایک کونے میں لے جا کر اُس نے اُس سے کچھ باتیں کیں اور پھر دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

سہائے گھر آنا چاہتا تھا۔ دوپہر خاصی ہو چلی تھی اور اُسے بازار کا کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ تو نوکری کے دنوں میں بھی دوپہر کا کھانا گھر سے لے کر جایا کرتے تھے۔

"گھر چلیں اب؟" ـــــ اُنہوں نے خان کی طرف دیکھا۔

"نہیں باؤ جی! شما کیجئے۔ ابھی آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ دس منٹ بعد ہمارا ایک دوست آئے گا۔ اُس کے ساتھ ہم اکٹھے ہی کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ اروڑن کمار نے بڑے معذرتی لہجے میں کہا۔

"جیسی تمہاری اچھیا!" ـــــ باؤ جی اپنے ہونہار پُتر کی کسی بات کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔

دونوں دفتر کی انتظار گاہ کے ایک کونے میں بیٹھ رہے۔ واقعی پورے دس منٹ بعد اُنہوں نے چپراسی کو اُس طرف آتے دیکھا ـــــ وہ انہیں اشارہ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد تینوں ایک ہوٹل کے کیبن میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے! سہائے اور خان نے تو ویشنو کھانا کھایا تھا جبکہ چپراسی رُلیا رام نے اپنے پلیٹ کی ڈبل پلیٹ طلب کی تھی۔ وہ اُن دونوں کے سامنے اتنی ڈھٹائی سے کھانے پر ٹوٹا ہوا تھا جیسے اُن کا کوئی دیرینہ اور بے تکلف قسم کا آشنا ہو۔

خان نے اُسے اپنی مجبوری بتائی تھی کہ شریف لوگ ہونے کے ناطے وہ دفتروں کے چکر نہیں لگا سکتے اور یہیں اگر معاملہ ختم ہو جائے تو بہتر ہے!

"ہم کسی کا حق نہیں ماریں گے بھائی صاحب! لیکن غریب لوگ ہیں اور نیا نیا دھندا شروع کر رہے ہیں۔" اس نے قریباً گھگھیاتے ہوئے رُلیا رام سے کہا۔

"آپ شریف آدمی ہیں مہاراج! ہم آپ کا کام کروا دیں گے۔"

خاصی رَدوقد کے بعد بالآخر معاملہ دو ہزار پر ٹھہرا۔ خان نے اُسی وقت ایک ہزار

دو پیہ اُسے دے دیا اور رُدیا رام نے ایک ہفتہ بعد آکر رجسٹریشن لے جانے کا کہہ دیا۔

"کمال ہے بھئی تم نے تو ہم ممکن کو ممکن بنا دیا" ـــــ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی سہائے نے بے اختیار اُسے داد دی۔

"ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے باپو جی!" ـــــ اُس نے دل ہی دل میں کہا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ صرف "آپ کی دعاؤں کا صدقہ" کہہ کر خاموش ہو رہا۔

باپو جی کے ساتھ جب وہ گھر واپس پہنچا تو سب ہی لوگ گھر آ چکے تھے۔ کشور اپنا ڈیک دکھانے کے لیے کالج کے دو تین لڑکوں کو ساتھ لایا تھا اور اُن پر خاصا رعب جھاڑ رہا تھا۔ خان نے شام تک کا وقت اُن لوگوں کے ساتھ گزارا پھر ایک کام کا بہانہ کر کے باہر چلا آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ صفدر جنگ روڈ کی جانب سڑک کے اُس حصے کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں سرکاری دفاتر بنے تھے ـــــ وہیں اُس نے ٹیکسی رد کی اور پیدل ہی اُتر کر ایک طرف چل دیا۔

دفاتر میں چھٹی کا وقت ہو چکا تھا اور یہ شاہراہ خاصی مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے جان بوجھ کر پندرہ بیس منٹ مزید ضائع کر دیے پھر مختلف بلاکوں کا چکر لگا کر بالآخر ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے رُک گیا۔ اس عمارت کے باہر انگریزی حروف میں ایک چھوٹا سا بورڈ لگا تھا جس پر "نیشنل ریسرچ سیل" لکھا تھا۔

اس ریسرچ سیل میں کیا گل کھلایا جا رہا تھا؟ اس کی کچھ خبر تو خان کے مُلک کو تھی لیکن حال ہی میں اس سیل سے متعلق کچھ زیادہ ہی تشویشناک اطلاعات ملی تھیں۔

ـــــ اگلے روز بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہان کی ایک خصوصی خفیہ میٹنگ منعقد ہو رہی تھی اور اُسے اسی میٹنگ میں ہونے والی کارروائی کی رپورٹ حاصل کرنا تھی۔ یہاں آکر اُس کے لیے یہ اطلاع ایک طرح سے نئی تھی کہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے بعض اہم نوعیت کے دفاتر کو رناموں سے کام کر رہے یہ نیشنل ریسرچ سیل بھی اسی قماش کا ایک ادارہ تھا۔

جب اُسے یقین ہو گیا کہ اعلیٰ افسران اب اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے ہیں؛ تو وہ بھی اپنا بریف کیس سنبھالتا اندر داخل ہو گیا۔

یہاں مین گیٹ پر سیکورٹی کے انتظامات اتنے معمولی نوعیت کے تھے کہ خود خان بھی ایک لمحے کے لیے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا نیشنل ریسرچ سیل کی بجائے واقعی یہ کوئی علمی تحقیقاتی ادارہ ہی تو نہیں۔ کیونکہ ابھی تک کسی نے اُسے چیک نہیں کیا تھا۔

ویسے اُسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہاں زیادہ تر اُنہی لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے جو اس دفتر کے معاملات میں عمل دخل رکھتے ہیں اس لیے شاید اُسے بھی انہی لوگوں میں سے کوئی سمجھا جا رہا تھا کیونکہ اُس نے ابھی تک اپنی کسی حرکت سے خود کو ابنارمل ظاہر نہیں کیا تھا اور اسی طرح بے دھڑک اندر گھس رہا تھا جیسے وہ کوئی بڑا سیکورٹی آفیسر ہو۔

اُس کے دائیں بائیں بھی لوگ آ جا رہے تھے لیکن شاذ ہی کسی نے کسی سے بات کی ہو! خان نے بھی کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ ایک راہداری میں چل رہا تھا جس کے دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے باہر مختلف عہدوں کے ساتھ مختلف ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں اور جلد ہی اُسے اپنا مدعا پورا ہوتا نظر آیا۔ ایک کمرے کے باہر "ڈائریکٹر ریسرچ پیسیل" سڑک۔ ڈی لکھا ہوا تھا۔

کمرہ بظاہر بند نظر آ رہا تھا لیکن اس کے بغل کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے کچھ سوچا پھر اُس کمرے میں جا گھسا۔

ایک میز کے کونے پر بیٹھی ایک ٹائپسٹ لڑکی ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلا رہی تھی۔

اور اس کے سامنے والی کرسی پر ایک بابو بیٹھا تھا۔ ٹیلیفون دھرے تھے اور ایک کونے میں ٹرانسفر سیٹ دھرا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے جلدی میں یہاں رکھ دیا ورنہ شاید ایسی غلطی ایسے محفوظ ادارے میں کبھی بھی نہ کی جاتی! اُسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر دونوں چونک اُٹھے۔

"کیپٹن شکلا!" ــــ اُس نے دونوں کو کچھ پوچھنے کا موقعہ دیے بغیر کہا! "مجھے مسٹر ملہوترا سے ملنا ہے۔"

جیسے ہی اُس کے مُنہ سے "کیپٹن" کے الفاظ نکلے وہ دونوں اپنی اپنی جگہ ڈوب کھڑے ہو گئے۔

"سر وہ تو آف کر چکے ہیں۔" مرد نے جو غالباً سیکرٹری تھا جواب دیا۔

"اوہ مائی گاڈ ــــ میں تو سری نگر سے آیا تھا۔ کچھ پیپر ہینڈ اوور کرنے ہیں۔ فلائیٹ لیٹ ہو گئی اور آج رات ہی مجھے ٹیک آف کرنا ہے ــــ" اُس کا لہجہ بالکل ذہنی قسم کا ہو رہا تھا۔ "میرا یہ فسٹ ویزٹ ہے۔ خیر کل سہی۔"

"او۔ کے سر۔" سیکرٹری نے کھڑے کھڑے کہا۔

"تھینک یو۔ اٹ از کوئنٹیڈنشل ــــ" اُس کا لہجہ خاصا باوقار ہو گیا تھا۔

پھر جیسے ہی وہ واپسی کے لیے گھوما لڑکی اور مرد دونوں کے ہاتھ سیلوٹ کے لیے اُٹھ گئے جس سے خان نے اندازہ لگا لیا کہ ان دونوں گدھوں کا تعلق بھی آرمی ہی سے ہے۔

اُسی طرح باوقار چال چلتا وہ باہر نکل آیا۔ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا یہ اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ عمارت میں موجود لوگوں سے بالکل لاپرواہ چلتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ باہر سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت کچھ زیادہ نہ تھی۔

خان چاہتا تو اسی دفتر کے بالکل سامنے سے سواری پکڑ سکتا تھا لیکن اُس نے جان بوجھ کر اس سے احتراز برتا اور پیدل ہی سڑک کے کنارے بنی فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

جلد ہی اُس کی محنت رنگ لائی اور اُس نے وہ آدمی فٹ کر لیا جو کافی دیر سے اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایک مسکراہٹ خان کے ہونٹوں پر پھیلتی چلی گئی ــــ "ریسرچ سنٹر کے لوگ واقعی ناتجربہ کار ہوتے ہیں: اب وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔

تعاقب کرنے والا اُس سے بمشکل دس بارہ گز دور تھا اور دونوں کے درمیان کچھ اور لوگ بھی پیدل چل رہے تھے! چلتے چلتے اچانک ہی اُس نے ایسی حرکت کی کہ تعاقب میں آنے والا بوکھلا کر رہ گیا۔ خان سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے بک سٹال پر یک لخت رُک گیا۔ تعاقب میں آنے والے کے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ باقی نہ بچا تھا کہ وہ اپنی دھن میں اُسی طرح آگے نکل جائے۔ کیونکہ خان نے اُسے خاصا قریب آنے دیا تھا پھر اچانک حرکت کی تھی۔ اور جیسے ہی تعاقب میں آنے والا اُس سے آگے نکلا وہ تیزی سے داہنی طرف گلی میں گھوم گیا۔ اس گلی میں آمد و رفت کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ خان نے اتنی تیزی سے مختلف آنے جانے والوں کے آگے پیچھے ہو کر پوزیشن بدلی تھی کہ جب تعاقب کرنے والے نے مُڑ کر دیکھا تو واقعی وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اُس نے دائیں بائیں دُور دُور تک نظریں دوڑائیں لیکن "کیپٹن شکلا" کو تو جیسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نے نگل لیا۔

○

اس گلی میں وہ رُکا نہیں ــــ!

انتہائی تیز رفتاری سے اُس نے مختلف گلیاں بدلی تھیں اور اب ٹیکسی میں سوار ہوا وہ ہوائی اڈے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے میں تین مختلف ٹیکسیاں بدلنے کے بعد ہوائی اڈے کی عمارت سے کچھ فاصلے پر بنی دوسری کالونی پر اُتر گیا اور ٹیکسی کے تعاقب سے نکلنے کے بعد پیدل چلتا اپنے گھر کی طرف آ گیا۔

اس کے گھر پہنچنے تک کھانا تیار ہو چکا تھا اور اب وہ لوگ اُسی کے انتظار میں

بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ سب ٹی۔وی کے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے! اس ...
سپائے نے خان کے آج کے کارنامے اُن لوگوں کے گوش گزار کر دیے تھے اور اب وہ ...
اُس کے سامنے تنہ بکڑ کے طور پہ دہرا رہا تھا۔ باقی سب تو اُس کی تعریف ...
رطب اللسان تھے جبکہ خان اس طرح نظریں جھکائے بیٹھا تھا جیسے اپنی اِس حرکت ...
شرمندہ ہو۔

کھانا ختم ہونے پر وہ رُما کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"دلی جی، اگر آپ کو فرصت ہو تو میں آپ کی خوبصورت صحبت حاصل کر سکتا ہوں ..."

اُس نے رُما سے کہا۔

جواب میں رُما صرف لجا کر رہ گئی۔

"میرے خیال سے آپ کو آج دہلی کی سیر نہ کروائی جائے۔"

"ارے کیوں نہیں بیٹا! ضرور ضرور" ____ مسز سہائے نے اندر داخل ہوتے ہوئے ...
اُن کے لیے تو یہ بڑا ہی نیک شگون تھا اگر اُن کا دھرم پتر اُن کی پتری کو پسند کر ...

"اس سے پہلے کہ اور کسی کو خبر ہو۔ میرے خیال سے ابھی نکل جانا چاہیے۔" ...

"ہاں ہاں۔ جاؤ بیٹا!" مسز سہائے نے شرارتی لہجے میں رُما سے کہا۔ اور خود کمرے ...
نکل گئیں۔

"میں ذرا کپڑے تو بدل لوں۔" رُما نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے یہ غضب نہ ڈھانا۔ میں تو پہلے ہی ___" فقرہ نامکمل چھوڑ کر ...

اور رُما ایک مرتبہ پھر شرم سے دوہری ہو گئی۔

O

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک ٹیکسی میں "کرول باغ" کی طرف جا رہے تھے۔ ...

... وقت وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو خان اُس کے لیے خاص طور سے خرید کر لایا تھا۔
... ساڑھی پہن کر وہ باہر نکلی تو خان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ "کیا زمین کا کوئی باسی
... حسین بھی ہو سکتا ہے؟" اُس نے سوچا اور رُما کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا ___ اس پری
... لڑکی اُس کے ذہن پر چھا رہی تھی کہ وہ خود کو اُس کا کوئی "معمول" جاننے لگا تھا۔

کرول باغ پہنچنے تک خان پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری رہی اور اسی کیفیت
... زیادہ تر وہ رُما سے دُنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔ اُس نے اپنے سکول اور کالج کے زمانے
... کو کبھی پڑھا تک نہیں تھا لیکن آج جیسے اُسے میر اور غالب کے تمام دیوان
... ہو گئے تھے۔ اُس نے سوچا غزل واقعی اتنی خوبصورت ہی ہوتی ہو گی۔

"... دیکھ رہے ہیں آپ اس طرح؟" ____ اُس کی محویت نے رُما کو بھی چونکا دیا۔

"... آنکھوں میں جیتی جاگتی زندگی دیکھ کر سوچتا ہوں رُما، کہ کیا یہ ہی وہ آنکھیں ہیں،
... کسی شاعر نے ان میں ڈوب کر مر جانے کی آرزو کی تھی ____؟ سچ رُما واقعی
... آنکھوں میں ڈوبنے کے بعد زندگی بے معنی سی شے بن کر رہ جاتی ہے۔"

... تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا اُس کے کان کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں کیونکہ اُس نے
... ڈرائیور کو اپنے سامنے لگے شیشے میں مسکراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ اِن
... باتیں بڑے غور سے سنتا آیا تھا۔

"... کہیے" رُما نے اُس کے بازو کو چھو کر شاید ڈرائیور کی موجودگی کا احساس
...

... سے کچھ پہلے ہی انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ رُما نے کچھ نہ پوچھا اور اُس کے ساتھ
...

"... ہے ابھی کم از کم یہ تو پوچھ لو ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"... کیوں پوچھوں! کمار جی! جب آپ پر ورشواش کر ہی لیا تو میں اپنے من

میں آپ کے متعلق کوئی شک شبہ کیوں رکھوں پھر آپ ہی تو ایک ہیں جو میرے ہیں
میں آئے۔ اس خالی خالی زندگی میں کتنا خلا تھا آپ کے بغیر! آپ نہیں جانتے میں نے
کتنی تپسیا کی تھی آپ کے لیے! آپ جیسے کسی کے لیے! اب میری تپسیا سپھل ہوئی ہے تو
میں کچھ سوچنے کے لائق رہی ہی نہیں؟

جتنے اعتماد سے رما یہ بات کر رہی تھی، اس نے خان کو بوکھلا کر ہی رکھ دیا تھا
یہ مذاق اتنا سنگین بھی ہو سکتا تھا؟ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی طرف سے
وہ پہل قدمی اور شناسائی کا جواز پیدا کرنے کے لیے ہی رما کو لایا تھا اور اب اس کے
ساتھ باتیں کرتا دونوں اطراف پھیلی کوٹھیوں کی قطار پر نظریں ڈالتا چلا جا رہا تھا۔

دونوں باغ کے ایک تاریک کونے میں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رات
خاصی گہری ہو چلی تھی جب وہ گھر واپس پہنچے۔

○

اس رات کافی دیر تک وہ جاگتا رہا۔

اس ٹک میں تھوڑے دن گزارنے کے بعد ہی اسے اپنی کمزوریوں کا شدت سے
احساس ہونے لگا تھا اس نے محسوس کیا: کہ ان لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف
اتنی نفرت پائی جاتی ہے کہ پنجابی ہندی کو اور ہندی گجراتی کو برداشت نہیں کرتا بلکہ
مسلم دشمنی میں سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

مسلمانوں کے خلاف بھارت کے ہر صوبے میں نفرت پائی جاتی تھی ـــــ پاکستان
یہ لوگ روئے زمین پر وجود بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس
میں اس کی ذمہ داریاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔

اسے بتایا گیا تھا کہ مسٹر ملہوترا کی یہ عادت تھی وہ دن کو ہونے والی کانفرنس
کے کاغذات کا مطالعہ ہمیشہ رات کو اپنے گھر لے جا کر کیا کرتا تھا۔ اس کا گھر بھی

کی جاسوسی کا خفیہ دفتر تھا۔ اس معاملے میں بھارتی یورپ کی تقلید کر رہے تھے اور معصومیت
کا ڈھونگ ہی زیادہ تر کام کیا جا رہا تھا۔

خان نے ملہوترہ کا بریف کیس بہر صورت اڑانا تھا کیونکہ اس میں اس اہم نوعیت کی
میٹنگ کی تمام کارروائی درج تھی جو بھارت میں پاکستان کے خلاف پکنے والی کھچڑی پر
مشتمل تھی ـــــ بھارت کو پاکستان توڑنے کا دیرینہ خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

تاریخ تیزی سے اپنی سمت بدل رہی تھی۔ ایک ان دیکھی تباہی پاکستان پر مسلط
ہونے والی تھی اور اربابِ بست و کشاد آنکھیں بند کیے بین کی بنسری بجا رہے تھے۔

اگلے روز ـــــ!

صبح صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو گھر کے نزدیکی مندر کے سپیکر گھر پھاڑ پھاڑ کر
بج رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے اسے ہلکی ہلکی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔
مسز سہائے کوئی اشلوک پڑھ رہی تھیں۔ پھر اسے اپنے کمرے کی طرف آتے قدموں
کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور مسز سہائے اندر چلی آئی۔ اس نے خان کے سرہانے
کھڑے ہو کر انہی اشلوک کا جاپ کرنا شروع کر دیا پھر اس پر پھونک مار کر واپس لوٹ
گئیں۔ دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ خدا جانے مسز سہائے نے کیا پڑھ کر اس
پر پھونکا تھا لیکن یہ اندازہ اس نے پہلے ہی روز لگا لیا تھا کہ ماں کا رشتہ خواہ اس کی
اپنی ہی کزن کیوں نہ ہو بہت نازک بھی ہوتا ہے اور بہت پائیدار بھی۔

ناشتہ سب نے اکٹھا کیا۔ یہ بظاہر مذہبی قسم کا گھرانہ تھا اور خان کو بھی بادلِ نخواستہ
پوجا پاٹھ میں شرکت کرنا پڑی۔ رما کے ساتھ ہی وہ باہر آیا تھا۔ اس نے رما کو
آداب کر کے پھر اپنے کام سے آگے جانا تھا۔

دونوں کاروں سے ابھی چند قدم دور ہی گئے تھے کہ اچانک ہی رما ٹھٹک کر رک

گئی۔ اُس کی نظریں سامنے ایک رکشہ سے اُترتی لڑکی پر جمی تھیں۔ شاید اُس نے ابھی
رما کو نہیں دیکھا تھا۔ رکشہ والے کو کرایہ دے کر جوں ہی وہ دوسری طرف گھومی اُس کی
نظر رما پر پڑی اور وہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی اُس کی طرف آئی۔ رما نے بھی اُسے دیکھ
ہی اپنی باہنیں پھیلا دی تھیں۔

"ہائے مونی!" اُس نے نعرہ بلند کیا اور "مونی" رما کے بازوؤں میں سمٹ گئی
دونوں خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"ان سے ملیئے مس رجنی۔ میری بچپن کی سہیلی۔ اسے بڑا شوق ہے جاسوسی
کا ــــ" رما کے اندازِ تعارف میں جو بے ساختگی آگئی تھی اُس نے خان کو محظوظ
کیا لیکن وہ آخری فقرے پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"مجھے ارون کمار کہتے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ بائی دی وے
کرتی کیا ہیں؟" اُس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اپنا تعارف کروایا۔

"ارے میں بتاتی ہوں۔ یہ کہاں بتائے گی۔" رما نے بیچ میں ٹپک پڑی۔

"ارے بابا یہ شریمتی جی سیکورٹی آفیسر بننے والی ہیں۔ ٹریننگ ہو رہی ہے"
ساری چربی اُتار دی کمبختوں نے تین ماہ میں۔"

"رما پلیز۔ کچھ مجھے بھی بولنے دو ناں!" رجنی نے رما کو ٹوکا اور پھر آنکھوں ہی
لاکر خان سے مخاطب ہوئی۔ "میرا جملہ تو آپ کو ہی گیا۔ اب آپ بھی اپنا تعارف
دیجئے ناں مہاراج! آپ کو پہلے کبھی دیکھا نہیں۔"

"بس یہی کمی ہے تم لوگوں میں۔ ذرا کسی کو دیکھ لیا اور رگ جاسوسی پھڑکنے
ارے یہ ہمارے فیملی فرینڈ ہیں۔ رما بولی۔ پاپا کے ایک دوست کے بیٹے ہیں۔ اب
پاس ہی رہا کریں گے۔"

"اچھا تو یوں کہو ناں کہ ..... رجنی نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر بڑے معنی خیز

انداز سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شام کو ملیں گے کلب میں کالج جا رہی ہوں ــــ رما بڑی طرح گڑبڑا گئی تھی۔
اور اس سے پہلے کہ رجنی کچھ بولے وہ ارون کمار کا ہاتھ پکڑ کر "بائی بائی" کہتے ہوئے
لے اڑ گئی۔

"بڑی شرارتی ہے کمبخت۔ کیا مجال جو اسے ذرا بھی شرم آتی ہو کسی بات پر۔" رما
کا بابا اپنی خجالت مٹانے کو کہا۔

"ویسے کیا شوق چرایا ہے اسے۔ اچھی خاصی لڑکی ہے یہ کیریئر نکل گئی۔" خان نے
پوچھا۔

"اسے بچپن ہی سے سیکورٹی میں جانے کا شوق تھا۔ جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر دماغ
خراب ہو گیا ہے۔ تین چار ماہ پہلے ایک اشتہار عورتوں کے لیے چھپا تھا۔ درخواست
دی اور معلوم ہوا ہے کہ مہارانی بھرتی انٹیلی جنس "را" میں بھرتی ہو چکی ہیں۔ آج کل
ٹریننگ کر رہی ہے۔ جلد ہی اس کی پوسٹنگ ہو جائے گی۔"

"ہے ہرے! مجھے تو ایسی خبیر و خطرناک سی لڑکیاں ایک دم زہر لگتی ہیں۔ لڑکی
ماؤں کی نوکری۔ واہ!" خان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ لیکن اس کے دماغ میں
خطرے کی گھنٹی نے یک دم سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔

"اگر لڑکی اگر رما کی اتنی گہری دوست ہے تو ضرور اُس کا آنا جانا بھی اُن کے ہاں رہتا
ہوگا۔ کہیں کمبخت اس کی لڑکی میں ہی نہ لگ جائے۔"

وہ جانتا تھا کسی بھی خفیہ سروس سے متعلق مرد یا عورت میں تجسس کی عادت ضرور
پائی جاتی ہے۔ یوں بھی دوسروں کے متعلق جاننا انسانی فطرت ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا
رخ بھی تھا۔ اگر وہ اس بات کا یقین رجنی کو دلا دیتا کہ وہ کوئی غیر معمولی شخص نہیں
تو مال (سنی) کی آڑ میں وہ اس قیمتی ہیرے سے بہت زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔

"کہاں کھو گئے آپ؟" رما نے اُسے خاموش دیکھ کر چھیڑا۔

"کہیں نہیں۔ سوچتا ہوں کہ میرا لعبا ایسا شاندار کب رہا ہوگا جو تم جیسی ....."

"بس بس جانے دیجئے۔" رما نے ایک قریب سے گزرتے رکشہ کو اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی دونوں ایک رکشہ میں رما کے کالج کی طرف جا رہے تھے اس دوران خان نے گو کہ خود پر خاصی رومانیت طاری کر لی تھی لیکن اُس کا ذہن ابھی رجنی میں اٹکا ہوا تھا اُس نے رکشہ ہی میں رما کو بتایا تھا شاید اُسے کسی کام سے میرٹھ پڑے اگر وہ رات تک گھر نہ پہنچا تو تشویش نہیں کرنی۔

○

رما کو اُس کے کالج کے سامنے اُتار کر وہ خود بھی تھوڑی دُور جا کر رکشہ سے اُتر اب اُسے نئی دہلی کی طرف جانے والی بس کا انتظار تھا جو جلد ہی اُسے مل گئی۔

"ریسرچ سنٹر" کے نزدیک ہی ایک سٹاپ پر وہ اُتر گیا۔ آج اُس کا حلیہ بالکل سرکاری دفتر والا تھا۔ ریسرچ سنٹر کے نزدیک اُس نے تین ایسے مقامات تاک لیے تھے جہاں سے وہ عمارت پر اچھی طرح نظر رکھ سکتا تھا۔

سامنے سڑک پار عمارت کے دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا چائے کا کھوکھا بنا ہوا تھا جہاں عموماً ان دفاتر کے ملازمین ہی آتے جاتے تھے۔ یہ ہوٹل عموماً گاہکوں سے بھرا ہی رہتا تھا اگر دفاتر کے ملازمین نہ ہوتے تو اُن کے گاہک یہاں موجود رہتے۔ اس علاقے میں زیادہ تر دفاتر جان بوجھ کر ایسے رکھے گئے تھے جن سے صرف سرکاری ہی کو واسطہ پڑتا تھا۔ اس طرح یہاں عام سویلین کو آنے کا کم ہی موقعہ ملتا تھا۔ زیادہ تر وہی یہاں آتے تھے جو ایک طرح سے سرکاری ملازمین تھے یا پھر یہاں کے ملازمین کے رشتہ دار وغیرہ۔

یہاں پہنچنے سے پہلے خان نے ایک شاندار کوریسٹوری اپنے ذہن میں تیار کر لی تھی

وہ ایک سرکاری ملازم تھا اور اپنا تبادلہ رُکوانے کے چکر میں اِس طرف آیا تھا۔

ہوٹل کی ایک میز پر بیٹھ کر اُس نے چائے کے لیے آرڈر دیا۔ اُس کی آنکھوں کے عین سامنے ریسرچ سنٹر کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جس میں کاروں کی آمد و رفت آج معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

اُس کا دل یہاں سے اُٹھ کر کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بہت زیادہ دیر تک یہاں ایک ہی جگہ بیٹھ کر وہ کسی کو شک میں مبتلا کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے کسی مطلوبہ ساتھی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو جلد ہی گوہر مقصود ہاتھ آ گیا جب ایک دھلتی عمر کا اور گنجا ہندو اُس کے سامنے والی کرسی پر آ کر براجمان ہو گیا۔

"شاید کھوئے ہوئے ہیں۔" اُس نے بظاہر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دیا۔

"کوئی بات نہیں مہاراج جی!" خان نے بڑے اداس سے لہجے میں کہا۔

"آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔" لالہ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور واقعی پریشان نظر آنے لگا۔

"مہاراج جی بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"فرمائیے شاید میں آپ کے کسی کام آسکوں۔" گنجے لالہ نے بڑی مکاری سے دانہ ڈالا۔

تھوڑی دیر بعد ہی دونوں باہم شیر و شکر ہو چکے تھے۔ خان نے اُسے بتایا تھا کہ وہ مالا راجستھان میں کہیں سیکورٹی کا حوالدار ہے اور اُس کا تبادلہ دہلی میں ہو رہا ہے وہ تبادلہ رکوانے کے چکر میں اِدھر آیا تھا۔ گنجے ہندو نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل اُس کے پاس موجود نہ ہو۔ اس دوران وہ مزے سے کر خان کو اپنے کارنامے سُناتا رہا اور خان ریسرچ سنٹر کے گیٹ پر نظریں جمائے

سُنتا رہا۔

اُس نے اُسے کل اِسی جگہ ملنے کو کہا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ پانچ سو روپے میں ہی کام ہو جائے گا۔ دوپہر کا کھانا بھی اُس نے خان کے ساتھ ہی کھایا — اور اب وہ کل ملنے کا وعدہ کر کے واپس جا رہا تھا۔

اُس کی معیت میں اُس کا وقت خوب کٹا تھا۔ اُس کی روانگی کے بعد وہ خود بھی کار سے اُترنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا جب اچانک ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اُس نے سیاہ رنگ کی مرسڈیز کو گیٹ سے برآمد ہوتے دیکھا تھا جس میں ملہوترہ کی موجودگی ضروری تھی۔ شاید وہ اِس اہم میٹنگ سے فارغ ہو کر اب گھر جا رہا تھا یا پھر سرکاری کام سے

خان نے فوراً بِل ادا کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے قدم بڑی تیزی سے نزدیکی سٹینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرسڈیز بڑی آہستہ رفتار سے چل رہی تھی۔ شاید ٹریفک کی وجہ سے یا پھر یہاں بغلی سڑکوں پر کار کم رفتار سے چلانے کا قانون تھا! اُس کی نظر سڑک پر رنگین سیاہ مرسڈیز پر جمی تھیں اور قدم تیز رفتاری سے سٹینڈ کی طرف لپک رہے تھے۔

جیسے ہی کار نے پہلی گلی کا موڑ مڑنا چاہا اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا! گلی میں سے برآمد ہوتی ایک تیز رفتار جیپ ملہوترا کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ ڈرائیور اس لیے اُفتاد سے بوکھلا گیا اور گاڑی اس کے کنٹرول سے نکل کر سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی ابھی چوٹ نہیں ہوئی تھی اس لیے یہاں کچھ زیادہ رش نہیں تھا۔ سامنے والی جیپ گاڑی کے بالکل اُوپر چڑھ آئی تھی۔ ڈرائیور کے زندہ بچ رہنے کا امکان بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اُسی لمحے خان کا خطرناک صورت انسٹرکٹر اُس کے سامنے کھڑا تھا اور ٹریننگ سکول کی کلاس روم میں وہ دونوں مصروف گفتگو تھے — بسا اوقات قدرت انسان کی مدد کو

Scanned with CamScanner

ہے بچ! اور بہترین جاسوس وہ ہے جو کسی بھی کمزوری سے فائدہ اُٹھائے۔ فوراً۔ ورنہ اور کھوجی مشتی تمہارے نزدیک سے دبے پاؤں گزر جائے گی اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔

بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال اُس کے ذہن میں لپکا وہ محض چند سیکنڈ میں جائے حادثہ پر پہنچ چکا تھا۔

"بچاؤ! بچاؤ —" وہ چلایا۔

اُس کی نظریں پچھلی سیٹ پر بیہوش ہوئے کرنل ملہوترا پر جمی تھیں۔ جس کے پہلو سے ایک بریف کیس لگا ہوا تھا۔

دروازہ کھولنے کے لیے اُسے بڑی زور آزمائی کرنی پڑی تھی کیونکہ اچانک لگنے والے ٹکر نے شاید دروازے کو لاک کر دیا تھا۔ اُس کے بریف کیس باہر نکالنے تک وہاں تین چار اور آدمی بھی پہنچ چکے تھے خان نے بریف کیس اس انداز سے پکڑ رکھا تھا جیسے وہی اس کا مالک ہو۔

لوگوں کا ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہونے لگا تھا۔ پھر لوگ تو ملہوترا کے بیہوش جسم کو باہر نکالنے لگے۔ خان اُنہیں مصروف کار چھوڑ کر آگے نکل گیا۔

○

تین چار گلیاں گھومنے کے بعد بالآخر وہ ایک ٹیکسی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس ٹیکسی کے بعد اُس نے اپنے پہلے سے مقرر کردہ ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے تین اور گاڑیاں بدلی تھیں۔ یہ کرشمہ قدرت تھا۔ یا پھر تائید غیبی کہ اس طرح اچانک ہی اُس کا مقدر چمکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن گرا تھا۔ اس طرح اچانک ہونے والی کامیابی پر احساسِ تشکر سے اُس کا دل بھر آیا تھا۔ اُسے آج یقین ہو چلا تھا کہ اللہ کے رستے پر چلنے والے کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

"آرزو" ہوٹل کے اس دوسرے درجے کے ہوٹل کو اس نے اگلے ہی دن اس وقت کے لیے تازہ تھا۔ کاؤنٹر پر دو روز کا کرایہ جمع کروا کر اس نے ایک کمرے کا رُخ کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جیب میں موجود ایک چابیوں کے گچھے کی مدد سے بریف کیس کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اس بریف کیس میں ٹائپ شدہ کاغذات کا ایک پلندہ رکھا تھا۔ یہ اس میٹنگ کی شاید مکمل کارروائی تھی جو آج ہی وہاں انجام پائی تھی اور اُسے پڑھ کر اپنی خصوصی رپورٹ تیار کرنے کے لیے طہورا اُسے گھر لے جا رہا تھا۔

خان نے ایک سرسری نظر کاغذات پر ڈالی۔ ہر ٹائپ شدہ کاغذ کے کونے پر "ٹاپ سیکرٹ" کی سُرخ مُہر لگی تھی۔ اُس کی نظریں ایک پیرا گراف پر اٹک کر رہ گئیں:

بھارت میں بننے والی تازہ انٹیلی جنس ایجنسی "را" کی طرف سے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کی سازش کی تفصیلات لکھی گئی تھیں۔ یہ ایک منصوبہ تھا جس پر بھارت سرکار ایک لمبی مدت سے عمل پیرا تھی۔ اب اس منصوبے کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے اور اس میٹنگ میں یہ طے پایا تھا کہ مشرقی پاکستان کو "بنگلہ دیش" بنانے کی گھناؤنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہاں "مکتی باہنی" کے نام سے مقامی غداروں کی مدد سے باقاعدہ فوج تشکیل دی جائے اور پاکستانی فوج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا جائے۔

جوں جوں وہ پڑھتا جا رہا تھا اُس کی آنکھیں پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ دشمن اتنی گہرائی پر بھی اُتر سکتا ہے، اُس نے سوچا اور حیران رہ گیا کہ بھارت کس ڈھٹائی سے اپنے ہونے کا پروپیگنڈہ کر رہا تھا حالانکہ اصلیت کچھ اور تھی۔ تصویر کا دوسرا رُخ اُس کے تصور سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا اُڑ کر ان کاغذات سمیت وہاں جائے اور اپنے لوگوں کو چیخ چیخ کر بتا دے کہ دشمن قیامت کی چال چلنے والا ہے لیکن ہر کھیل کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں۔

جاسوسی جذبات کا کھیل نہیں تھا! اسے عقل سے زیادہ اور دل سے کم کام لینا تھا۔

بریف کیس سے کاغذ نکال کر اُس نے تہہ کر کے یہ اس طرح اپنے کپڑوں میں محفوظ کر لیے کہ اب وہ اُس کے جسم ہی کا کوئی حصہ بن کر رہ گئے ـــــ بریف کیس ہاتھ میں اٹھائے وہ باہر نکل آیا۔ کمرے کو تالا لگا کر اُس نے چابی کاؤنٹر پر جمع کروا دی تھی۔ اُس کا رخ اس ہوٹل کی پشت پر کچھ فاصلے پر موجود اُس برساتی نالے کی طرف تھا جہاں برسات کے دنوں کے علاوہ بھی ہر وقت پانی جمع رہتا تھا۔ نالے پر جا بجا لکڑی کے پُل بنائے گئے تھے۔

ایک قدرے ویران پُل سے گزرتے ہوئے اُس نے اس بریف کیس کو جس میں کاغذات کے بجائے پتھر بھرے ہوئے تھے۔ نالے میں پھینک دیا اور خود پیدل چلتا نالہ عبور کر کے دوسری طرف پہنچ گیا۔

بازاروں میں زیادہ گھومنا اُس نے مناسب نہ سمجھا اُس کا رُخ ایک سرکاری ٹیلی فون کی طرف تھا۔ جہاں ایک کلرک کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے اُس نے درخواست کر کے کلرک سے التجا کی کہ وہ اس سے ڈبل فیس لے کر کھٹمنڈو کا ایک ٹیلی فون نمبر ملا دے اس نے اپنے "چچا جی" کو "دیدی" کی "سرتیو" کی خبر دینی ہے۔

کچھ تو اُس کے آنسوؤں ہی سے بے چارے کلرک بابو کا دل پسیج گیا اور رہی سہی کسر اُس کے نوٹ نے پوری کر دی۔ کلرک نے اگلے کلرک سے بات کی اور سرکاری فیس سے دو روپے زیادہ ادا کرنے کے عوض بمشکل پندرہ بیس منٹ بعد ہی وہ نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں اپنے "چچا جی" سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُس نے روتے ہوئے چچا جی کو "دیدی" کی "سرتیو" کی اطلاع دی اور اپنے ہوٹل کا ایڈریس بھی بتا دیا۔

دوسری طرف سے اُس کے "چچا جی" نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اُسے آج رات فون شو پر ریالٹو سینما میں ملاقات کا وقت دے دیا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد سلسلہ

منقطع ہو گیا۔

خان ہوٹل واپس آگیا ——!

آخری شو تک کا وقت اُس نے ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارا۔ بازار سے ایک بو
کا تھیلا خرید کر اُس نے کافی دیر کو بڑے سلیقے سے اُس میں پیک کیا اور آخری شو
ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے رایالٹو سینما میں پہنچ گیا۔

مقررہ وقت پر اچانک ہی ایک کونے سے گیان سنگھ نمودار ہوا۔ کیونکہ چند روز
ہی دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر یہ ملاقات بھی تو اُس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی
اُسے ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے گیان سنگھ آگے نکل گیا۔ اُس کا رُخ ٹکٹ
کرنے والی کھڑکی کی طرف تھا۔ غالباً کوئی خاص رش نہیں لے رہی تھی۔ شاید کوئی بڑا
تھی۔ خان نے تو اُس کا نام پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ جیسے ہی گیان سنگھ
نے کریڈیسوں کی طرف بڑھا خان اُس کے تعاقب میں لپکا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک باکس میں جو صرف دو سیٹوں پر مشتمل تھا بیٹھے
دونوں نے ابھی تک رسماً ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے علاوہ اور کوئی
نہیں کی تھی۔

"میرا خیال ہے تم اپنی امانت اب لے ہی جاؤ" خان نے فلم شروع ہونے
بمشکل دس منٹ بعد ہی کہا۔

"ہاں! ہاں" —— گیان سنگھ شاید کسی اور دُنیا میں پہنچ چکا تھا۔

خان نے بولی متعین لفافے میں پیٹے کاغذات اُسے تھما دیئے! اس میں
پیغام بھی شامل تھا۔ اُسے علم تھا: اگلے روز تک بہرصورت یہ کاغذات اُس کے
پہنچ جائیں گے۔

گیان سنگھ نے کاغذات وصول کرنے کے بعد جلد ہی اُنہیں اپنے جسم کا حصہ

بنا لیا۔ مزید اُس کے ساتھ گزارنے کے بعد اُس نے خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے
باہر کی طرف متوجہ کیا۔ یہ اُس کی روانگی کا اشارہ تھا۔ خان نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"فی امان اللہ" —— گیان سنگھ نے اُس کے کان میں سرگوشی کی اور دبے قدموں
باہر نکل آیا۔

"فی امان اللہ" —— خان نے بھی خدا سے اُس کی سلامتی کی دُعا کی۔ اُس نے پلٹ
کر اُدھر نہیں دیکھا تھا۔

دھنک کے ساتوں رنگ

گیان سنگھ کی روانگی کے بمشکل پندرہ منٹ بعد وہ بھی اسی طرح باہر نکل آیا تھا۔ وہ سے قریباً دو اڑھائی میل دُور جا کر اُس نے گھر جانے کے لیے رکشہ پکڑا۔

ہوٹل میں اب اس کا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ احتیاطاً اُس نے ایک ٹیلی فون نمبر سے ہوٹل فون کر دیا تھا کہ آج رات کسی کام سے باہر جا رہا ہے اس لیے نہیں آسکے گا نے کاؤنٹر کو بھی بتا دیا تھا کہ اگر اُس کے متعلق کوئی فون وغیرہ آئے تو وہ نوٹ کرا دے نہیں چاہتا تھا کہ افراتفری میں کوئی بھی مشتبہ قدم اٹھائے۔ ہوٹل کو فون کرنے دس پندرہ منٹ بعد اُس نے احتیاطاً ٹیلی فون بدل کر اپنے لیے کسی مدن لال کی طرف ایک تجارتی سا پیغام بھی لکھوا دیا تھا۔

رکشہ اُس نے حسبِ سابق گھر سے دو تین فرلانگ دُور ہی چھوڑ دیا تھا اور اب گھر کی طرف جا رہا تھا۔

عین اُن لمحات میں جب وہ گھر داخل ہو رہا تھا اُس نے رجنی کو گیٹ سے ہوتے دیکھا۔ یہ اُس کے لیے کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رجنی نے بھی آنا ہوتا تو بھی وہ اُس کے متعلق جاننے کے لیے ضرور آتی۔ لیکن اُس کے اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ جگن ناتھ سہائے کوئی پتہ نہیں، منجھا ہوا ریٹائرڈ سرکاری اور یہ بھی کہ وہ خان جیسی سونے کی چڑیا کے متعلق کسی کو غلط لائن پر سوچنے

لے بے تیار نہیں ہوگا۔

یوں بھی خان نے احتیاط سمائے اور اُس کے گھر والوں کو اپنے متعلق استفسار کرنے اطمینان کرنے کے لیے جو کہانی بتائی تھی اُن لوگوں کے لیے سوائے اس کے کوئی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ یہی کہانی ہر کسی کو سناتے ورنہ اُن سے متعلق بھی تو بڑی قسم کی افواہیں لوگ پھیلا سکتے تھے۔

○

اب خان اچانک ہی رجنی کے سامنے آگیا تھا۔

ارے آپ! سماشے جی آپ کہاں سرگشت کر رہے ہیں، میں تو آپ ہی کے درشن

اُسے ری قسمت! تُو نے بھی مجھے آج ہی گھر سے غائب کرنا تھا؟ خان کی بات پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

نہیں سماشے جی! ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ابھی میں آٹھ روز یہیں ہوں۔ آپ کو کیا کروں گی ـــــ اور یوں بھی میں رما کی ایک ہی بچپن کی دوست ہوں اور ہم میں اتنی دوستی ہے کہ ہم ہر چیز بانٹ کر کھاتی ہیں۔

رجنی صرف بیباک سی ہندو لڑکی ہی نہیں تھی پولیس کی تربیت یافتہ بھی تھی اور خان کو ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی۔

تو مجھے اُمید کرنی چاہیئے کہ آپ کی روانگی تک اروِن کمار نام کا ایک شخص یہاں موجود نہیں ہوگا؟

خدا نہ کرے۔ اچھا آگیا دیکھیے! میں کسی نے چھُپ کر دیکھ لیا تو بدنام ہو جائیں گی۔ وہ ہنس پڑی اور اُس نے قہقہہ لگایا۔ خان کے آگے بڑھتے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مار کر اور بائے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

گھنٹی بجانے پر کشور دروازہ کھولنے باہر آگیا اور اُس کے تعاقب میں آشا بھی چلی آئی:

"ہائے بھیا ــــ دونوں نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"میں نے تو ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ میرا من کہتا تھا آپ ضرور آئیں گے" اس موٹی نے کہا لیا: کشور نے آشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے نبر بنائے۔

خان مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔ گھر کے باقی لوگ ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ اپنے دونوں بچوں سمیت آئی ہوئی تھی کیونکہ اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی اور وہ سب یہ وقت مل جل کر اروِن کمار جی کے ساتھ بسر کرنا چاہتے تھے۔

"کہاں چلے گئے تھے بیٹا! اتنی دیر" ــــ مسز سہائے نے اس کی بلائیں لیتے کہا۔

"ماتا جی! بات یہ ہے کہ مجھے دراصل آپ کا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔ ا۔۔۔ جو لوگ اتنی بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں وہ کوئی آسمان کی مخلوق تو نہیں ہیں۔ آپ دیکھ لینا چند مہینوں کی بات ہے پھر اپنا بنگلہ ہوگا کار ہوگی اور اور۔۔۔۔

اور کیا ہوگا؟" رمانے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مداخلت کی ــــ "وہ شکایت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی: جانتے ہیں رجنی نے کون کیا آپ کا۔ ابھی گئی ہے۔"

"سوری۔ کان پکڑتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی" خان نے باقاعدہ کہا۔ اس نے زما اور کشور کے ساتھ کھایا۔ آج وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور نرم محسوس کر رہا تھا۔ اس طرح اچانک قدرت نے کامیابی جو اُس کا مقدر کر دی تھی۔ اور گو کہ اپنے ذہن میں ملہوترہ کے گھر میں گھس کر بریف کیس اُڑانے کے دو تین متبادل بنا رکھے تھے لیکن قدرت کو شاید اُس پر جلد ہی رحم آگیا تھا۔

خان جانتا تھا کہ ملہوترا کا بریف کیس غائب ہونے پر بھارتی سیکورٹی کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا ہوگا اور وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح اُس کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ اور اس بات کا احساس اُس کے علاوہ اُس کے افسران کو بھی تو تھا جو جیمز اُسے ہدایات بھیجنے والے تھے لیکن کس طرح؟ اس کا اُسے بھی علم نہیں تھا۔ صرف اُس نے اپنے دہلی کے "سیف ہاؤس" کی اطلاع پہنچا دی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اُس کے مرکزم حل ساتھی پہلے ہی اُس کی حفاظت سے بے خبر نہیں رہے ہوں گے۔

⊙

بعد میں اُس نے گھر والوں کی باتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ پھر رما کے ساتھ وہ بھی باہر نکل آیا۔

اُس سٹور سے دونوں نے بوتلیں پیں۔ یہاں سے خان نے احتیاطاً ایک اور فون کیا۔ اُس کی طرف سے اپنے ہوٹل کو کر دیا اور اپنے لیے پیغام بھی لکھوا دیا۔

اس بار دونوں نے زیادہ گفتگو رجنی کے متعلق ہی کی تھی۔ رما نے اُسے بتایا کہ اس کے بہن کی واحد دوست ہے۔ اُس کا باپ بھی ریلوے میں آفیسر تھا۔ رجنی کا باپ اور ماں غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے جنہوں نے اُس سے زیادتی کی اور پھر اپنا جرم چھپانے کے لیے اُسے جان سے بھی مار ڈالا ــــ رجنی اُن دنوں بائی سکول میں پڑھتی تھی۔ اس کے اندر بڑی عجیب تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ چپ چاپ رہنے والی لڑکی صدمہ، ہٹ اور غصے کا شکار رہنے لگی تھی۔ اس کے اندر لاشعوری طور پر ایک بدلہ پانا رہا تھا اور وہ اُن غنڈوں کو مار ڈالنا چاہتی تھی جنہوں نے اُس کی معصوم بہن کو مارا تھا۔ رجنی کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ صرف ایک بہن اور تھی ــــ غنڈے معمولی سی سزا کے بعد جیل سے رہا ہو گئے۔

اور اُس کی لمبی چوڑی تقریر کا خان پر کیا اثر ہوا ہے ؟ یہ ٹٹولنے کے لیے وہ بول

"پاگل ہے۔ میں نے تو اسے کہا ہے کچھ عقل جاؤ لیکن نہیں سمجھتی ـــــ اور

میرا من کہتا ہے کہ اُس نے یہ نوکری بھی اسی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے

کی ہے ورنہ تو وہ اندر سے ایک آرٹسٹ ہے۔ مکمل آرٹسٹ ـــــ"

"بہت بہادر لڑکی ہے۔"

"ابھی سے متاثر ہونے لگے آپ اُس سے۔" رما مسکرائی۔

"تم سے ملنے کے بعد کوئی کسی اور سے متاثر ہو سکتا ہے کیا ؟" خان نے

بیباکی سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک پُراسرار سی مقناطیسیت گھر کئے

تھی ـــــ رما کی آنکھوں میں اُسے دھنک کے سارے ہی رنگ بکھرے دکھائی

دے رہے تھے۔ واقعی اُن آنکھوں کا سحر سر چڑھ کر بولتا تھا۔

○

رجنی کی بہت بڑی کمزوری اُس کی سمجھ میں آ رہی تھی ـــــ اور وہ یہ بھی جان

گیا کہ یہ لڑکی "را" کے ٹریننگ سکول میں تربیت حاصل کر رہی ہے۔ وہ سوچنے لگا

اس کے لیے بہت کارآمد ہو سکتی ہے۔ اسی کے ذریعے اُسے "را" پر نقب لگانا

دونوں کافی دیر تک رجنی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ خان کو بخوبی اندازہ

کر رما اس کی گہری دوست ہے اور اُس کے دُکھ کو بھی خوب محسوس کرتی ہے۔ ا

اس بات کے امکانات تو بہت کم تھے کہ رجنی خان کا ماضی جاننے کے متعلق متجسس

اُس کے ذہن میں کوئی شک سر اٹھاتا۔ اس کے باوجود اُس نے خطرے کے

نظر انداز نہیں کیا تھا اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے وہ ذہنی طور

واپسی پر جب رما نے اُس سے اپنے مستقبل کی باتیں شروع کیں تو اس

خواہش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے وہ کم از کم ماسٹرز ڈگری حاصل کر لے پھر اس کے

بعد :

اس نے رما کو احساس دلایا کہ وہ اُس کے ساتھ اُس کے گھر میں ہی تو رہتا ہے اور

اس کے بعد بھی وہ لوگ اُس کے والدین کے ساتھ ہی رہیں گے اس لیے کم از کم

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

رات جب معمول دیر تک وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ باقی گھر والے تو اُن کا

انتظار کرتے سو چکے تھے۔

اگلے روز چھٹی تھی اور اُن لوگوں نے جناح باغ تفریح کے لیے جانا تھا۔ یوں بھی

رما نے اُس سے کر دیا تھا کہ اُس نے دہلی اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ ہی دیکھی ہے

اور وہ بھی بچپن میں۔ یہ طے پایا تھا کہ وہ لوگ صبح ناشتے کے بعد روانہ ہوں گے اور شام ڈھلے گھر

واپس آئیں گے۔

صبح وہ جب سابق جلدی جاگ اٹھا۔ اُس نے گھر والوں کو پہلے ہی روز اپنی صبح کی

روٹین سے آگاہ کر دیا تھا۔ آج بھی وہ سیر کرنے کے بہانے ہی باہر نکلا تھا۔ یہ

بات کہ اُس نے شب خوابی کا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ کافی دور تک وہ پیدل چلتا

رہا اور ایک رکشہ اُسے نظر آ ہی گیا۔

ہوٹل میں جب وہ پہنچا تو زندگی ابھی مکمل بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے تاثر بھی

اسی لوبی سے اُتر کر سیدھا یہاں آ رہا ہے۔ اُسے اُمید تھی کہ اب تک دوستوں

نے اُس کے نام کوئی پیغام پہنچ چکا ہوگا۔

لوبی کے کاؤنٹر سے اُس نے اپنے نام پیغامات موصول کیے۔ اُس کے میزبانوں نے

اسے پے تین چار ٹیلیفون کر رکھے تھے۔ کسی اشوک رائے نے البتہ ایک ٹیلی فون

کیا تھا جسے ہی وہ واپس لوٹے اُس سے اسی نمبر پر رابطہ قائم کرے۔

اس نے سکون کا سانس لیا ورنہ اگلا پیغام موصول ہونے تک ہوٹل چھوڑنے پر

by Qamar Abbas

مجبور ہوتا۔

کاؤنٹر پر ہی اُس نے چیک آؤٹ کیا اور اپنے کمرے کو ایک چکر لگا کر باہر آ گیا۔ [illegible]
کلرک سے حساب بیباق کر کے اُس نے رسید حاصل کی اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

جب وہ رکشہ پر بھاگم بھاگ گھر واپس پہنچا تو گھر والے ناشتے کی تیاریاں کر رہے تھے۔
اُن کے علم میں لائے بغیر چپ چاپ وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ ابھی تک کسی نے اسے
واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔ دوبارہ اُس نے شب خوابی کا لباس پہنا اور انہیں کپڑوں میں
کتنا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو اُس کی طبیعت خاصی کھل رہی تھی۔

آج حسبِ معمول اُس نے شیو نہیں کی تھی۔ یہ بات اُسے سب سے پہلے [illegible]
نے یاد دلائی۔

بس ذرا دیر تک نظر آنے کے چکر میں ہوں۔ اُس نے اپنی ایک آنکھ دبا [illegible]
جانتی تھی کہ زیادہ تر ہندو نوجوان لڑکوں میں چھوٹی ڈاڑھی رکھنے کا فیشن [illegible]
رہا ہے اور اروِن کمار بھی آخر ایک ہندو نوجوان تھا وہ فیشن سے متاثر ہوئے
کیسے رہ سکتا تھا؟ دوسری طرف خان کے لیے اب حلیہ بدلنا ضروری ہو گیا تھا۔

ناشتہ سب نے اکٹھے کیا۔ سوشیل اپنی ماں کے ساتھ رسوئی میں مصروف تھی
خان بازار سے کچھ سامان لے جانے کے لیے ایک دو چیزیں خریدنے [illegible]
باہر نکل گیا۔ قریبی سٹور سے اُس نے سوشیل کے بچوں کے لیے سویٹس اور بسکٹ [illegible]
خریدے اور وہیں سے مسٹر اشوک رائے کو ٹیلی فون کیا۔ جلد ہی نمبر مل گیا اور [illegible]
بھی۔

سب سے پہلے تو اُسے اتنا اہم کارنامہ انجام دینے پر مبارکباد پیش [illegible]
ہفتہ تک مکمل خاموشی اختیار کرنے اور اپنے حلیے کو بدلنے کی سخت ہدایت [illegible]
کیونکہ ایکسیڈنٹ کے بعد غائب ہونے والے بریف کیس نے بھارتی انٹیلی [illegible]

[illegible] کر دیا تھا۔

خان واپس لوٹ آیا۔ کام اُس کے حسبِ منشا ہی ہو رہا تھا۔ اُس کی واپسی پر رجنی
[illegible] گھر پہنچ چکی تھی۔ پھر خان کے بار بار کہنے پر رجنی بھی اُن لوگوں کے ساتھ جانے کے
[illegible] تیار ہو گئی۔

اُس نے اِس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ رجنی سے اُس کی بے تکلفی پر رما
[illegible] برا نہیں مانتی۔ یا تو رما کو اپنی ذات پر بے حد اعتماد تھا یا پھر خان سے اپنی محبت
[illegible] ایک بات بہرحال تھی کہ اُسے یہ لڑکی دوسری ہندو لڑکیوں سے بالکل مختلف نظر
[illegible] تھی۔

جمنا کے کنارے ہی ایک خوبصورت مقام اُن لوگوں نے اپنی تفریح کے لیے منتخب
[illegible] تھا اور بھی بہت سے لوگ پکنک منانے یہاں آئے ہوئے تھے۔ شام تک پیڑ جی سے
[illegible] نے بظاہر اُن لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں گزارا تھا لیکن اس دوران
[illegible] بھی وہ اپنے دماغ سے اُس ناپاک منصوبے کی تفصیلات نکال کر کھاتا تو اُس نے اپنی
[illegible] سے صورتِ حال پھینے گئے کاغذات سے حاصل ہوئی۔

[illegible] سوچ رہا تھا کیا اُس کے معصوم بنگالی بھائی بہن کا صوبیدار صاحب اپنے خاص
[illegible] جارحیت کر کے اُن پر پھینکنے جا رہی تھی؟ اُن کو ایک دوسرے دفتر کا ایڈریس
اب تک اُس نے ہندوؤں کے متعلق محض پڑھ
[illegible] ہوئے — اُن لوگوں کو نزدیک سے دیکھنے کے بعد بظاہر میں زبردستی سو روپے
[illegible] ہی میں بدلتا تھا۔ لیکن اُس کا دل اس "ناں" کو ماننے [illegible] اُس نے خان کو
[illegible] تو یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے ملک کا ایک مکمل ملک میں ہمیشہ کے
[illegible] اُس کی ڈھیروں
[illegible] اخبارات اور دیگر ذرائع سے اُس تک جو خبریں پہنچ رہی تھیں اور

کے ہم میں اٹیلی جنس کا جو ناپاک منصوبہ آچکا تھا اُس کے بعد اُسے یہ بات آخری بزدلی نظر آرہی تھی۔

اس کا جی چاہتا تھا اُڑ کر اپنے بُوڑھے باپ کے پاس پاکستان چلا جائے اور اپنے بنگالی بھائیوں کو چیخ چیخ کر بتائے کہ دشمن قیامت کی چال چل گیا ہے۔ وہ چاہتا تھا جیسے بھی ممکن ہو اپنے سیدھے سادھے بھولے بھالے بنگالی بھائیوں کو دشمن کے چنگل میں پھنسنے سے بچا لے ـــــ لیکن یہ سب کچھ سوچنا ہی اُس کے اختیار میں تھا۔ ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا: سیاست کی وہ شطرنج جو چانکیہ کے چیلے چانٹوں نے وقت کی بساط پر بچھا رکھی تھی اُس میں عابد خان کی حیثیت کسی معمولی سے مہرے جتنی بھی نہیں تھی۔ میدانِ سیاست کے کھلاڑی کوئی اور تھے! اُس کے ذمے تو صرف اتنا فرض تھا کہ وہ اپنے ارباب بست و کشاد کی انتہائی کوشش کے ساتھ آنے والے طوفانوں سے وقت سے پہلے آگاہ کر دے۔ باقی سب کچھ جانتی تھی کہ زیادہ۔

○

رہا ہے اور ارون کمار کا ٹرانسفر آرڈر ریزرویشن لیٹر موصول ہوگیا۔ اب وہ مستند ٹھیکیدار بن کر کیسے رہ سکتا تھا؟ دوسری طرف ناشتہ سب نے اکٹھے کیا۔ کھانے کے ساتھ مارکیٹ روانہ ہوگیا۔

خان بازار سے کچھ پھل بھی خرید لایا تھا۔ اُس نے آرمی کی طرف سے ملنے والی رقم بھی ساتھ لے کر دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ باہر نکل گیا۔ فریج سٹور سے سب کچھ خرید کر گھر پہنچا تو اُن کے پاس ان اشیاء کے کہت سے خریدے اور دیئے ہوئے موجود تھے۔ رات گئے تک وہ ٹنڈر بھرنے میں مصروف رہے۔ بھی۔ کو ساتھ لے کر دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ذلی کے لیے مچھر دانیوں کی سپلائی کا آرڈر تھا۔ اس مرتبہ بھی خان منفرد سب۔ رہے بجائے سائے کے ساتھ اُسی چپراسی سے جا ٹکرایا جس کے ہفتہ تک کیریئر کے پہلے کام نکلوا تھا۔

Scanned with CamScanner

"آئیے مہاراج! آئیے مہاراج ـــــ" اُنہیں دیکھتے ہی چپراسی مسکرانے لگا۔

"میرے خیال سے تھوڑی دیر کے لیے چھٹی لے لو۔ اطمینان سے بات کرتے ہیں؛ خان نے بڑی بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

چپراسی نے بڑی عجیب سی نظروں سے خان کی طرف دیکھا۔ اُس نے دونوں کو اُسی ہال کے کیبن میں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا! اس مرتبہ بھی سمائے خاموش تماشائی بنا رہا۔ اُسے ارون کمار کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا اور وہ جان گیا تھا کہ اس نوجوان میں کوئی ایسی پوشیدہ شکتی ضرور موجود ہے کہ جس کام کا یہ بیڑا اُٹھائے اُسے پورا کر کے رہتا ہے۔

دوپہر کے کھانے پر وہ پہنچ گیا! خان نے اس مرتبہ بھی اس کے لیے لمبا چوڑا کھانا منگوایا تھا۔ کھانے کے دوران ہی اُس نے اپنا مدعا بیان کر دیا اور چپراسی سے درخواست کی کہ وہ متعلقہ آدمی تک جس کے ذریعے یہ آرڈر موصول ہو سکتا ہے۔ اُن کی رہنمائی کر دے۔ چپراسی کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں ایسا شاندار کھانا تو اُس نے اپنی نوکری پر بھی نہیں کھایا تھا۔

"ارے صاحب فکر نہ کیجئے۔ بات بھی کرا دوں گا۔ صوبیدار صاحب اپنے خاص آدمی ہیں کل صبح دس بجے آجائیے۔" اُس نے خان کو ایک دوسرے دفتر کا ایڈریس سمجھاتے ہوئے کہا۔

دم رخصت خان نے بچوں کی مٹھائی کے لیے اُس کی جیب میں زبردستی سو روپے ڈال دیئے۔ سمائے تو اُس پر حیران ہوا جا رہا تھا۔ گھر پہنچنے تک اُس نے خان کو دعائیں دے ڈالی تھیں کہ اب وہ اپنا مستقبل اِس ملک میں ہمیشہ کے لیے محفوظ خیال کرنے لگا تھا۔ ماتا جی نے اس کا تازہ کارنامہ سنتے ہی اُس کی ڈھیروں بلائیں لیں۔

سوشیل شام کو واپس جا رہی تھی۔ خان نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا تھا اور اُس کے بچوں کے لیے کپڑے اور کھلونے ساتھ لیتا آیا تھا۔ اس گھر کا تو اب ایک ایک فرد اُس کا گرویدہ تھا۔ رُما کی واپسی رجنی کے ساتھ ہوئی تھی۔

خان نے آج ایک نیا کھیل شروع کرنا تھا جس کے لیے وہ پچھلے دو روز سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا: اب اُسے رجنی کو اپنی گرفت میں لینا تھا۔ رجنی جیسے تیسے دوسرے کو ہاتھ سے گنوانا اُسے ہرگز گوارہ نہیں تھا۔

رُما دونوں کو اپنے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر گئی تو خان نے ان لمحات کو غنیمت جان کر انہی سے فائدہ اٹھا لیا۔

"رجنی بہن!" ــــ اُس کا انداز، لہجہ اتنا ہمدردانہ اور لہجہ ایسا گمبھیر تھا کہ ایک مرتبہ تو رجنی بھی چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

"جی" ــــ رجنی کے ہونٹ کپکپائے۔

"ایک بات کہوں بُرا مت مانیے گا!"

"ایسی کیا بات ہے؟" رجنی ابھی تک اس کے پہلے جملے ہی سے نہیں سنبھل سکی تھی۔

"میں نے آپ کو پہلے ہی روز سے دل سے بہن بنا لیا تھا۔ ایک بنتی (درخواست) ہے میری۔ اگر آپ بُرا مت مانیں تو میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے آپ اپنے سگے بھائیوں سے بڑھ کر پائیں گی۔"

"مجھے کیا اعتراض ہوگا بھیا!" اس مرتبہ رجنی کا لہجہ بھی بڑا گمبھیر ہو گیا تھا۔ شاید اسے بھائی کی کمی کا احساس محرومی بن کر اُس کے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔ "لیکن رُما....." اُس نے اُدھوری چھوڑ کر خان کی طرف دیکھا۔

"وہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ــــ آج شام پانچ بجے کالونی کے بس سٹاپ پر ضرور ملنا۔" خان نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ــــ" رجنی نے کہا لیکن وہ گہری سوچوں میں گم ہو گئی: "تنہائی میں مجھ سے آخر وہ کیا باتیں کرنا چاہتا ہے؟"

○

اس گفتگو سے اُسے کچھ اُلجھن سی ہونے لگی تھی اور اب وہ خان سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

اُس کی مشکل رُما کی آمد نے بہرحال آسان کر دی جو ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہو رہی تھی۔ چائے پینے کے دوران رُما اور خان تو ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے لیکن رجنی کچھ اُلجھی اُلجھی سی نظر آ رہی تھی۔ اُس کی طبیعت کی اس اچانک خرابی کو رُما نے بھی محسوس کیا۔ اُس نے پوچھا بھی لیکن رجنی ہنس کر بات ٹال گئی۔

چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہی رجنی نے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے اُن سے رخصتی کی اجازت لے لی۔ رُما اُسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ واپسی پر رجنی کے لیے خاص ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔ "معلوم نہیں اسے اچانک کبھی کیا ہو جائے!" اُس نے سرد آہ بھر کر خان سے کہا۔

"غریب بندے کو کبھی چین سے جینے نہیں دیتیں۔ کاش اس کا کوئی بھائی ہوتا!" خان نے بھی ہمدردی جگاتے ہوئے کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ رجنی تمہاری دوست ہے تمہیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اُسے کسی بھی طور خوش رکھ سکیں۔"

رُما نے اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر سر جھکا کر سسکنے لگی۔ "میں کتنی بھی بھلا اردن! وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ جن لوگوں نے آج سے پانچ سال اس کی بہن کو قتل کیا تھا، کسی نہ کسی طرح وہ اُنہیں سزا دلا سکے، لیکن وہ بہت ... معاش ہیں! یہ بیچاری کمزور سی لڑکی اُن کا بھلا کیا بگاڑ سکے گی؟"

"ان لوگ ہیں وہ؟" ــــ خان نے پوچھا۔

"آپ نہیں جانتے بالی کو۔ بہت بڑا غنڈہ ہے وہ! پولیس بھی اُس کا کچھ نہیں
سکتی۔" رُما بولی۔

"چلو چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔" خان کا مقصد حل ہو چکا تھا۔

پانچ بجے تک وہ مسٹر سہائے کو کاروبار کی اُونچ نیچ سمجھاتا رہا۔ وہ بالکل اس طرح
باتیں کر رہا تھا جیسے سات پشتوں سے اُس کے آباؤ اجداد یہی کام کرتے آرہے ہوں۔ ا
بوڑھا سہائے خود کو اُس کے سامنے بالکل بچہ محسوس ہو رہا تھا۔ پانچ بجے وہ ایک
کام کے بہانے باہر نکل آیا۔ اُس نے رُما کو اپنی روانگی کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

کالونی کے بس سٹاپ پر جب وہ پہنچا تو پانچ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے اور رُ
سٹاپ کے ایک کونے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے آتے دیکھ کر اُس کے چ
پر مسکراہٹ چمکی۔ خان نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ
دونوں کالونی سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی بار میں بیٹھے معروف گفتگو تھے:

"رجنی اصل میں تمہاری طرح میں بھی ایک دُکھی انسان ہوں۔ ظلم ہم دونوں کے
ساتھ ہوا ہے لیکن اس کی نوعیت مختلف تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آخر تم اچھی بھلی
ہو کر کس چکر میں پڑ گئی ہو۔ رجنی تم....."

"بھیا! اوّل تو میری زندگی میں تم واحد ایسے نوجوان آئے ہو جس نے مجھے بہن کہا
ہے۔ مجھے تو تم ہندو لگتے ہی نہیں۔" رجنی نے گو کہ یہ بات روانی میں کہہ دی تھی لیکن
کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اُسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ یہ الگ
بات کہ اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ "مجھے علم ہے کہ میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔
میں اُن غنڈوں کو چھوڑوں گی نہیں خواہ میری جان ہی چلی جائے۔"

"اب تمہیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں رجنی۔ واقعی میں دوسرے نوجوانوں
مختلف ہوں لیکن میرے ساتھ بھی یہ محرومی لگی ہوئی ہے کہ میری بھی کوئی بہن نہیں

نے تمہارا دُکھ جان کر کیوں میرا دل بھر آیا۔ رجنی! وقت نے ایک احسان مجھ پر ضرور
ا ہے کہ مجھے قنوطی کی بجائے عملی انسان بنا دیا ہے۔ تمہیں بہن کہا ہے تو اُس پر عمل
ر کے بھی دکھاؤں گا۔ آج سے تمہارے اور میرے دُکھ مشترک ہیں ـــــ میں صرف دو دن
میں اس بات کا ثبوت دے دوں گا۔"

اُس کی آواز شدت جذبات سے کانپنے لگی تھی اور رجنی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
تھوڑی دیر کے بعد ہی دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ رجنی تو گھر آگئی لیکن
خان کسی اور طرف نکل گیا۔

قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ سبزی منڈی کے ایک پُر رونق بازار میں بالی کے
اڈے کے سامنے کھڑا تھا۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک دُکان کے تھڑے پر گھٹے ہوئے جسم، نکلتے قد
سیاہ رنگت کا ایک غنڈہ بیٹھا تھا جس کے دونوں اطراف پانچ چھ مشٹنڈے جو شکل
سے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دے رہے تھے اپنے "دھندے" میں مصروف تھے۔
لوگ کھلے عام منشیات فروخت کر رہے تھے اور سوائے اُن کے خریداروں کے اور
کوئی اُن کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرتا تھا۔

خان کچھ دیر تک کھڑا یہ سارا "تماشہ" بڑے انہماک سے دیکھتا رہا۔ اُس نے اس
دوران بالی کے اڈے اور گھر کا پتہ بھی معلوم کر لیا تھا، پھر وہ بازار میں جائزہ لیتے
لیے ذرا اور آگے چلا گیا۔

گھوم پھر کر واپس اُسی جگہ آیا تو یہاں کچھ اور ہی منظر تھا ـــــ اُس نے دیکھا:
ایک بوڑھے سے ہندو کو جو شکل سے کوئی معمولی سا سرکاری ملازم نظر آرہا تھا۔ بالی کے
آدمی بڑی بیدردی سے مار پیٹ رہے تھے اور وہ وحشیوں کی طرح قہقہے لگا رہا

تھا۔ بوڑھا اس کے سامنے گھگھیاتے ہوئے ہاتھ باندھ رہا تھا لیکن اُس کے ساتھی اس بات سے لاپرواہ اُسے دیوانوں کی طرح پیٹ رہے تھے۔ بازار میں کسی کی ہمت نہیں تھی اُنہیں کچھ کہہ سکے! جلد ہی وہ بدنصیب بیہوش ہو گیا۔

"اُٹھا کر پھینک اوئے اِسے کسی گٹر میں! بالی کے خلاف شکایت کرتا ہے سالا!" بالی نے خونخوار قہقہہ لگایا۔

اگلا منظر دیکھنے کے لیے خان وہاں رکا نہیں تھا ــــ وہ تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

اس بوڑھے سے اُس کی کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اس معاشرے کا رُکن تھا۔ لیکن مریخ فلم دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ اسی طرح اُسے رمنی سے بھی ہمدردی ہو گئی تھی اب وہ اُس کا دل جیتنے کے لیے کوئی بھی دُرائی قدم جلد از جلد اٹھانا چاہتا تھا۔ اس ہوٹل میں داخلے اور فرار کے راستے اس نے ذہن نشین کر لیے تھے اور اگلی رات بالی کو سزا دینے کے لیے منتخب کر لی تھی۔

○

صبح وہ بابو جی کے ساتھ چپراسی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ یہ آرمی کی کوئی ورکشاپ تھی۔ صوبیدار بلاقی رام کا نام لینے پر ایک سپاہی چونکا اور دونوں کو بڑے احترام سے اندر لے آیا۔ شاید بلاقی رام نے ان کی آمد سے گیٹ والوں کو پہلے ہی سے مطلع کر رکھا تھا۔

بلاقی رام تھا تو صوبیدار میجر، لیکن اُس کا کمرہ کسی کرنل کے کمرے سے کیا کم ہو گا۔ چپراسی پہلے سے یہاں موجود تھا۔ دونوں کو آتے دیکھ کر وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا لیکن بلاقی رام کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

چپراسی نے دونوں کا تعارف کروایا اور بتایا: "کہ بابو جی بے چارے ریٹائرمنٹ لے

رہے ہیں ٹھیکیداری سے منسلک ہوئے ہیں۔" اُس نے صوبیدار سے درخواست کی "وہ اُن کا ہاتھ پکڑ لے اور نیا پارٹی دے دے۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میرٹھ چھاؤنی کے لیے پانچ سو کمبل دانیاں سپلائی کرنے کا ٹھیکہ "سائے کمار جنرل آرڈر سپلائرز" کو مل گیا۔ صوبیدار بلاقی رام نے اُن کے ساتھ انتہائی شرافت اور خدا خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن سے صرف ۲۵ فیصد کمیشن طلب کی تھی۔ خان نے آدھی کمیشن ایڈوانس اُسے دیں تھا دی تھی اور آدھی بل وصول ہونے پر ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

گھر واپسی پر دونوں مٹھائی کی ایک ٹوکری ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس سودے میں ان دے دلا کر بھی اُنہیں کم از کم پانچ ہزار روپے کا منافع ہونے والا تھا۔ خان نے اسی کو سودا پیدا ہونے کی انعام دے دیا تھا۔ پہلا ہی کامیاب سودا طے ہونے کا اس نے گھر آنے میں شاندار جشن منایا گیا۔ وہ لوگ خوشی سے باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔ بکشور اور آشا نے تو ابھی سے بڑے بڑے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ خان روٹی تھی تو صرف اتنی کہ اس طرح اُس کی رسائی کم از کم میرٹھ چھاؤنی تک تو ہو گئی۔

ایک طرف قدرت نے اگر بھارت کی سب سے بڑی انٹیلی جنس "را" پر نقب لگانے کے لیے اُسے رمنی جیسی "بہن" دے دی تھی تو دوسری طرف میرٹھ جیسی حساس چھاؤنی اور بگر فوجی تنصیبات تک رسائی پانے کے لیے صوبیدار میجر بلاقی رام جیسا گدھا بھی مہیا کر دیا تھا۔

"جاسوسی مضبوط اعصاب کا کھیل ہے۔" اُس نے اپنی ٹریننگ کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھلایا تھا اب تک اُس کی کامیابی کا راز صرف یہی تھا کہ وہ کبھی بوکھلایا نہیں تھا۔ اُس کے اعصاب پہلے روز کی طرح مضبوط تھے۔ پے در پے ناکامیوں کے باوجود اُسے شاذ کر پایا یا ہمت نہیں ہاری تھی۔

رجنی شام ڈھلے ہی اُدھر آگئی تھی —

خان کو یہ اطمینان مزید تھا کہ رما کو اُس کا رجنی سے میل جول بُرا نہیں لگتا۔ اور آج تو رجنی نے اُسے 'بھیا' کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا — رما کے لیے یہ بات اور زیادہ خوش آئند تھی۔ رات کا کھانا سب نے اکٹھے کھایا۔ پھر خان سب کو آخری شو دکھانے کے بہانے باہر لے آیا۔

سبزی منڈی کے پاس والے سینما ہاؤس تک پہنچنے کے لیے اُس نے سب کے سامنے وہاں چلنے والی ایک انگریزی فلم کی اتنے شاندار الفاظ میں تعریف کر ڈالی تھی کہ سب اُسے دیکھنے کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ فلم پر کوئی خاص رش نہیں تھا۔ خان نے پورا باکس بُک کر لیا اُس نے اپنی سیٹ جان بُوجھ کر رجنی کے نزدیک رکھی تھی۔

فلم مقررہ وقت پر شروع ہو گئی۔

قریباً دس بجے اُس نے رجنی کی طرف جُھکتے ہوئے اُس کے کان میں سرگوشی کی:

"مجھے آشیرباد دو بہن!" رجنی تھرا کر ہی تو رہ گئی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کر گزرے گا۔

"ایکسکیوزمی" خان نے رما سے بھی سرسری طور پر معذرت کی اور آہستگی سے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اُسے یقین تھا کہ سینما کے کم از کم کسی ملازم کو اُس کے باہر نکلنے کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بمشکل دس منٹ بعد ہی وہ بالی کے ڈیرے کے باہر منڈلا رہا تھا۔

خان مکان کی پُشت پر پہنچ گیا! اُس نے دیوار پھاندنے سے پہلے اپنا منہ مفلر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا اور اپنی جیب سے پیتل کا وہ پنجہ جو اُس نے صبح ہی خریدا تھا نکال کر دائیں ہاتھ میں پہن لیا تھا۔ یہ بات اُس کے لیے بڑی خوشگوار حیرت

...ٹ تھی کہ ابھی تک یہاں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

...ی کی طرح دبے قدموں وہ بالآخر ایک کمرے میں کسی کی موجودگی کے آثار پا کر داخل ...ا۔ لائٹ جل رہی تھی اور اُس کے بالکل سامنے بالی شراب کی بوتل مُنہ سے لگائے ...ھا۔ اُس کے پہلو میں ایک فاحشہ موجود تھی۔ خان کی اچانک آمد نے دونوں کو چونکا ...ا۔

...کون ہے بے ہ — اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بالی نے گالی دے کر اُسے ...ب کیا۔ اِس گالی پر تو واقعی خان کا خون کھول اٹھا۔

اُس نے بالی کی گالی کا جواب ایک زوردار ٹھوکر سے دیا — اور پہلو میں اچانک ...ال ٹھوکر نے بالی کو اُلٹا ہی تو کر دیا تھا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل کر پلٹا! لڑکی کے ...تو خوف کے مارے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

خان کو اتنی جلدی بالی کے سنبھلنے کی اُمید نہیں تھی۔ اگر وہ اچانک ہی ایک طرف ...ٹ جاتا تو بالی کے ہاتھ سے نکلی ہوئی بوتل اُس کے سر پر ہی ٹوٹتی۔ اُس کے سیدھا ...ک بالی اُچھل کر اُس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اور اُس کا گھونسہ پوری قوت سے گھوم ...ان کی طرف آیا تھا۔ یہ اگلی بات کہ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔

خان نے زمین پر بیٹھتے ہوئے پیتل کے پنجے والا مُکہ پوری قوت سے اُس کی ناف ...ا۔ بالی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر گرا لیکن اٹھ کھڑا ہوا۔ اذیت سے وہ تڑپ ...ا تھا۔ خان کے پاس وقت بہت کم تھا۔ کسی بھی وقت ہنگامہ مچ سکتا تھا۔ اُس ...ہ بالی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ دو تین منٹ بعد جب وہ قریباً بے دم ہو چکا ...انک ہی خان نے جُھک کر اُس کا پاؤں پکڑ لیا۔

...الی کے پاؤں کو اتنا شدید جھٹکا شاید زندگی میں پہلی مرتبہ لگا تھا۔ اُس کی چیخ اتنی ...ک تھی کہ لڑکی سہم کر رہ گئی اور لاشعوری طور پر اُس کے مُنہ سے بھی ہلکی سی چیخ

نکل پڑی۔

"دوبارہ اگر تمہارے گلے سے کوئی آواز نکلی تو گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔" خان
اُس کی طرف دیکھ کر غرّایا۔ بالی چیخ مار کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ خان نے جُھک کر اُس
بے دم وجود کو ہاتھوں میں تولا اور جھٹکے سے اُسے کندھے پر لاد لیا۔

"میرے ساتھی اس عمارت میں موجود ہیں۔ اگر صبح ہونے سے پہلے تم نے یہاں
بھاگنے کی کوشش کی یا پولیس کو کچھ بتایا تو یاد رکھنا..... جو لوگ بالی جیسے فرد
کو سزا دے سکتے ہیں تمہاری حیثیت اُن کے نزدیک کچھ بھی نہیں" ــــ خان نیم برہ
کی طرف دیکھ کر دوبارہ غرّایا:

"پرماتما کے لیے مجھے جانے دو۔ یہ حرامی مجھے زبردستی یہاں اٹھا کر لایا تھا۔ میں
میں تو خوش ہوئی ہوں۔ کسی کو کیوں بتاؤں گی بھلا؟" لڑکی ہاتھ باندھ کر اُس کے
کھڑی ہو گئی۔

خان نے نظریں جھکا لیں:

"کپڑے پہنو اور چلی جاؤ۔" اُس نے آہستہ سے لڑکی سے کہا اور بالی کو کندھے
اٹھائے باہر نکل آیا۔

برآمدے میں لگے بلب کا بٹن اُس نے آف کر دیا تھا۔ احتیاط سے جوتوں
بغیر آواز پیدا کیے وہ باہر آیا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ اتنا بڑا غنڈہ بغیر باڈی گارڈ
موجود تھا۔ شاید بالی نے کبھی یہ تصور بھی نہ کیا تھا کہ اُس پر کوئی یوں حملہ آور ہو
آج خان کی خوش قسمتی تھی کہ اُس وقت اُس کے ساتھی یہاں موجود نہیں تھے۔

بالی کے بے ہوش جسم کو اُس نے گلی کے کونے پر موجود گندگی کے ڈھیر پر
دیا جاگ رہی تھی لیکن کوئی اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ساری گلی تاریکی
ہوئی تھی اور وہاں کوئی ذی روح سوائے اُس کے موجود بھی نہیں تھا۔

سیدھا واپس پہنچنے تک اُس کے بشکل پچیس تیس منٹ لگے تھے لیکن اندر والے
بہت پریشان ہو رہے تھے۔ خان کے داخل ہوتے ہی باف ٹائم بجوا اُس نے سب سے
رجنی کی طرف دیکھا جو سب سے زیادہ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟" رجنی سراپا احتجاج اُس سے مخاطب تھی۔

جواب میں خان نے قہقہہ لگایا۔ "جی کیا بتاؤں چلا کیا گیا تھا پھنس گیا تھا یہاں
لاشوں کو سامنے سے وہ کمبخت رُلیا رام آتا دکھائی پڑا۔ میں تو نسنے کے
کار ہوا ہوں باقی سارا کام اُسی کا ہے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ اُس کا ایک اور
کار نکل گیا اور میں جان بچا کر نکل آیا ہوں۔" وہ دوبارہ خوامخواہ ہنس دیا۔

رُلیا رام سے اُس گھر کے تمام مکینوں کا غائبانہ تعارف تھا۔ یہی وہ چپراسی تھا
کے ذریعے وہ آدمیوں کی بھیڑ سے نکل کر معزز ٹھیکیداروں کے گروپ میں شامل
گئے۔

"پھر بھی بھیّا! آپ کو اتنی دیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔" رجنی اب بھی گھبرائی ہوئی دکھائی
رہی تھی۔

"فکر مت کرے بھئی۔ آخر مجھ ہی پر اتنی کڑی نظریں کیوں رکھی جا رہی ہیں؟" خان نے
باری سب کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔

"آپ بھیّا جی ــــ ہیں ہی ایسی چیز۔ آپ کو ایک مرتبہ پا کر کوئی کھونا
چاہتا۔" اس مرتبہ آشا کی باری تھی۔

"اوئی! بڑے ڈائیلاگ بولنے لگی ہو۔" خان کی بات پر سب ہنس دیئے۔
شام کو اُنہوں نے اپنے باکس ہی میں بوتلیں منگوا لی تھیں۔ فلم ختم ہونے تک پھر
بھوک جاگ اٹھی۔ فلم کے ختم پر جب وہ لوگ باہر آئے تو رات کے ساڑھے بارہ بج
تھے۔

اس وقت اس علاقے کی سڑکیں سنسان ہو جایا کرتی تھیں لیکن آج خلاف
ایک طوفانِ بدتمیزی ہر طرف برپا تھا۔

"کیا ہوا صاحب؟" کشور نے ایک نوجوان سے پوچھا جو اب تک کئی لوگوں کو
والی قیامت کی روداد سنا چکا تھا۔

"کسی نے بالی کی ٹانگ توڑ کر اسے گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ بہت
بالی کی تو شکل بھی نہیں پہچانی جا رہی کسی سے۔" مخاطب نے دہلی کے خاص کرخنداری
میں مزے لے لے کر باہر ہونے والی واردات بیان کی۔

خان نے کنکھیوں سے رجنی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر یکدم زندگی جاگ
اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اور کنپٹیوں کے نزدیک رگیں پھڑک رہی تھیں۔ ایک
رجنی نے خان کی طرف دیکھا؛ اس کی آنکھوں میں تشکر کا ایک سمندر بلکورے لے

"بھیا!" اس کے ہونٹ کپکپائے۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

رما نے اچانک ہی چونک کر خان اور رجنی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں
الجھن نمودار ہوئی اور اس کے پس پردہ ابھرنے والے سوال سے بچنے کے لیے
وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور
لوگوں کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔

اس مرتبہ وہ جان بوجھ کر آگے بیٹھا تھا۔ ٹیکسی والا شاید کوئی مقامی تھا۔ وہ
مزے لے لے کر وہ بالی کی مرمت کی کہانی سنا رہا۔ وہ تمام واقعات ایسے بیان
جیسے موقعے کا چشم دید گواہ رہا ہو۔ کشور اور آشا تو اس کی گفتگو میں ضرورت سے
دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ البتہ رجنی، خان اور رما ہوں، ہاں ہی کر رہے تھے
اپنی سوچوں میں گم تھے۔

ٹیکسی پہلے ان کے گھر پہنچی۔ سب لوگ اتر گئے۔

میں رجنی بہن کو ڈراپ کر کے واپس آتا ہوں۔" اس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی

رجنی سکتے کی سی حالت میں بیٹھی رہی اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی ـــــ اس کے گھر سے کچھ
دونوں اتر گئے۔ رجنی نے اب بھی کچھ نہ کہا۔ جیسے ہی ٹیکسی آگے بڑھی وہ پھوٹ
پڑی:

"بھیا!" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"رجنی وہ جاپانی انسٹرکٹر جس سے میں نے مارشل آرٹس سیکھے تھے کہا کرتا تھا: کہ
سال اور اس کی شاگردی کروں تو انٹرنیشنل فائیٹ لڑ سکتا ہوں!! میں نے ابھی
ظاہر نہیں کیا نہ ہی میں زندگی میں غنڈہ گردی کا قائل رہا ہوں۔ لیکن تمہارا دکھ
برداشت نہیں ہوا۔ میں چاہتا تو بآسانی اسے کتے کی موت مار ڈالتا۔ لیکن یہ انتقام
بہتر نہیں تھا۔ میں نے اس کا پاؤں جس جگہ سے توڑا ہے دنیا کا کوئی ڈاکٹر جوڑ نہیں
ساری زندگی وہ اپاہجوں کی طرح گزارے گا اور لوگ اسے دیکھ کر ہنسا کریں گے۔
یہ راز صرف تمہارے اور میرے بیچ رہے گا۔ باقی لوگوں کی نشاندہی بھی تم کر
بھی اپنے کیے کی سزا ضرور بھگتیں گے۔ بس میری ایک درخواست ہے کہ اب
مطمئن ہو جانا چاہیئے اور تم یہ سروس صرف دیش کی سیوا کے لیے کرو۔ تمہارے
ایک بڑا بوجھ تھا بھائی ہونے کے ناطے میں نے اسے قدرے ہلکا کر دیا
زندگی کے سفر میں اب تم اکیلی نہیں رہو گی۔ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔"

"آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو شاید اگلے بھی کبھی جنم میں نہ
لیکن زندگی میں اگر کبھی ایسا وقت آگیا تو میں بھی آپ پر ثابت کر دوں گی کہ
کی بیٹی ہوں۔" اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ خان محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔
بھول جانا۔ ممکن ہے تب حالات مختلف ہوں اور تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو۔"

خان مسکرا دیا۔

"میرے جیتے جی ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں۔"

"اچھا شب بخیر۔" خان کہہ کر واپس مڑ گیا اُسے علم تھا کہ رُما کتنی بے چینی سے اس کی انتظار کر رہی ہوگی۔

رُما واقعی بے چینی سے اُس کی منتظر تھی اور خاصی سنجیدہ فکر آمیز تھی۔ وہ شک میں مبتلا کرنے کا خطرہ کبھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے ابھی ہر مسکراتے ہوئے کا استقبال بھی کیا تھا لیکن اِس مسکراہٹ کے لیے اُسے خود پر کتنا جبر کرنا پڑا تھا اندازہ صرف خان ہی لگا سکتا تھا۔

باقی سب لوگ تو اپنے اپنے بستروں میں جا گھسے تھے۔ رُما کا ہاتھ پکڑ کر وہ بڑی بے تکلفی سے اُوپر چھت پر لے آیا۔ اِس چھت پر بیٹھ کر اُس میں گھنٹوں گفتگو رہنا دونوں کا معمول بن چکا تھا۔

"مجھے معلوم ہے رُما تم کیا سوچ رہی ہو۔ تمہارے ذہن میں کیا کیا سوالات رہے ہیں۔ رُما میں نے زندگی میں بہت کشٹ اٹھا کر تمہیں حاصل کیا ہے اور تمہارے کا جو شیش محل میں نے سجا رکھا ہے۔ اُس میں اگر ایک بال بھی آجائے یہ میرے ناقابل برداشت ہوگا ـــــ ہاں۔ بالی کی ٹانگ میں نے توڑی ہے۔ میں نے تمہیں تھا کہ مارشل آرٹ کا ماہر ہوں۔ یہ آرٹ میں نے نیپال میں ایک جاپانی انسٹرکٹر سیکھے تھے اور دو سال تک اُس کی شاگردی اختیار کی۔ میں نے پہلے ہی روز تمہ کی محبت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ تمہاری ہر چیز سے مجھے والہانہ عشق ہے۔ یہ قدم نے صرف تمہاری خوشنودی کے لیے اٹھایا ہے ـــــ اور رجنی کو میں اپنی سگی بہنو بڑھ کر سمجھتا ہوں۔ شاید قدرت نے مجھے تم لوگوں سے ملایا ہی اسی لیے تھا کہ میرے

لوڑوں کا ازالہ ہو جائے۔ مجھے تمہاری محبت پر ناز ہے اور رجنی جیسی بہن پا کر فخر محسوس کرتا ہوں کہ وہ دیس کی سیوا کے لیے اتنی خطرناک نوکری کر رہی ہے....." وہ بولتا چلا گیا اور رُما کے اندر شکوک کا سر اٹھاتا ناگ شانت ہوتا گیا۔

ہر قدم پر اُس کے سامنے خان کا نیا روپ آ رہا تھا اور ہر روپ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوتا تھا۔

"مجھے اپنے مقدر پر رشک آنے لگا تھا۔ اُس روز پہلی مرتبہ بہت سنجیدگی سے اُس نے سوچا کہ ضرور کسی پچھلے جنم میں اُس سے کوئی بہت بڑی نیکی سرزد ہوئی ہے جو اِس جنم میں اسے اردن کمار جیسا ساتھی نصیب ہوا ہے۔

"آپ میرے تصورات سے بھی بڑھ کر عظیم ہیں۔ آپ دیوتاؤں کی طرح مہان ہیں ہیں..... میں تو آپ کی معمولی داسی ہونے کے لائق نہیں ہوں کمار جی! یہ آپ کا احسان کہ آپ نے مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دی۔" رُما احساسِ تشکر سے دب گئی تھی۔

"رُما! انسان کیا ہے؟ یہ تم ابھی نہیں سوچ سکتی مجھے دیوتا بنا کر خود سے دُور مت کرو میں اگر دیوتا بھی ہوتا تو تمہاری محبت پانے کے لیے انسان کا روپ دھار کر زمین پر آتا۔"

خان محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ باتیں وہ صرف ایکٹنگ کرنے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ حالت واقعی اُس سے یہ سب کچھ اُگلوا رہی ہے۔ جانے اِس لڑکی میں کیا سحر چھپا تھا اس کو اپنی شخصیت اُس کے سامنے دبی دبی محسوس ہوتی تھی۔

ـــــ وہ کھیل جو اُس نے اپنے بزنس کا حصہ سمجھ کر کھیلا تھا آہستہ آہستہ اب حقیقت کا روپ دھارنے لگا تھا۔

شعوری طور پر اُس کا دل اُس کی گرفت سے آزاد ہو کر اب رُما کی مٹھی میں چلا گیا تھا۔ اِس خوش آئند بات نہیں تھی۔ اُسے اپنے بچپن کی وہ کہانیاں یاد آگئیں: جب

ایسی ہی خوبصورت جادوگرنیاں شہزادوں کو پتھر کے مجسمے بنا کر اپنے غاروں میں سجا لیا کرتی تھیں۔

——— میں ممکن تھا کہ رُما کی محبت کا سحر اُسے پتھر کا بُت ہی نہ بنا کر رکھ دیتا۔

رُما نے اُس کی بات کا جواب صرف "اوں" کر کر دیا اور اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ خان کا ہاتھ بے اختیار اُٹھا اور اُس کی انگلیاں رُما کے بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔ ایک نامعلوم سی مدہوشی اُس پر چھانے لگی۔ ان بالوں میں دھنک کے ساتوں رنگ لہراتے نظر آ رہے تھے اور رنگوں کی اس دھنک میں وہ ڈوبتا چلا جا رہا تھا ———!!

Scanned and ... by Kamar Abbas

موت کی دستک

میڈر کھلنے میں ابھی کچھ روز باقی تھے اور خان جانتا تھا کہ صوبیدار سرکہی کی دوائی وہ دل پوری کرے گا۔

اُس کی ڈاڑھی اب چہرے پر نمایاں ہونے لگی تھی۔ حجامت بنوانی اُس نے چھوڑ دی تھی اور اپنے بالوں کا سٹائل بھی خان نے تبدیل کر لیا تھا۔ اگلے روز جب رحمی اُن سے ملنے آئی تو خوشی سے اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ دہلی کے اخبارات نے اُس کی نامعلوم حملہ آور کی طرف سے ٹھکائی اور پھر اُس کی ٹانگ توڑ کر اُسے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک جانے کے واقعات کو شہ سُرخیوں کے ساتھ شائع کیا تھا۔

بالی کو ہسپتال میں جا کر ہوش آیا تھا لیکن وہ کسی کی نشاندہی کرنے سے قاصر تھا۔ اُس نے پولیس کو صرف اتنا بیان دیا کہ حملہ آوروں نے چہرے چادر سے ڈھانپ رکھے تھے۔ اُس نے اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔ یہ بات اُس کے لیے باعث رحم تھی کہ ایک اکیلا آدمی اُس کے ڈیرے پر آیا اور اُسے مار مار کر بے ہوش کر گیا۔

ڈاکٹر نے ذاتی رائے دی تھی کہ جس بُری طرح اُس کا پاؤں توڑا گیا ہے اب اُس کے دوبارہ جُڑنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ کسی نے بڑے ماہرانہ طریقے سے یہ کام کیا تھا۔ اُس کے ساتھ ایسا سلوک ہونے پر شہریوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ اب پولیس اُس کی تگ و دو کی اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کے لیے چھاپے مار رہی تھی۔

Scanned by Camar Abbas

اردُن کی درخواست پر رُما نے اِس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھا تھا۔ اُس نے رجنی پر یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اردُن نے اُسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ چار چھ روز اُس نے کھوئے کھوئے پھرنے ہی میں گزار دیے۔ اُس روز بھی وہ رُما کے ساتھ ایک بار خانہ ہوٹل میں بیٹھا تھا جب ایک بیرا اُس کے نزدیک آکر رُکا۔

"آپ ہی کا شُبھ نام اِردن کمار ہے؟"

"ہاں" — خان کے بجائے رُما نے جواب دیا۔

"یہ چٹھی آپ کے نام ایک صاحب دے گئے ہیں۔" بیرے نے اُسے ایک بند لفافہ تھما دیا۔

"اوہ وہی گدھا ہوگا" — خان نے حیرت انگیز پھرتی سے اپنا موڈ بدل لیا تھا۔ بڑے کھلنڈرے انداز میں لفافہ پھاڑ کر کاغذ نکالا — "اجی صاحب! آج کل تو خطوں نے لڑکوں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ایک دو انگریزی فلمیں کیا دیکھ لیں خود کو جیمز بانڈ سمجھ لیتے ہیں۔ اب اِس گدھے دلیپ ہی کو دیکھ لو مجھے مِل بھی تو سکتا تھا۔ نہیں ملا۔ رقم دے گیا ہے۔ وصیت تیرے کی۔" اُس نے رقعہ پر پھرتی سے نظریں دوڑائیں اور ذکر کی ایک فون نمبر حفظ کر کے رقعے پھاڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"یہ کیا؟" رُما بولی۔ "جیب میں آپ نے کاغذوں کے ٹکڑے کیوں ڈال لیے؟"

"کیا میں لوگوں کی طرح نادانی کروں؟" اُس نے فرش پر بکھرے ہوئے کاغذوں کی طرف اشارہ کیا —

اور یہ کہتے ہی اُس نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور پھر باقاعدہ ہنسنا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہُوا؟" — رُما نے حیرانگی سے پوچھا۔

"مل گیا سالا — معلوم ہے کیا لکھا ہے؟"

"کیا —— رُما کی حیرانگی ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔

"لکھا ہے۔ میں کباب میں ہڈی بننا نہیں چاہتا۔ اِس لیے تمہیں ملے بغیر جا رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر اُس نے پھر باقاعدہ ہنسنا شروع کر دیا۔ اِس مرتبہ وہ اکیلا نہیں ہنسا تھا۔ رُما نے بھی اِس کا مکمل ساتھ دیا تھا۔

خان نے کمال ہوشیاری سے معاملہ گول کر دیا تھا اور اصل بات کی اُسے ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔

اصل میں یہ خط اُسے مقامی سپلائی ماسٹر کی طرف سے لکھا گیا تھا جس میں اُس کے لیے اپنے کلک سے کسی خصوصی پیغام کی خبر دی گئی تھی جو اُس نے مکتوبہ نمبر ڈائل کر کے حاصل کرنا تھا۔ خان کو اب بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ جلد از جلد یہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے تو ایک پل بھی فارغ رہنا گوارا نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اُٹھ کر گھر جا رہے تھے۔ خان نے رُما پر اپنے رویے میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی ظاہر نہ ہونے دی تھی۔ بلکہ رُما کے ذہن سے ہی یہ بات نکل چکی تھی کہ کسی نے خان کو ہوٹل میں کوئی خط بھی لا کر دیا تھا۔

رجنی واپس جا چکی تھی۔ دونوں نے خاصا وقت ایک دوسرے کی معیت میں گزارا تھا۔ بال کی ٹامک ٹوئیاں ٹوٹنے کے بعد سے اب رجنی خاصی نارمل ہو گئی تھی۔ ایک بات تو خان نے خاص طور سے محسوس کی تھی: کہ اُس کا رویہ اب پہلے ایک دو روز والا نہیں رہا تھا وہ خان کی ہر موجودگی میں تو رُما کے ساتھ وہی غیر سنجیدہ گفتگو اور حرکتیں کرتی تھی۔ لیکن خان کے وہاں آتے ہی سنجیدگی اختیار کر لیتی تھی۔ خان محسوس کرنے لگا تھا کہ اب وہ اُس کی دل سے عزت کرتی ہے۔

○

اُسی رات اُس نے مطلوبہ ٹیلی فون نمبر ڈائیل کر کے اپنے متعلق تازہ احکامات

حاصل کر لیے تھے ـــــ اُسے بتایا گیا تھا کہ: "آج سے ٹھیک دس روز بعد، جب گھڑی کی سوئیاں تین اور بارہ کے ہندسوں کو چھو رہی ہوں تو اُسے انبالہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جانا چاہیئے ـــــ نئے دوست کی پہچان اُسے کرا دی گئی تھی اور باقی احکامات اُسی سے حاصل کرنے تھے۔"

"انبالہ شہر!" "اے ساہنی!!" ـــــ یہ دونوں الفاظ دُہراتے دُہراتے اُس نے رات کاٹی اور جب صبح ہوئی اور وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہوئے تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ "روزمرہ کی ڈاک میں اُنہیں سپلائی آرڈر موصول ہو گیا ہے۔"

زمانے نے اُسے بتایا کہ ـــــ "رجبی کی چھٹی ختم ہو گئی تھی شاید دو ایک روز بعد ہی وہ گھر آئے۔"

○

دو تین روز بعد خان اور سہائے ایک کرائے کے ٹرک پر مال لاد کر میرٹھ چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔

اُن کی آمد کی اطلاع پا کر صوبیدار بلاقی رام دروازے پر ہی آ گیا تھا۔ اُس کے "کلیئر" کرنے کے بعد ہی ٹرک کو اندر جانے کی اجازت ملی تھی۔ مطلوبہ سٹور کے دروازے پر پہنچنے تک بلاقی رام نے اُنہیں یہ بریفنگ بھی کر دی تھی: "کہ وہ اپنے کرنل صاحب کی موجودگی میں اُنہیں ڈانٹ ڈپٹ بھی کرے گا لیکن اُنہیں بُرا نہیں ماننا۔"

خان کی عقابی نظریں بڑی بے چینی سے اطراف میں بھٹک رہی تھیں۔ اُس نے سپاہیوں کی آمد و رفت سے اندازہ لگایا تھا: "کہ یہاں زیادہ تر سکھ رجمنٹیں ہی رکھی جاتی ہیں۔" اُن کو مال دہیں اُتار کر "کرنل صاحب" کی موجودگی میں دوبارہ چیک کیا گیا تھا اور کرنل صاحب نے کمالِ شفقت کا ثبوت دیتے ہوئے اوکے کر دیا تھا۔

جہاں وہ لوگ موجود تھے وہ ایک بیرک نما گودام تھی جس کی پشت پر فٹبال بازی کی

مشق ہو رہی تھی۔ اِرد گرد کھلی جگہ پر جوان مشقیں کر رہے تھے۔ خان بڑی دلچسپی سے اُنہیں ورزشیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی سی بیرک کے پیچھے سے ایک دستہ نمودار ہوا جسے دیکھ کر خان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اُن لوگوں کو پہچان گیا تھا لیکن تصدیق بھی ضروری تھی۔

"صوبیدار جی!" بالآخر اُسے موقعہ مل ہی گیا۔ "ہم نے تو سُنا تھا کہ فوجی لوگ ڈسپلن کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ لیکن کمال ہے۔ یہ لوگ تو دھوتی کے ساتھ ہی مشقیں کر رہے ہیں۔" اُس نے سامنے سے آتے ہوئے نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے یہ لوگ باقاعدہ فوجی نہیں ہیں۔" بلاقی رام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کون ہیں یہ؟" خان کے بجائے سہائے نے پوچھا۔

"تم تو اپنے لوگ ہو۔ کسی کو بتانا نہیں۔ یہ راز کی باتیں ہوتی ہیں۔" بلاقی رام نے اُن کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "یہ "مکتی باہنی" ہے۔"

"مکتی باہنی کیا؟" خان نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

"ـــــ اُدھر ڈھاکہ سے جو لوگ بھاگ کر آتے ہیں ہم اُنہیں ٹریننگ دے کر واپس پاکستان واپس بھیج رہے ہیں۔" بلاقی رام نے سمجھایا۔

"یہ سب لوگ اُدھر ہی کے ہیں؟" سہائے بھی گفتگو میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

"ارے نہیں یار! اب تمہیں ساری باتیں کیسے بتا دوں۔" بلاقی رام نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔ "ان میں بمشکل پانچ سات اُدھر کے ہیں۔"

"اور یہ باقی پندرہ بیس کون ہیں؟" خان نے پوچھا۔

"وہ تو محکمہ کے ہیں اور دراصل یہی لوگ تو اُدھر جا کر اصلی کام کریں گے۔ جو خود کو عوام بتا کر لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسائیں گے۔ اُنہیں ٹریننگ

دیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں جا کر قوڑ چھوڑ کی کارروائیاں کریں گے۔ ابھی یہ کام تھوڑے پیمانے پر ہو رہا ہے جیسے جیسے حالات ہمارے حق میں ہوتے جائیں گے ہمارا کام آسان ہوتا چلا جائے گا۔ بس یار! اتنا ہی کافی ہے۔ تفصیلات وغیرہ کرنیل جانی چاہیئے۔" بلاقی رام بڑی مکاری سے مسکرانے لگا۔

خان نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے کلیجے میں ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ آج جو کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور ان سے پہلے جو کچھ معلومات اسے حاصل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اسے عجیب عجیب خدشات اس کے دل و دماغ میں جڑ پکڑنے لگے تھے۔

دشمن بڑی مکاری سے آہستہ آہستہ اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ مرحلوں پر شرنارتھیوں کے کیمپ اکھاڑ دیئے گئے تھے۔ وہاں کیمپوں میں نام نہاد شرنارتھیوں کو مالی امداد سے حاصل کردہ خوراک کا صرف ایک تہائی حصہ دیا جاتا تھا۔ بقیہ سب کچھ بھارت سرکار خود ہضم کر جاتی تھی اور شرنارتھیوں کے پیٹ زہریلے پروپیگنڈے سے بھر دیا جاتا تھا۔ یہ پروگرام اس حکمت عملی سے کیا جا رہا تھا کہ بھوکے بھڑکے ہوئے جنونی جان ہی نہ سکیں اور بڑی سادگی سے اپنے ہی دشمن کی مٹھی میں دیتے چلے جائیں۔

حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ بلاقی رام کو مزید کریدنا شروع کر دیتا۔ اس لئے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا مگر بوقت رخصت پھر اسی ایشو پر بولنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی معلومات کا زعم گھٹنے کے چکر میں زخم اگلتا چلا گیا اور خان کے ذہن میں وہ سب نقش ہوتا رہا۔ بلاقی رام مظلوم بنگالیوں کو جس تماشا کا لیبل دیتے نہ تھکتا تھا وہ ان کا ذکر بہت حقارت سے کرتا تھا۔

بھارتی فوج کا ایک نام صدر ہوتے ہوئے بھی اس کی اشد خواہش تھی کہ اکھنڈ بھارت کا خواب پورا ہو جائے۔ وہ راس کماری سے خیبر کی چوٹیوں تک

اپنے باپ کی وراثت سمجھتا تھا۔

اس نے جو سات آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں ان کے دوران ہی تاریخ کے ٹیچر نے اس کے کانوں میں یہ زہر ڈال دیا تھا کہ موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کی مدفون تہذیبیں اسی کے آباؤ اجداد کی وراثت ہیں۔

اور اب اس کے دل میں بہت سی خواہشیں جاگزیں ہو گئی تھیں۔ کہ وہ ان سب علاقوں کو جیسے بھی ممکن ہو بھارت ماتا کے تصرف میں لے آئے اور یہی عزم لے کر وہ فوج میں گیا تھا۔

لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اس نے اپنی فوج کی جو درگت پاکستانیوں کے ہاتھوں بنتے دیکھی تھی۔ اس کے بعد سے اس کو یہ یقین بھی ہو چلا تھا کہ لڑ کر وہ اپنا خواب کبھی پورا نہیں کر سکتے تھے۔

صوبیدار بلاقی رام پرلے درجے کا بے ایمان فوجی تھا۔ اس کے توسط سے سپلائی کی لگژری اس کے افسران کے گھروں میں پہنچتی تھی۔ وہ بلا کا شراب نوش بھی تھا اور کوئی ایسی اخلاقی برائی نہیں تھی جس کا وہ شکار نہ رہا ہو۔ لیکن وہ اندر سے مکمل ہندو تھا۔ روزانہ نہیں تو ہفتہ بھر میں ایک مرتبہ ہی سہی وہ مندر میں ضرور جاتا تھا۔ اس کے جذبات بھی مسلمانوں کے متعلق وہی تھے جو ایک ایماندار ہندو کے ہونے چاہئیں۔ وہ بھی اسی دیوانے کا شکار تھا جس کے شکار اس کے باقی بھائی بند تھے۔ ان کا ایک ہی خواب تھا: پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا گھناؤنا، مکروہ اور بھیانک خواب۔

دوپہر کا کھانا دونوں نے بلاقی رام کے ساتھ اس کے آفس میں ہی کھایا تھا۔ اس کا واقعی اس نے کھانا زہر مار کیا تھا۔ حالانکہ انس کا دل کھانے کی طرف دیکھنے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ اس کے فرائض میں شامل تھا کہ اپنے جذبات کو اپنے اندر ہی مار ڈالے۔ اسے لاشعوری طور پر بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیئے تھی جو اس کی شخصیت

کو مشتبہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے بادلِ نخواستہ ہی سہی بلاقی رام کی بات مان لی تھی۔

بڑے جوش و خروش سے ہوئی تھی۔

بلاقی رام کے ساتھ کیے گئے معاہدے میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ بل کی ادائیگی بلا از جلہ کروائے گا کیونکہ اپنی کمیشن کا بقیہ بھی اُسے اسی صورت میں ملنا تھا۔

سہ پہر تک وہ بلاقی رام کے ساتھ رہے، پھر دہلی روانہ ہو گئے۔ میرٹھ سے دہلی تک خان سوچوں کے تانے بانے اُلجھاتا اور سُلجھاتا رہا ــــ ہر آنے والا لمحہ اُس کے لیے کوئی نہ کوئی بُری خبر لے کر آ رہا تھا۔

اور وہ محض دل کو یہ کہہ کر نقلی تسلیاں دیتا رہتا:

آخر وہ اِن منصوبہ بندیوں اور تیاریوں کی اطلاع ہر وقت اپنے ملک کو تو دے رہا ہے ــــ یقیناً وہ لوگ دشمن کی حکمتِ عملی جان کر اُس کے تدارک کے لیے عملی اقدامات کر رہے ہوں گے:

○

بلاقی رام قریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی کام سے دہلی آیا کرتا تھا اور اپنے بل کی وصولی کے سلسلے میں خان نے بھی اُس سے دو تین ملاقاتیں ضرور کیں، لیکن بل کی وصولی تو ایک بہانہ ہی ہوتا تھا اصل میں تو وہ کمپنی باہنی کی میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں ٹریننگ ہی کی معلومات اُس سے اگلوا رہا تھا۔ اور اس دوران یہ ــــ اُس کا معمول بن چکا تھا کہ وہ ہر دوسرے دن ان معلومات پر مبنی رپورٹ اپنے ملک ضرور بھیجا کرتا۔

بلاقی رام ہی کے تعاون سے اُنھوں نے دو اور نئے انڈر گراؤنڈ بھی داخل کر دیے تھے جن کی وصولی ہونے پر اُس نے سب سے پہلے بلاقی رام کو اُس کے حصے کی کمیشن ادا کی تھی۔ اور اب ایک درمیانی سی موٹر سائیکل بھی ان لوگوں نے خرید لی تھی جو زیادہ تر کشور کے تصرف ہی میں رہنے لگی تھی۔

اخبارات نے کئی روز تک قربالی کی خوب درگت بنائی تھی ــــ اب وہ ہسپتال سے نکل آیا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے اُس کا پاؤں جوڑنے سے معذرت کر لی تھی۔ اُن کے نزدیک اب اُس کا علاج ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ بالی نے شرمندگی کے مارے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا اور اُس کو کمزور دیکھ کر پولیس نے بھی اپنے سابقہ ارمان پورے کر لیے تھے: اُس کے ایک ایک ساتھی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

رجنی سے خان کی ملاقات کتنے ہی دنوں کے بعد ہوئی تھی اُسی کی زبانی اُسے علم ہوا، کہ پاکستانی فوج کے کچھ افسر بھاگ کر یہاں آئے ہوئے ہیں اور اُن میں سے کچھ را کے مرکزی ہیڈ کوارٹر میں توڑ پھوڑ کی تربیت بھی حاصل کر رہے ہیں ــــ ان افسران کا دل بہلائے رکھنے اور انھیں بھارت کا دوست بنائے رکھنے کے لیے اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ را کی تربیت یافتہ ایک ایک لڑکی کو بھی چپکا دیا گیا ہے۔

اُس روز جب خان پہلی مرتبہ رجنی کو موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا کر دسمت دوارکا ٹریننگ سکول میں چھوڑنے گیا تو دروازے سے اپاٹک ہی اُس نے رجنی کے ساتھ ایک آفیسر کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ جو اُسے دیکھتے ہی گولی کی طرح سیدھا اُس کی طرف آیا۔ اُس نے جھک کر اُس کا تعارف اپنے بھائی سے کروایا اور بعد ہوئی کہ خان اندر آئے خان اندر آیا۔ اُس نے ضروری کام کا بہانہ کر دیا تھا۔ اِس طرح دو تین مرتبہ وہ رجنی کو لینے کے بہانے یہاں تک آیا اور اُس کے بعد ہونے پر بھی اندر نہ گیا۔ آخر وہ کوئی کچا نہیں چاہتا تھا۔

○

چند ہی روز بعد ایک دن تینوں نے اکٹھے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا اور رجنی نے خان سے درخواست کر دی کہ وہ اُسے دفتر سے لے آئے ــــ کشور سے موٹر سائیکل مستعار لے کر وہ دفتر پہنچ گیا۔

آپ نہیں جانتے کہ ہر بہادر آدمی کی ایک بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔" اُس نے شراب کے پیگ سے ایک گھونٹ بھرا۔

خان خاموش رہا۔ وہ اُسے زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقعہ دینا چاہتا تھا تاکہ حقائق زیادہ سے زیادہ اُگلوا سکے۔ وہ خاموشی اور انہماک سے میجر کبیر کو دیکھتا رہا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر بہادر آدمی کی ایک بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ کہ وہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اور مسٹر فرون کمار ــــ یہی ہمارے ہتھیار ہیں۔ ہماری حکمت عملی یہی ہے کہ ہم نے اُن کی اس کمزوری کی آڑ میں خود کو چھپا کر رکھنا ہے ورنہ ہمارے اس حملے کا توڑ پاکستانی فوج کے پاس نہیں ہے۔ ویسے یوں بھی اَن دیکھے دشمن کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟"

اُس نے ایک اور لمبا گھونٹ بھرا اور ہچکی لے کر خان کی طرف جھک گیا۔ خان کو اُس سے کراہت آنے لگی تھی۔ شراب کی بدبو کے جھبکے اُس کے منہ سے اٹھ رہے تھے لیکن خان نے اپنے چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر نہ اُبھرنے دیا۔ وہ ہمہ تن گوش اُس کی گفتگو سن رہا تھا۔

"میں زیادہ باتیں نہیں کرتا کمار! تم خود ہی سب کچھ دیکھ لو گے۔ اس کھیل کو اب تو ہی سمجھو مسٹر کمار! بس چند دنوں کی اور بات ہے پھر ہم ہوں گے اور ہمارا بنگلہ دیش ہوگا۔"

"ایک بات تو بتاؤ مسٹر کبیر! اگر دُنیا کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ سب کچھ بھارت کے اشارے پر ہو رہا ہے تو ہم بین الاقوامی دنیا میں بدنام ہو جائیں گے۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہیں گے۔" اُس نے کبیر کو مزید کریدنا چاہا۔

"کمار جی! مجھے تو آپ کے ہندو ہونے پر شک ہے۔ میں نام ہی کا سہی بہرحال مسلمان ہوں اور چند مہینے آپ ہی کے ہم قوم لوگوں میں گزارنے کے بعد یہ جان گیا ہوں،

Scanned with CamScanner

رحمٰنی نے گیٹ پر ہی اُس کی آمد کی رپورٹ کر رکھی تھی۔ مالک سیکورٹی گارڈ اُسے بڑے احترام سے ایک بڑے سجائے کمرے میں لے گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں اُسے وہی میجر شراب پیتا نظر آگیا۔ خان نے اس طرح نظریں پھیر لیں۔ گویا اُسے جانتا ہی نہیں۔ رحمٰنی نے انٹرکام پر اُسے بتایا کہ وہ دس پندرہ منٹ بعد "کامن روم" میں آجائے۔ اب یہ تمام اُسے بہرحال اس میجر کے ساتھ گزارنا تھا جس نے خان کو پہچان کر اپنا بک ہی اُس کے نام کا نعرہ لگا کر اُس نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"میرا نام میجر کبیر ہے ــــ" اُس نے خان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میرے نام کا تو آپ کو علم ہو ہی گیا ہوگا ــــ" خان نے اپنا لہجہ خاصا سنجیدہ کر لیا تھا

"ہاں رحمٰنی آپ کی بہت تعریف کرتی رہتی ہے۔"

"پچھتائے گی ایک دن۔ میری تعریف کرنے والا کبھی خوش نہیں رہتا۔" خان نے مسکرا کر کہا۔

جواب میں کبیر نے بھی بڑے بے ہودہ انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔ خان کو تو اُس کی موجودگی ہی کھل رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے بزنس کے اصولوں پر بڑی سختی سے کاربند تھا۔ اُس کے ذاتی جذبات یہاں کچھ معنی نہیں رکھتے تھے۔

"کون سا شہر تھا آپ کا ــــ؟" خان نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"کھلنا ــــ میں اُدھر کھلنا کے نزدیک ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔" اُس نے خان کو بتانا شروع کیا۔

"آپ نے بڑی دلیری دکھائی "بنگلہ دیش" کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟ سنا ہے فوج بہت مضبوط ہے۔" خان نے اُسے ٹٹولنا چاہا۔

"مسٹر کمار میرا تعلق بھی اُسی فوج سے رہا ہے، واقعی وہ بہت بہادر فوج ہے۔ ہماری پلاننگ اتنی زبردست ہے کہ اس سے سو گنا زیادہ بہادر فوج بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

"کر ضمیر نام کی کوئی شے ہمارے ہاں نہیں پائی جاتی ـــــ بھئی شرمندگی کس بات کی! یہ تو سیاست کا کھیل ہے منافقت اور جھوٹ کا کھیل! یہ دُنیا اُسی کی ہے مسٹر کمار جو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے جھوٹ بول سکے اور اُسے سچ ثابت کر کے دکھا دے۔" شراب کا خالی پیگ ایک طرف رکھ کر اُس نے سگریٹ سلگایا۔

"مسٹر ہردن کمار! اگر تھوڑی دیر کے لیے آپ کی بات مان ہی لی جائے تو بھی آپ کو تو علم ہوگا ہی کہ ٹیکساپ کی بہن بھی اسی دفتر میں کام کرتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر لوگ یہ کام کر سکتے ہیں ـــــ اُن پر ہم نے پہلے ہی جال پھینک دیا ہے۔

مسٹر کمار! پاکستان کے ہر سفارتخانے میں ہماری لڑکیاں پہنچ گئی ہیں۔ بنگلہ دیش کی ہر وہ چھاؤنی جہاں بنگالی یونٹیں قیام پذیر ہیں وہاں 'را' کی تربیت یافتہ ایجنٹ عورتیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ مسٹر کمار!" اُس کی آواز اب نشے میں ڈگمگانے لگی تھی۔ "یہ بڑی بڑی لڑکیاں ہیں۔ ناگن ہیں ناگن۔ جس پر ایک مرتبہ پھونک دیں وہ اس کے زہر سے نہیں بچ سکتا۔"

خان نے محسوس کیا جیسے میجر کبیر خود بھی کسی ایسی ہی ناگن کا شکار ہو کر 'را' کے اس دفتر تک پہنچا ہو۔ آخری فقرہ بولتے ہوئے اُس کا لہجہ خاصا گھمبیر ہو گیا تھا۔

"اچھا مجھے جانا ہوگا رجنی میرا انتظار کر رہی ہوگی" ـــــ خان نے محسوس کیا تھا کہ یہ آؤٹ ہو جائے گا۔ میجر کبیر نے اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے چوتھا پیگ بھی تیار کر لیا تھا۔

میجر کبیر اُسے روکتا ہی رہا لیکن خان اُس کے خلوص کو ٹھکرا کر آ گیا۔ کامن روم کے باہر ہی اُسے رجنی ٹکرا گئی۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ؟" اُس نے پھٹتے ہی پوچھا۔

"جہنم میں۔ وہ تمہارا بنگالی دوست مل گیا تھا۔" خان نے بوریت ظاہر کی۔

Scanned and PDF

"ارے بھیا! آہستہ بولو۔ بھگوان کے لیے کہیں کوئی سن نہ لے۔"

"یہ تو ہے بھئی۔ یہ تم انٹیلی جنس والے آخر انہیں مفت کی روٹیاں کھلانے سے تو رہے۔"

"اچھا چھوڑیئے اس بک بک کو۔ صبح سے رات تک یہی سننا اور کرنا پڑتا ہے۔ کم از کم آپ تو اس موضوع کو نہ چھیڑا کریں۔" رجنی نے گفتگو سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔

"دیکھو بھئی مجھے تو ویسے بھی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن اپنی بہن جو اس گورکھ دھندے میں پھنسی ہے تو اس سے غیر متعلق تو نہیں رہا جا سکتا ناں۔"

"پھر وہی بات....." رجنی نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں۔

"اچھا جانے دو ـــــ آؤ چلتے ہیں" ـــــ خان نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

دونوں بڑی بے تکلفی سے چلتے ہوئے دروازے سے باہر آ گئے۔ دروازے پر متعین گورکھا گارڈ نے آج پھر خان کو بڑی حسد بھری نظروں سے دیکھا۔

○

رجنی کو ساتھ لے کر وہ گھر چلا آیا۔ موٹر سائیکل کشور کو شکریہ کے ساتھ واپس کر کے وہ تینوں ـــــ را، رجنی اور خان سینما ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔

فلم نئی تھی اور خاصی دلچسپ بھی لیکن خان کے لیے تو اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

اُسے تو ایک ہی سوچ کھائے جا رہی تھی: مستقبل کی سوچ۔

ـــــ جب وہ چشمِ تصور سے اپنے مشرقی پاکستان کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تو سانس کی نسیں ٹوٹنے لگتیں اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا۔ بس ایک اُمید تھی کہ جو کبھی کبھی اس گھٹور اندھیرے میں اُس کے لیے شمع بن کر اُجالا پھیلانے لگتی وہ سوچتا: آخر ہے ہی بنگالی تو ایسے نہیں؛ اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس کے دل سے ہوک

سی اٹھنے لگتی ؛ آخر ایسے وہ کتنے لوگ ہیں ؟"

آٹے میں نمک کے برابر بھی ان کی تعداد نہیں ! ان کے بھائی بند ہی انہیں ڈالیں گے ۔"

وہ خود کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے آپ سے کہنے لگتی ۔

○

رجنی کے اندر سوئی ہوئی عورت کو اس نے بھائی کا پیار دے کر اسی جگہ تھا ۔

خان محسوس کرنے لگا تھا کہ واقعی رجنی اسے اپنا سگا بھائی تصور کرنے لگی ہے اس کی ضروریات کا اتنا خیال رکھتی تھی ۔ اس کو اتنا احترام دیتی تھی کہ خان کو گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگتی ۔ وہ سوچتا : آخر تو اسے اپنے نمک واپس چلے جانا ہے ۔ جانے کب اسے اگلا حکم موصول ہو ۔ اور وہ اپنا بوریا بستر گول کر جائے ۔ تب رجنی اور رما پر کیا گزرے گی ؛ خود وہ لاشعوری طور پر رما کے اتنا قریب آچکا تھا کہ اب وہاں سے واپسی کو اس ہی اس کے لیے جان لیوا تھا ۔

ان کے ایک ہمسائے جن کے ہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا یہاں سے گھر شفٹ کر رہے تھے ۔ خان نے پچھلے آٹھ دس روز سے ہمسائے کو ان کے پیچھے لگایا ہوا تھا کہ لوگوں سے ٹیلی فون خرید لیا جائے ۔ اس روز جب وہ لوگ فلم دیکھ کر گھر واپس لوٹے خان کے لیے خوشخبری موجود تھی کہ مسز سہائے نے بالآخر دو ہزار روپے پر سودا طے کر لیا اس دوران ان لوگوں نے ایک اور ایئر بھی سپلائی کر دی تھی اور گھر میں اتنا سامان آ گیا تھا کہ اب یہ سب کچھ گھر کے لیے ضروری سمجھا جانے لگا تھا ۔ کشور اور آشا نے تو بہت کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا ۔

خان کا یہ معمول بن چکا تھا کہ وہ تین چار روز بعد کسی نہ کسی بہانے رجنی کے گھر

فرار ہو گیا تھا ۔ رجنی کی سہیلیاں اور اس کے دوست اب خان کو رجنی کے بھائی کی حیثیت سے جاننے لگے تھے ۔ رجنی اس دفتر کی ہر دلعزیز شخصیت تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ساتھیوں نے خان کو ہاتھوں ہاتھ لیا ۔

خان نے اپنی آنکھوں سے یہاں بھی غدار بھگوڑوں کو تربیت حاصل کرتے دیکھ لیا تھا ۔ یہ اس کا کمال تھا کہ اس نے ان لوگوں کی تصاویر بھی حاصل کر لی تھیں اور کسی کو ان کان خبر بھی نہیں ہونے دی تھی ۔ پھر یہ تصاویر بھی اس کے نمک میں محفوظ ہاتھوں نمک منتقل ہو گئیں ۔

اس روز وہ رجنی بہن سے مل کر گھر واپس لوٹا تھا جب تھوڑی دیر بعد اس کے لیے ٹیلی فون آگیا ! ان تین چار ماہ میں اس نے دہلی میں پانچ دس ایسے دوست بنا لیے تھے جو اسے فون کر سکیں ـــــ اس طرح وہ اپنی دانست میں گھر والوں کو بھی کسی قسم کا شک کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا ۔

ٹیلی فون اس نے خود ہی اٹھایا تھا ۔ دوسری طرف اردن کمار کے لیے ہی فون تھا ۔ جب خان نے بتایا کہ وہی اردن کمار ہے تو جواب میں جو نام فون کرنے والے نے بتایا اس پر وہ خاصا محتاط ہو گیا ۔ اس نے ٹیلی فون کا یہ چکر ہی اس لیے چلایا تھا کہ بجائے خود فون کرتے رہنے کے یہیں پر معصومانہ انداز میں پیغامات وصول کر لیا کرے ۔

دوسری طرف بولنے والے نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے خان سے کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ واقعی اس کا مخاطب اردن کمار ہی ہے تو اس نے خان تک تازہ احکامات پہنچا دیئے : اب اسے تین روز بعد اگلے مشن پر روانہ ہونا تھا ۔

○

اگلے روز رما کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش تھی ۔ رما تو اس کے لیے بالکل تیار نہ تھی ۔ یہ بھی خان ہی تھا جس نے اس سے زبردستی یہ سب کچھ کروا لیا تھا ۔ یہ نمائش اس کے کالج

Scanned and ... Best Way to Pay ... Online Acc...

میں ہی لگی تھی۔ دونوں اکٹھے ہی کالج پہنچے تھے۔

اُس روز خان نے محسوس کیا: کہ رُما واقعی کوئی غیر معمولی لڑکی ہے ـــــ خدا جانے یہ اُس کی محبت کا اثر تھا یا پھر رُما کے اندر موجود آرٹسٹ کی کرامت کہ خان بھی ان تصاویر پر ایک نظر ڈال کر تو دنگ ہی رہ گیا! حالانکہ یہ سب پینٹنگز رُما نے اُس کے سامنے اُس کی موجودگی ہی میں تیار کی تھیں لیکن آج جب اُنہیں باقی آرٹسٹوں کی بنی ہوئی پینٹنگز کے مقابلے میں لگایا گیا تو اُن کی انفرادیت چیخ چیخ کر اپنے بنانے والے کی عظمت کی گواہی دے رہی تھی۔

خان کو یوں محسوس ہوا جیسے فضاؤں میں موجود سارا حسن رُما کی انگلیوں کے راستے کینوس پر پھیل گیا ہو۔ وہاں موجود ہر شخص رُما کی تعریف کر رہا تھا۔ ہر نوجوان اپنی پینٹنگز کی طرح خوبصورت اِس آرٹسٹ لڑکی سے دو باتیں کرنے کا متمنی تھا لیکن وہ سوائے خان کے کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ خان نے وہاں کئی آنکھوں میں اپنے لیے رشک اور حسد کے ملے جُلے جذبات موجزن دیکھے جنہیں دیکھ کر خود پر فخر ہونے لگا کہ رُما جیسی لڑکی اُس کی محبوبہ ہے۔ احساسِ تفاخر سے اُس کے اندر ایک عجیب اور پُراسرار سا طمانیت کا احساس اُبھرا۔

اُس لمحے خان نے سوچا: "زندگی کا سارا لطف اِسی پُراسراریت کا مرہونِ منت ہی تو ہے جو ایک خاص نوع کی بے یقینی کی صورت سے جنم لیتا ہے اور نگاہوں سے اُگے بے یقینی کی دھند اگر صاف ہو جائے تو حقیقت ہمیشہ مایوس کُن انداز ہی میں ظاہر ہوتی ہے اِسی لیے تو مادی جسم اور مجرّد دونوں طرح کی شخصیتیں کبھی بھی اِس المناک صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوتیں۔ جس سے موت یا مایوسی کا روایتی تصور وابستہ ہو۔"

اُسی روز جب سہ پہر کے بعد وہ رُما کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے جھنگ کے کنارے آیا۔ خوبصورت تفریح گاہ میں زندگی کے لطف سے حُسن اندوز ہو رہا تھا تو اُسے یہ ادراک نہیں ہوا تھا

بُرائی اور موت ہی زندگی کا سب سے بڑا المیہ نہیں ہے!

اُس نے سوچا: دراصل زندگی ہی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

ـــــ زندگی کا آغاز تو دُسیدہ کلیوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ دُھلے دُھلائے پھول چہرے، جسم و روح، حوادث و واقعات کی خراشوں سے پاک صاف اور مستقبل کے پہاڑوں کے دامن میں رواں دواں زندگی کی چاندی ایسی لکیر جس میں کوئی غم دکھائی نہیں دیتا! ہم خوش و خرم بانہوں میں ہاتھ ڈالے اس کے کنارے کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

پھر آہستہ آہستہ ہاتھوں سے ہاتھ جُدا ہونے لگتے ہیں۔ قدموں کے زاویے ٹیڑھے ہونے لگتے ہیں۔ حیات نئے دائرے بنانے لگتی ہے ـــــ یادوں کی زیت پر چہروں کے بننے مٹنے کا عمل تیز اور پھر تیز تر ہونے لگتا ہے۔

دونوں دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ دونوں نے پائنچے اُوپر چڑھا رکھے تھے اور پانی میں پاؤں لٹکائے ایک دوسرے میں گم صم بیٹھے تھے۔ رُما کبھی کبھی کوئی کنکر پانی میں پھینکتی تو وہاں دائرے سے بننے اور مٹنے لگتے۔ دائرہ حرکت میں آتا تو خان کو ماضی کی کہانی متحرک تصویروں کی صورت اِس میں نظر آنے لگتی وہ چند لمحوں میں پوری زندگی بسر کر جاتا۔!

تصوریت کی پرچھائیوں پر جب حقائق کی تلخیاں غلبہ پانے لگتیں تو اُسے یاد آنے لگتا: "کہ باوجود رُما اُس سے چھُٹ جائے گی" اور یہ خیال آتے ہی خان کو یوں لگتا جیسے کوئی چیز اُس کے اندر مر گئی ہو۔ یہ مراجعت کا لمحہ ہوتا۔

ممکن تھا کہ لمحہ طویل ہو کر اُس کے روحانی ارتقاء کے تسلسل کو توڑ ڈالتا جب رُما نے اُسے اپنی طرف مخاطب کر کے حالات کے تانے بانے سے باہر کھینچ لیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ صبح سے کیا سوگواری خود پر طاری کر رکھی ہے آپ نے؟"

"کچھ نہیں کوئی بات نہیں۔ بس ایسے ہی آج کچھ....." اُسے جھنگ کی بات متوجہ ہی

نہیں رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کیا جواب دے۔ "رما بس کسی وقت ایسا ہو جاتا ہے۔ تم تو جانتی ہو نا جیسے وقت ایک سا نہیں رہتا۔ اِس طرح انسان کا موڈ بھی ایک طرح کا نہیں رہتا۔"

وہ خاموش ہو کر پھر دریا کے تڑپتے پانی کو گھورنے لگی تھی۔

"اروِن کُماری!" رما نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "آپ کچھ نہ بتائیے لیکن جنا سب کچھ جانتی ہے۔ دریا کے پانی سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے ــــ کُماری! میں جب کبھی بہت اداس ہوتی تھی تو یہیں انہی پتھروں پر آ کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ اِس جگہ مجھے ایک سنیاسی نے بہت راز کی بات بتائی تھی۔ جس کے بعد سے میں نے اُداس ہونا ہی چھوڑ دیا۔"

"کیا؟" ــــ خان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"اُس نے کہا تھا کہ دریا کے اندر بھی ایک پیغام چھپا ہے۔ اِسے سمجھنے کی کوشش کرو! اِس کا پانی یہی کہتا ہے ــــ کہ وقت بھائے خود کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔"

"ہاں رما۔" خان نے اُس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے چھُو کر اپنی طرف مخاطب کیا۔ "تم بھی دریا ہی کی مانند ہو۔ تم میرے ذہن میں دریا کی طرح ایک ہی وقت ہر جگہ موجود رہتی ہو۔ جیسے دریا اپنے منبع پر، اپنے دھانے پر، آبشار کی صورت اور تن پر اپنی امواج میں، سمندر پر، پہاڑوں پر، ہر شے ہر جگہ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے اور اس کے لیے وقت صرف مال کی صورت میں وجود رکھتا ہے اِس طرح تمہاری محبت پر بھی نہ ماضی کا سایہ ہے نہ مستقبل کی پرچھائیاں۔ بس تمہاری محبت کا دریا بھی میرے اندر بہتا چلا جا رہا ہے۔ اب تو میں اِسکی طغیانیوں میں بہہ کر اس کا ایک حصہ بننے لگا ہوں رما۔" اُس کی آواز کچھ بوجھل ہونے لگی تھی۔

خود رما بھی خاصی سوگوار ہو چلی تھی۔ جذبات کی شدت سے خوشیاں اور غم دونوں ہی تو

Scanned and [illegible] Gamar Attar

رُلے اُٹھتے ہیں۔ دونوں اس بات پر یقیناً مطمئن تھے کہ اتنے حساس ہونا بھی بہرحال بھرپور زندگی کی علامت ہے۔

رما نے پہلے لاشعوری طور پر اور اب مکمل شعور اور ادراک کے بعد خان کو اپنی ڈھال سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے جس شہزادے کی آمد کا خواب دیکھا تھا وہ اُس کی زندگی میں اب مجسم حقیقت کی شکل میں آ نمودار ہوا تھا۔

وہ پیدائشی آرٹسٹ لڑکی تھی۔ بہت نازک خیال اور حساس! وہ چیزوں کو مکمل واقعیت کے ساتھ محسوس کیا کرتی اُس نے خان کو بھی اپنے تمام تر محسوسات کے ساتھ چاہا تھا۔ اُس کے مذہب اور معاشرے نے اُسے "پتی دیوتا" کا جو تصور دیا تھا۔ وہ خان کو اُس پر پورا اُتر کر دکھانا چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے دل کے معبد میں کسی بہت ہی محترم اور متبرک مقام پر خان کا بُت سجا لیا تھا اور اب اِس پوجا ہی سے اپنا جیون بلیدان کرنا چاہتی تھی۔

یہ بات اُس کے دل میں جاگزیں ہو چلی تھی کہ خان جلد یا بدیر اُس کا پتی بن جائے گا۔ اُس کا دھرم تھا کہ جس طرح ٹوٹ کر وہ اروِن کُمار کو پوجتی ہے اگر بھگوان کرشن کو بھی پوجے تو وہ بھی کسی نہ کسی رُوپ میں دوبارہ زمین پر جنم لے کر اُس کے پاس چلا آئے گا۔ اُسے اپنی محبت پر اتنا ہی یقین تھا جتنا اگلے روز سورج کے طلوع اور پھر غروب ہونے پر۔

اُس کے جذبے کی یہی شدت خان کو اندر سے توڑنے لگتی تھی۔ وہ سوچنے لگتا: کہ جب تک اِس لڑکی کو علم ہو گا کہ اُس سے محبت کے بہانے فریب کیا گیا تھا اور جسے وہ اب تک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھتی آئی تھی وہ تو ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ تب اس پر کیا گزرے گی۔

"رما ایک بات بتاؤ۔"

اُس روز اُس نے ریتلے ساحل پر پیروں کے نشان چھوڑتی رما کو اچانک نیزدک کر اُس کے دونوں کندھے تھام کر اپنی طرف مخاطب کیا اور اُس کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں جھانک کر دریافت کیا: اگر میں ہندو نہ ہوتا تو بھی تم مجھ سے اسی طرح محبت کرتیں؟

اپنے سوال پر وہ خود بھی ایک مرتبہ تو گڑبڑا گیا۔ نجانے کس طاقت نے یہ سوال اُس کے مُنہ سے اگلوایا تھا۔ اُس نے دیکھا رما کی سمندر آنکھوں میں کوئی بے چینی کی لہر نہیں دوڑی۔ اُس کے شانت چہرے پر کوئی رنگ نہیں بدلا تھا۔ وہ اُسی طرح پُرسکون تھی جس طرح اُس کے ہاتھوں سے کینوس پر منتقل ہونے والی لڑکیوں کے پورٹریٹ!

"اردن! مجھے، تو علم نہیں کہ میرے جذبے کی شدت میں کہاں ایسی کمی رہ گئی ہے جو تم نے مجھ سے یہ دریافت کیا؟ لیکن شاید تم جلد محسوس کر لوگے کہ اب میں اُس منزل سے گزر چکی ہوں جہاں انسان کی اپنی کوئی حیثیت، کوئی سوچ باقی رہ جاتی ہے۔ میں تو اب خود کو تمہاری ذات کا ایک حصّہ جاننے لگی ہوں۔ میری ذات تو اب کچھ رہی ہی نہیں مجھے اس سے کیا تم کون ہو، کون نہیں ہو! بس مجھے تو تمہارا سایہ بن کر تمہارے ساتھ لگے رہنا ہے۔ دھوپ میں بھی، چھاؤں میں بھی۔ اُجالے میں بھی، اور اندھیرے میں بھی ــــ!!

اور ــــ اگر زندگی میں کبھی کوئی ایسا وقت آ ہی گیا جب ہمیں اپنی شناخت تلاش کرنا پڑی تو اس سفر پر آپ اکیلے ہی جائیں گے۔ میں تو آپ ہی کو اپنی پہچان جانتی ہوں ــــ"

اُس کے لہجے میں ایک ٹھہراؤ، اعتماد اور وقار تھا۔ ایسا لہجہ جو دل کی گہرائیوں میں سچ کی طرح اُترتا چلا جائے۔ اُس روز خان کو احساس ہوا: جیسے نادانستگی میں اس لڑکی سے ٹکرا کر اُس سے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو ــــ بہرحال اس نے سوچا اب تو اسے خود کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ دینا ہوگا۔ جانے اگلا جھونکا اسے کہاں لے جائے؟

اُس نے آج تک اپنے اندر کوئی خواہش پیدا ہونے کے باوجود رما کے جسم کو چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اُس روز عالمِ وارفتگی میں جانے وہ ہوش و خرد کی کتنی منزلیں عبور کر گیا۔ شاید یہ اُس کی زندگی کا کمزور ترین لمحہ تھا۔ جب اُس نے تڑپ کر رما کی دھڑکنوں کو اپنے دل میں سمو لیا۔

سورج دونوں کے عقب میں جمنا کے پانیوں میں اُترنے لگا تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے پنچھی ڈاروں اور قطاروں کی صورت دریائی لہروں پر کانپتی سورج کی کرنوں کے بیچوں بیچ پرواز کرتے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف گامزن تھے۔ خنکی بڑھنے لگی تھی۔ رات نے اُجالے اپنے دامن میں سمٹنے شروع کر دیے تھے۔ دونوں بہت دُور تک پیدل چلتے چلے گئے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ دونوں ہی کا دل یہی چاہتا تھا کہ وقت کی نبضیں تھم جائیں اور زندگی یہیں ساکت ہو کر رہ جائے۔ کافی دُور جا کر انہوں نے ٹیکسی پکڑی۔

وطن کی مٹی گواہ رہنا

اُس وقت شام اُتر رہی تھی جب وہ واپس گھر پہنچا ——

گھر پہنچنے پر خان کو علم ہوا کہ بلاقی رام کی طرف سے ایک اور لمبا آرڈر ملنے کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور مسٹر سہائے اُس کے گھر مٹھائی کا ڈبہ لے کر گئے ہیں۔

خان کے لیے ان باتوں میں اطمینان کا صرف ایک پہلو نکلتا تھا کہ اُس کا کر۔ مضبوط ہوتا جا رہا ہے اور یہی اُس کی کامیابی تھی! اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ اِس کو کی آڑ لے کر کرنا تھا —— اُسے اُمید تھی کہ جتنا مضبوط بیس اُس نے بنا لیا ہے اب کسی کی جرأت نہیں کہ اُس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔

لیکن، گھر آتے ہی ایک اُلجھن اُس پر بُری طرح سوار ہو گئی! وہ کس طرح گھ والوں کو مطمئن کرے کہ وہ کل باہر جا رہا ہے؟"

اور سوچتے سوچتے آخری اُس نے ایک ترکیب نکال لی ——

اتنی دیر میں زرینہ آئی تو وہ حیران رہ گئی! خان سر پکڑے گہری سوچوں میں گم تھا! اُسے دیکھتے ہی وہ پریشان ہو گئی!

"خیریت تو ہے ناں؟"

"خیریت کہاں؟" خان بولا: "آج بازار جا رہا تھا کہ ایک واقف مل گیا۔ بتانے لگا کہ گاؤں میں ایک عزیز سرگباش ہو گئے ہیں —— وہاں کل جانا ہے۔"

"قریبی رشتہ دار تھے وہ؟" زرینہ بولی: "تو پھر آپ مرد ہو آئیں۔"

اُس نے ایک نظر زرینہ پر ڈالی اور خاموش رہا۔

اِس مرتبہ اُسے جو مہم سونپی گئی تھی وہ ممکن ہے کسی اور کی نظر میں بہت خطرناک ہو لیکن خان نے اُسے معمول کے مطابق لیا۔ اُسے منوہر لال کے ساتھ انبالہ ایئر بیس سے وہ "کوڈ بک" چُرانی تھی جس پر بھارتی فضائیہ نے پاکستان پر مستقبل میں حملوں کی منصوبہ بندی کی تھی اور مختلف حملوں کے لیے مختلف کوڈ نام "تجویز کیے تھے! اِس کوڈ بک میں وہ نام آپریشنز درج تھے جن کی ممکنہ جنگ کی صورت میں بھارتی فضائیہ نے تیاری کی تھی۔

خان کے پاس اِس علاقے میں ایک ہی کام کا مہرہ تھا اور وہ تھا اُس کا برادرِ اکبر کارپورل اجے ساہنی۔

اپنے آنے والے ساتھی کا تعارف بھی اُس نے منوہر لال سے "نئے ماسٹر" کی حیثیت سے کروانا تھا اور اِس کے بعد اُسے ہمیشہ کے لیے پردہ سکرین سے اجے ساہنی کی حد تک ہٹ جانا تھا اور —— پھر اجے ساہنی کی تمام ڈیلنگ اُس کے نئے ساتھیوں سے ہونی تھی۔

○

اِس نئے دوست سے اُس کی ملاقات بھی انبالہ ہی کے ریلوے اسٹیشن پر مقرر کی گئی تھی۔

جب دوپہر کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اپنی پہچان کروانے کے لیے اُس نے راجپوت ٹھاکروں کے انداز میں سر پر ایک خاص رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی اور سرمئی رنگ کے سوٹ پر بھی پیلے رنگ کا گلاب کا پھول سجا رکھا تھا۔ وہ ریل گاڑی کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے برآمد ہوا تھا —— آنکھوں پر سنہرے فریم والی رنگ دار

شیشوں کی چمک بھائے واقعی وہ کوئی مہاراجہ نظر آ رہا تھا۔
اُس کے بریف کیس پر دُنیا کی ایک بڑی ائرلائن کا سٹیکر بڑا نمایاں نظر آ رہا تھا۔
مسافروں کے وہاں سے ہٹ جانے تک خان وہیں ایک کرنے میں کھڑا رہا۔ اُس نے جان بوجھ کر کھڑے رہنے کے لیے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں پلیٹ فارم کے اور سے گزرنے والے کو ۔۔۔ وہ نمایاں دکھائی دے سکے۔ اُسے اندازہ تھا کہ اُس کو آنے والا ساتھی یقیناً وہیں چھپ کر اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہا ہو گا۔
گھڑی کی سوئیاں تین اور بارہ کے ہندسوں کو چھو رہی تھیں جب منوہر لال اپنا نام ہی اُس کی توقعات کے بالکل برعکس اُس کی پشت پر موجود درجہ اوّل کے مسافر خانے سے نمودار ہوا۔ اُس نے خان کے بالکل سامنے آ کر اُسے "جے ہند" پکارا تھا۔
"جے ہند" ۔۔۔ اُس نے بھی جواب میں اپنا ایک ہاتھ اُوپر اٹھا دیا۔
تعارف کا مرحلہ تو اُنہوں نے جلد ہی طے کر لیا اور اب بالکل بے تکلف دوستوں کے انداز میں باتیں کرتے باہر آ رہے تھے! اس بات کا خان کو بخوبی احساس تھا۔ اُس سے ملاقات کرنے والا اُس سے زیادہ سینئر ہے۔ منوہر لال نے اپنا تعارف پرکاش کے نام سے کروایا تھا اور خان کا نام اُسے پہلے ہی "وجے" کہہ کر بتایا گیا تھا۔
دونوں سیڑھیوں کے راستے باہر نکل آئے۔ دونوں کی شخصیتیں اتنی بارعب تھیں کہ ڈیوٹی پر موجود ٹکٹ کلکٹر اُن کی ٹکٹ چیک کرنے کے بجائے اُنہیں سلیوٹ مار کر ایک طرف مودب کھڑا ہو گیا۔ دونوں مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔
پرکاش نے خان کو یہی تاثر دیا تھا جیسے وہ اِسی شہر کا رہنے والا ہے۔ اُس نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں خان کے نام سے کمرہ بُک کروا رکھا تھا۔ پکڑنے کے بعد نجات خان نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی حاصل کر لی تھی۔ اُس کے ہاتھ سے بندوق سے چھین والی گھڑی بھی اُس کی جیب میں منتقل ہو چکی تھی اور چہرے پر موجود میک اپ کا بیشتر

Scanned and ... Amateur Acce...

حصہ بھی صاف ہو چکا تھا۔ اب وہ واقعی درمیانے درجے کا لیکن سلجھے ہوئے گھرانے کا کوئی نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔
اپنا سامان ہوٹل ہی میں چھوڑ کر دونوں باہر نکل آئے۔ خان نے پرکاش کے مزاج کو سمجھنے کا اندازہ اِسی بات سے لگا لیا تھا کہ اُس نے ہوٹل میں جانے سے پہلے ایک ٹیکسی خرید کر خان کو دیا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا دوست خالی بریف کیس کے ساتھ قیام کرے۔
چائے اُنہوں نے ایک اور ہوٹل سے پی تھی۔ خان نے اندازہ لگایا کہ پرکاش یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے اور وہ انبالہ کے گلیوں بازاروں میں بالکل ایسے گھوم رہا تھا جیسے یہ اُس کی جائے پیدائش رہی ہو۔
دونوں نے چائے پینے کے دوران "کوڈ بک" اُڑانے کے لیے دو تین متبادل منصوبے بنا لیے تھے۔ لیکن ابھی تک وہ ایسا کوئی پلان تیار نہیں کر سکے تھے جس میں کارپورل ساہنی کی شمولیت کے بغیر کامیابی ممکن ہوتی ۔۔۔ اے ساہنی اُن کے لیے ناگزیر تھا۔ خان نے اُسے کارپورل کی نفسیات سے آگاہ کر دیا تھا اور اُس کی خوبیاں اور خامیاں بھی اپنے سینئر ساتھی کے سامنے بیان کر دی تھیں۔
"میرا خیال ہے اب ہمارا دوست گھر پہنچنے والا ہی ہو گا" ۔۔۔ اُس نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے چلتے ہیں" ۔۔۔ پرکاش نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

○

بس میں سوار ہونے سے پہلے خان نے رَم کی دو بوتلیں اور بہت سی الم غلم چیزیں بھی خرید کر لی تھیں۔
دونوں گاؤں پہنچے تو ابھی اے ساہنی گھر نہیں آیا تھا۔ اُنہیں تھکنوں سے لدا

پھندا دیکھ کر اجے ساہنی کے گھر والے دونوں پر مٹے جا رہے تھے۔ خان کو تو وہ لوگ جانتے ہی تھے کیونکہ وہ اس سے پہلے بھی اُن پر نوازشات کی بارش برسا چکا تھا۔

اجے ساہنی کی آمد تک دونوں نے اُس کے گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا

خان کی شکل پر نظر پڑتے ہی اجے کی باچھیں کھل اُٹھیں، جس سے خان نے یہ نتیجہ نکالا کہ دولت کی محبت اُس پر غالب آ چکی ہے۔ پرکاش کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چونکا پھر سنبھل گیا۔ دم کی بوتلیں اجے کو پرکاش نے پیش کی تھیں۔ یہ اُس کا کمال تھا کہ وہ اگلے آدھ گھنٹے میں اجے ساہنی سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ خان بھی دل ہی دل میں اُسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ تینوں گھر والوں کے ساتھ ہی چائے پی رہے تھے

چائے کے خاتمے پر تینوں ذرا کھلی ہوا میں گھومنے کے بہانے گھر سے باہر نکل آئے۔ اجے کے باپ کی یہاں چند مربے زمین تھی جس پر وہ لوگ موسم کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ کاشت کر لیا کرتے تھے۔ تینوں اس کاشت شدہ فصل کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے بالآخر کھیتوں کے ایک کونے میں موجود خالی قطعہ اراضی پر پہنچ گئے۔ ایک جھٹی کے کرے سے ساہنی نے دو چارپائیاں نکالیں اور وہ تینوں وہیں بیٹھ گئے۔

گفتگو کا آغاز اجے ساہنی نے کیا اور خان حیران رہ گیا جب اجے نے اب تک نہ ملنے کا شکوہ کرنے کے بعد اُسے بتایا کہ وہ اُن لوگوں کیلئے اور بھی بہت سے کام کی چیزیں جمع کرتا رہا ہے۔

یہ بڑی خوش آئند پیش رفت تھی جو کارروائی اجے کی طرف سے ہوئی۔ اور اپنی بات کے خاتمے پر اُس نے اپنی جیب سے پلاسٹک کے ایک لفافے میں لپٹے کاغذات نکال کر انہیں پیش کیے۔ یہ کاغذات بھی اُس نے اسی کرے میں کہیں چھپا رکھے تھے۔

دونوں نے بے چینی سے انہیں کھول کر دیکھا ــــ ان میں زیادہ تر وہ آرڈر بکنگ فارم تھے جو مختلف ہوائی اور راڈار اسٹیشنوں کے سٹیشن کمانڈر جاری کرتے ہیں۔

Scanned and PDF by Shahar Attar

بکنگ مشقوں کی تفصیلات تھیں اور کچھ روزانہ ہونے والی کارروائیوں کی رپورٹیں جو ہیڈ کوارٹرز بھیجی جاتی ہیں۔

خان نے کافی دیر کے اس پیکٹ کو "عطیۂ خداوندی" جان کر قبول کر لیا۔ پرکاش بھی بڑی مہارت سے خاصا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اُس نے نظر بچا کر خان کو آنکھ ماری اور جیب سے کوئی بزنس کارڈ نما وہ اجے ساہنی کی طرف پھینکنے والا تھا۔

"میں تمہیں یہ خوشخبری دینے آیا ہوں کہ تمہارے پہلے ہی کارنامے نے ہمارے ہیڈ کوارٹر کو قائل کر دیا ہے۔ ہم لوگ عموماً پانچ سال سے پہلے اپنے کسی ایجنٹ کو یورپ نہیں بلایا کرتے لیکن تمہارے لیے خصوصی ہدایات ہیں کہ اگر دو سال تک تمہاری کارکردگی اسی طرح رہی تو ہم تمہیں دو سال کے بعد یورپ میں تمہاری مرضی کے کسی بھی ملک میں سیٹل کر دیں گے ــــ ہاں اپنی چھ تصویریں ضرور دے دینا۔ تمہارا پاسپورٹ تیار کروانا ہے۔"

جیسے جیسے پرکاش بولتا جا رہا تھا اجے کے چہرے کا رنگ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ کھانے کے خاتمے پر اُس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا تھا۔

یورپ کی پُرتعیش اور آزاد زندگی کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔

اور میں اُن لمحات میں لوہا گرم دیکھ کر پرکاش نے اُس پر چوٹ کر دی ــــ "ہم لوگ ایک اور کام تمہاری مدد سے کرنے جا رہے ہیں۔ گو کہ یہ کام ہمیشہ ہم نے سرانجام دینا ہے لیکن زیادہ ذمہ داری تم پر ہی عائد ہوتی ہے۔"

پرکاش نے اُسے منصوبہ سمجھانا شروع کیا! ساہنی کچھ دیر کے لیے گھبرایا تو ضرور لیکن وہ ان لوگوں کے سامنے خود کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ اگلے روز شام کے بعد کا پروگرام طے ہو گیا۔ اجے ساہنی بوتل اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اُس نے وہیں بوتل کھولی اور دو میلے کچیلے گلاس بھی اسی کرے سے

نکال لایا۔

وہ جے ٹھاکر تو بیمار تھا جس کا علم اجے کو پہلی ہی ملاقات پر ہو چکا تھا۔ اس لیے اُس نے وِہسکی کے لیے گلاس رکھنے کا تکلف ہی نہیں کیا تھا۔ پرکاش نے البتہ خاصی رغبت دکھائی تھی۔ خان پہلے تو جھجکا لیکن جلد ہی معاملہ اُس کی سمجھ میں آگیا۔ اُس نے دیکھا اجے کے تین پیگ لگانے تک پرکاش نے گلاس کو چھُوا بھی نہیں تھا۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ اب اجے زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا ہے تو اُس نے بڑی ہوشیاری سے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور شراب نیچے گرانے لگا۔

یہ کام پرکاش نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ عام حالات میں بھی کوئی اس کی یہ حرکت نوٹ نہ کر سکتا — چہ جائیکہ اب تو یوں بھی اندھیرا پھیل چکا تھا۔

خاصا اندھیرا پھیلنے پر جب انہوں نے محسوس کیا کہ گاؤں کے لوگ سردی کے باعث اپنی گھروں میں بند ہو چکے ہوں گے تو وہ نشے سے دھت کارپورل اجے ساہنی کو سہارا دے کر گھر لے آئے۔

کھانا سب گھر والوں نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ تینوں اوپر چوبارے میں چلے آئے۔ اجے کو ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ جلد ہی گہری نیند سو گیا لیکن خان اور منوہر لال — کارپورل کو فی رمت گئے تک اپنے منصوبے کی جزئیات کا جائزہ لیتے رہے۔

○

علی الصباح اجے معمول کے مطابق بیدار ہو گیا۔ تینوں اکٹھے ہی باہر آئے تھے اور ایک ہی بس میں انبالہ روانہ ہو گئے۔ اجے نے شام کے بعد سے ہی اس منصوبے پر عمل شروع کرنا تھا اور شام سات بجے تینوں نے ایک جگہ اکٹھے ملنے کے لیے منتخب کر لی تھی۔

یہ وقت پرکاش اور خان نے اُسی ہوٹل میں اور پھر فلم دیکھ کر گزارا۔ شو نو بجے

ہوٹل سے باہر اپنے مقرر کردہ آر۔ وی پوائنٹ کی طرف جا رہے تھے تو پرکاش نے پچھلے سے ایک پستول اُس کی طرف بڑھا دیا۔ خان نے شکریہ کہہ کر پستول اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔

دوسری طرف ٹھیک چھ بجے کارپورل اجے ساہنی نے اپنے آفیسر انچارج کو جیپ کا انجن خراب ہونے کی رپورٹ کی اور یہ بھی بتا دیا کہ اب رات تک مقامی اڈے کی ورکشاپ پر اس کی مرمت ممکن نہیں۔ اُس نے اپنے آفیسر کو پیش کش کی کہ وہ شہر کی ورکشاپ سے ڈائنمو ٹھیک کروا کر صبح ڈیوٹی پر جیپ ساتھ لے کر آ جائے گا۔

اور یہ سب کچھ "آف دی ریکارڈ" ہونا تھا لیکن آفیسر کی بھی مجبوری اور لاچاری آڑے آ گئی۔ اجے نے اُس سے مرمت کے لیے ایڈوانس پیسے بھی وصول کر لیے اور جیپ لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اڈے سے باہر نکلتے ہی سڑک کے نزدیک اُس نے تھوڑی دیر کے لیے جیپ روک لی تھی لیکن کسی کو یہ علم نہ ہو سکا کہ اس میں سوار کون تھا۔ سڑک سے برآمد ہونے والے کے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑا ہوا تھا جس میں انڈین ایئر فورس کے دو آفیسروں کی وردیاں تہہ کر کے رکھی ہوئی تھیں۔

ٹھیک سات بجے وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں خان اور پرکاش اُس کے منتظر تھے۔ یہاں تک ڈائنمو خراب ہونے کی وجہ سے اُس نے لائٹیں آف کر رکھی تھیں۔ سڑک کے کنارے کچے راستے پر اُس نے جیپ کھڑی کر کے "انڈی کیٹر" جلائے بجھائے جس پر وصول ہونے پر خان اور پرکاش قریباً بھاگتے ہوئے اُس تک پہنچے تھے۔

دونوں اس کھیت میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

کارپورل اجے ساہنی نے کچھ کہے سنے بغیر وردیاں اُن کی طرف بڑھا دیں۔ دونوں نے کھڑے کھڑے اپنی وردیاں کپڑوں پر پہن لیں۔ اسی دوران اجے ساہنی اپنے

کام میں مصروف رہا اُس نے جیپ کی ایک جعلی نمبر پلیٹ اپنی سیٹ کے نیچے سے نکالی یہ نمبر پلیٹ اُس نے آج ہی ورکشاپ میں تیار کی تھی۔ اَب اس جیپ پر انڈین ائرفورس کی جو نمبر پلیٹ تھی اُس کے مطابق یہ انبالہ ایئربیس کی جیپ تھی۔ پرکاش نے جیپ پر نظر آنے والے ہر نمایاں نشان پر کھیت کی مٹی مل کر اُسے اچھی طرح کیموفلاج کر دیا تھا۔ یوں بھی یہ ایئر جنسی کا دور تھا اور جیپیں عموماً اسی حالت میں رکھی جاتی تھیں ——!!

تھوڑی دیر بعد تینوں جیپ میں سوار انبالہ ائربیس کی طرف اُڑے چلے جا رہے تھے۔ کارپورل اجے ساہنی جیپ چلا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ سکواڈرن لیڈر پرکاش بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر فلائیٹ لیفٹیننٹ کمار۔ دونوں کے ناموں کی تختیاں بہادری کے تمغوں اور اعزازات کے ساتھ اُن کے سینوں پر چمک رہی تھیں۔

خان نے اپنے پستول پر سائلنسر فٹ کر لیا تھا اور اُسے اپنے کوٹ کی لمبی جیب میں چھپایا ہوا تھا۔

○

ہوائی اڈہ ابھی دُور ہی تھا جب پرکاش نے ایک لفافہ اجے کی طرف بڑھایا "یہ تمہارا ایڈوانس ہے۔ کام مکمل ہوتے ہی تمہارے تصور سے بھی زیادہ مال ملے گا۔ ہم اپنے دوستوں کی قدر کرتے ہیں اس کا ثبوت پہلے ہی مل چکا ہوگا؟"

کارپورل اجے ساہنی چپ رہا۔ اُس نے نوٹوں والا لفافہ اپنی جیب میں ٹھونس لیا تھا! جیپ کی رفتار بڑھتی چلی جا رہی تھی —— دونوں پر سکون دکھائی دینے والے حالات کے منتظر تھے۔ انبالہ ایئربیس کا سٹیشن ایریا شروع ہو چکا تھا۔

خان نے محسوس کیا جیسے اُس کی ہتھیلی اتنی سردی میں بھی پسینے سے بھیگ رہی ہے اُس نے دونوں ہاتھ وردی کے ساتھ رگڑ کر صاف کر لیے۔ اجے نے جیپ کو اُس سڑک پر ڈال دیا تھا جو ٹیکنیکل ایریا کی طرف جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ گارڈ روم کے دروازے پر کھڑے تھے! فوجی جیپ کو دیکھتے ہی کھڑکی کا بیرل اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ اجے نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے اور چہرہ اس طرح جھکا کر جیپ چلا رہا تھا کہ پہلی نظر میں اُس کی شناخت ممکن نہیں تھی۔ جبکہ منوہر لال امیراز ٹھاٹ باٹھ سے اسی طرح اپنی سیٹ پر جم کر بیٹھا تھا۔ اُس کے کندھے پر بنے نشانات دیکھ کر ڈیوٹی پر موجود گارڈ نے اُسے سیلوٹ کیا اور اجے ساہنی نے جیپ آگے بڑھا دی۔

اڈے کی تمام بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ ایئر جنسی کی وجہ سے ائرفورس کے تمام سٹیشن خود کو حالتِ جنگ کا شکار سمجھتے تھے اور مکمل بلیک آؤٹ رہتا تھا۔

جیپ کو سڑک سے ہٹا کر سٹیشن کمانڈر کے دفتر کے پیچھے والے درختوں کی طرف لے چلو" منوہر لال نے سرگوشی کی۔

"او۔کے" —— کارپورل اجے ساہنی کو دو الفاظ ادا کرنے کے لیے بھی بہت زور صرف کرنا پڑا

انتظامی دفاتر پانچ بجے کے بعد بند ہو جاتے تھے لیکن اُن کا چھوٹے افسران پر مشتمل عملہ رات کو بھی ڈیوٹی پر موجود رہتا تھا۔ قریباً ہر دفتر میں کوئی نہ کوئی ذمہ دار آدمی کسی بھی جوابدہی کے لیے موجود ہوتا تھا۔

کارپورل اجے ساہنی نے بڑی پھرتی سے جیپ درختوں کے عین درمیان کیموفلاج کے لیے اُگائی گئی جھاڑیوں میں اس طرح چھپا دی تھی کہ اب وہ دُور سے دیکھنے پر بھی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اگنیشن کی چابی خان نے اپنی جیب میں ڈال لی اور اب تینوں جیپ سے نیچے اُتر آئے تھے۔ کارپورل اجے ساہنی وہاں ڈیوٹی کر چکا تھا اور اُسے علم تھا کہ اُس کے دوستوں کو جس چیز کی تلاش ہے وہ کس کمرے میں ہو سکتی ہے۔ وہ آگے آگے تھا اور دونوں اس کے پیچھے پیچھے۔

چاند کی آخری راتیں تھیں اور سردیوں کا موسم اندھیرا شام ہی سے گہرا ہونے لگا تھا کہرآلود آسمان کو بادلوں نے ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ ہوائی اڈے پر پُرسوز جھینگروں کی آوازوں کے سوا کوئی اور آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔

اندھیرے میں اب کچھ فاصلے پر بنے ونگار کی پرچھائیاں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ وہ تین کمروں کی کھڑکیوں سے معمولی روشنی بھی اپنا عکس دکھانے لگی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے گہرے شیشوں کے پیچھے روشنیوں میں لوگ اپنے کام میں مصروف ہیں۔

ایسے ہی ایک کمرے کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اجے ساہنی نے اُس کی نشاندہی کی اور اگلے حکم کے لیے اُن کی طرف دیکھا۔

"تم جیپ میں واپس جاؤ" منوہر لال نے اُسے ہدایت کی۔

اِس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں صورتِ حال کی سنگینی سے گھبرا کر وہ بدحواسی میں جیپ لے کر واپس نہ بھاگ جائے خان نے چابی اپنی جیب میں پہلے ہی رکھ لی تھی۔ اُنہوں نے اجے کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیے ریوالور تک نہیں دیا تھا ——— وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کا احتمال ہو۔

اِس بات کے شواہد موجود تھے کہ اس کمرے میں نہ صرف کوئی موجود ہے بلکہ وہاں باقاعدہ پہرے کا بندوبست بھی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پیشِ آئندہ حالات سے نمٹنے کی حکمتِ عملی طے کر لی۔

خان نے جُھک کر پرکاش کے کان میں سرگوشی کی اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ پرکاش نے اُس کے کندھے پر تھپکی دی اور بے قدموں لیکن بظاہر لاپرواہی سے اُس کمرے کی طرف چل دیے۔

دونوں نے اِس بات کی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ کمرے میں داخل ہونے تک ان کا تاثر کسی ڈیوٹی گارڈ سے نہ ہو اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے! کمرے کا دروازہ

کُھلا خان نے بہت آہستگی سے کھولا تھا لیکن اُس کا دوسرا ہاتھ جیب میں موجود پستول کے دستے پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے پر اُس کی نظر سامنے بیٹھے دو ہونقوں کے چہروں پر پڑی جو اُن کی اچانک آمد سے بوکھلا گئے تھے۔

"آئی ایم سکواڈرن لیڈر پرکاش مہرہ" ——— پرکاش نے بارعب آواز میں انہیں مخاطب کیا ——— "آن سپیشل ڈیوٹی" ——— اُس کے مُنہ سے نکلا اور دونوں کے ہاتھ سلیوٹ کے لیے ٹوپیوں کو چھونے لگے۔

"میں ریڈ کوارٹر سے آرہا ہوں ——— ہمیں ایک رپورٹ پر خصوصی چیکنگ کرنی ہے۔ تم دونوں بالکل مطمئن اپنے کام میں مصروف رہو، لیکن خبردار آدھ گھنٹے تک کسی کو میں پر ہماری آمد کا علم نہیں ہونا چاہیے۔"

"اوہ کے سر" ——— دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ ایئر فورس انٹیلی جنس کے افسر ہیں۔

"اے یو سارجنٹ ڈھلا!" خان نے اُس کے خاموش ہونے پر بائیں ہاتھ کی انگلی سے کرنے والی میز پر بیٹھے سارجنٹ کو مخاطب کیا جس کے نام کی تختی اُس کی جیب پر چمک رہی تھی: "فائل نمبر ۱۲ ایکس نکالو۔"

جیسے ہی خان کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے، سارجنٹ یوں اُچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے اُس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں کو چھو گیا ہو۔

"سر سر" ——— وہ ہکلایا ——— "ہمیں سوائے سٹیشن کمانڈر کے اور کسی کو فائل نمبر ۱۲ ایکس دکھانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"ابے گدھے کے بچے ——— تم سٹیشن کمانڈر کو بھی دکھاؤ گے جب فائل میں کاغذات موجود ہوں گے۔ ہماری رپورٹ کے مطابق تم دونوں نے وہ فائل یہاں سے تھوڑی دیر کے لیے غائب کروا دی ہے اور اب اُسی کی واپسی کے منتظر ہو ——— لیکن مطمئن رہو، باہر

"کارپورل نے گھیرا ڈالا ہوا ہے اور کوئی بچ کر اندر نہیں آسکتا۔" پرکاش نے اسے گھورتے ہوئے الفاظ چبا چبا کر اس طرح کہے کہ دونوں کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی انہیں سوائے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔

"سر۔۔۔ یہ ہمارے خلاف کسی نے جھوٹی رپورٹ دی ہے۔ بالکل غلط۔"

"اچھا زیادہ بحث نہ کرو اور فائل نکالو۔۔۔" خان غرایا۔

سارجنٹ ڈبلا نے اپنا دراز کھول کر چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور دائیں کونے میں رکھے سیف کی طرف بڑھا۔ اس کی چال سے اس کی گھبراہٹ عیاں تھی۔ سارجنٹ ڈبلا کے دوسرے ساتھی کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے مطلوبہ فائل نکال کر سکواڈرن لیڈر پرکاش مہرہ کو تھما دی۔

"سکواڈرن لیڈر پرکاش مہرہ نے ایک طائرانہ نظر فائل پر دوڑائی اور دوسرے لمحے دونوں کی جیبوں سے ریوالور نکل آئے۔ خان والے ریوالور پر سائیلنسر چڑھا تھا لیکن پرکاش والے پر نہیں۔

"تو ہمارا شک درست نکلا۔ میں تم دونوں کو گرفتار کر کے سٹیشن کمانڈر کے پاس لے جا رہا ہوں۔۔۔ ہینڈز اپ۔۔۔" پرکاش غرایا۔

"سر۔ سر۔ یہ غلط ہے۔ خدا گواہ کی قسم مجھے اس کا علم نہیں۔۔۔" سارجنٹ کا ساتھی گڑگڑایا۔

"تم نے جو کچھ بکنا ہے انکوائری میں بکنا۔۔۔" خان نے انہیں گالی دیتے ہوئے کہا۔

دونوں نے سہم کر ہاتھ اٹھا دیے۔

"اپنے سر دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔۔۔" انہیں اگلا حکم موصول ہوا۔

ابھی سر دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہوئے انہیں ایک آدھ منٹ ہی گزرا تھا جب دونوں کے سروں پر قیامت ٹوٹی۔ پستولوں کے دستے دونوں کے سر کے نازک حصوں پر گرے اور

Scanned and F

وہ بغیر آواز نکالے زمین بوس ہو گئے۔

فائل کو خان نے اپنی وردی کے اندر اچھی طرح محفوظ کر لیا تھا۔ دونوں اسی طرح بے قدموں باہر آ گئے۔ دم رخصت خان نے کمرے میں موجود ٹیلیفون کا پلگ نکال دیا تھا۔

کارپورل نے انہیں دور ہی سے آتے پہچان لیا تھا۔ تینوں تھوڑی دیر بعد اسی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ اس مرتبہ دونوں افسران نے اپنے ہاتھ پستولوں کے دستوں پر جمائے ہوئے تھے۔ جیپ کی لائٹس آف تھیں۔ صرف اسی مدھم سی روشنی کے سہارے جو راستے کی راہنمائی کے لیے جلائی گئی تھی۔ وہ اسی طرح گارڈ روم تک آ گئے۔

بیرل پر موجود گارڈ نے ٹارچ کی روشنی ان کی طرف پھینکی۔ اے ساہنی نے ٹوپی اتنی جھکائی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ دکھائی پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ روشنی میں افسران کی شکل دیکھتے ہی اس نے سیلوٹ مارا اور اے ساہنی نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

جیپ آندھی کی طرح اڑی چلی جا رہی تھی۔۔۔!!

اسی ویرانے میں پہنچ کر جہاں سے دونوں سوار ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی وردیاں اور جیپ کی نمبر پلیٹ سے نجات حاصل کی۔

"تھینک یو فرینڈ۔" پرکاش نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے ایک اور لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا:

"اچھا بھیا! اب شاید تم سے یورپ ہی کے کسی ملک میں ملاقات ہو۔ میں تو اپنا ڈیوٹی مکمل کر چکا ہوں۔۔۔ کل یہ لوگ مجھے جرمنی پہنچا دیں گے پھر عیش ہی عیش۔"

خان بھی اب سے باقاعدہ بےتعلق ہو گیا۔ اس نے کچھ اس طرح اے ساہنی سے باتیں کی تھیں کہ ساہنی تڑپ کر ہی تو رہ گیا۔۔۔ اس کے دل میں یورپ جا کر عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی خواہش پہلے سے دوچند ہو گئی تھی۔ بڑی پھرتی سے جیپ کا رخ

Scanned an... Omar Assas

اٹھا کر پرکاش نے اُس کے ڈائمنو میں معمولی سی خرابی پیدا کر دی تھی۔

دونوں یہیں اُس سے الگ ہو گئے۔ اس کام میں بمشکل ایک گھنٹہ صرف ہوا تھا۔ جب وہ جیپ لے کر ورکشاپ پہنچا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ مستری ایک دوسری گاڑی کے نیچے لیٹا اپنے شاگردوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ ساہنی کو شاید وہ پہچانتا تھا کیونکہ اُس نے جیپ کی لائٹس آف ہونے کے باوجود اُسے نام لے کر سلام کیا تھا۔

وہیں کھڑے کھڑے اُس نے مستری کو خرابی سے آگاہ کیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ صبح جلد سے جیپ لے جائے گا۔ اُس نے رخصت ہوتے وقت جان بوجھ کر اُونچی آواز میں کہا: "دیا تھا! ابھی سات بجے ہیں اور صبح تک کام مکمل ہونا چاہیئے۔"

کارپورل جانتا تھا کہ اوّل تو مکینک کے پاس گھڑی ہے ہی نہیں اور اگر ہوئی بھی تو وہ اُس میں ٹائم دیکھنے کی تکلیف نہیں کرے گا۔

"جیپ کو ذرا چمکا بھی دینا۔" اُس نے کسی ممکنہ نشان کی موجودگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

"اچھا مہاراج جی! مطمئن رہیں۔ بھئی حکم ہے بڑے صاحب کی جیپ ہے۔" مستری نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

کارپورل اچھے ساہنی اُسے "رام رام" کہہ کر واپس آ گیا۔ صبح اگر انکوائری بھی ہوتی تو دُنیا کی کوئی طاقت یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ جیپ لے کر اس ورکشاپ سے آگے بھی کہیں گیا ہے کیونکہ سات بجے تک وہ بمشکل یہیں پہنچ سکتا تھا۔

اپنے دوستوں کی طرف سے بتائی گئی حفاظتی تدابیر پر اُس نے فوراً عمل کیا: جیپ کی سیٹ کے نیچے ہی اُس نے ایک سویلین ڈریس رکھا ہوا تھا۔ کپڑے اُس نے باہر اندھیرے گوشے میں تبدیل کیے اور آج وہ خلافِ معمول بس کے بجائے ساڑھے آٹھ والی ٹرین سے اپنے گاؤں جا رہا تھا۔

دوسرا سٹیشن اُس کے گاؤں کا تھا۔ ٹرین میں کوئی شناسا چہرہ اُسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھر تک وہ اسی طرح پہنچا تھا۔ کھیتوں میں اُس نے دوبارہ اپنی وردی تبدیل کر لی تھی۔ وہ آج قدم قدم پر احتیاط برت رہا تھا۔ کوئی غیر معمولی حرکت اُس سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اُس نے گھر والوں کو دیر سے آنے کا احساس ہونے دیا تھا۔

رات کافی دیر گئے اُسے نیند آئی لیکن صبح وہ پورے وقت پر جیپ سمیت اپنے افسر کے سامنے موجود تھا۔

○

خان اور منوہر لال نے جیپ کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی رختِ سفر باندھ لیا — دونوں چپ چاپ سڑک کے کنارے کنارے چلتے گئے۔

"ہمیں انبالہ نہیں جانا چاہیئے۔" خان نے اپنی رائے پیش کی۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ میرے خیال سے کسی نزدیکی سٹیشن سے کوئی پسنجر ٹرین پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہاں آج شاید ہمیں دہلی کے بجائے پنجاب کی طرف جانا پڑے۔" منوہر لال نے اُسے اگلے پروگرام سے آگاہ کیا۔

"جیسے آپ کی اچھیا۔"

"اس مرتبہ تم پگڑی کے بغیر ٹھاکر بنے رہو گے۔" منوہر لال نے سمجھایا۔

خان مسکرا کر چپ ہو رہا۔ دو ڈھائی گھنٹے پیدل چلنے کے بعد بالآخر انہیں ایک ریلوے سٹیشن کے آثار دکھائی دیئے۔ منوہر لال کو اندازہ تھا کہ انبالہ سے شام کے بعد تین چار پسنجر ٹرینیں مختلف جنکشنوں تک جاتی ہیں اور وہ کوئی نہ کوئی ایسی ٹرین پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

خان کے لیے یہ خوشگوار حیرت باعثِ اطمینان تھی کہ اس لائن پر آنے والے بہت

aazzamm@yahoo.com

سے ریلوے سٹیشن اور اُن کے گرد و نواح آباد دیہاتوں کے نام منوہر لال کو ازبر تھے۔ اُس نے خان کو دُور ہی سے سٹیشن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سٹیشن کا نام اور اب تک اُن کے راستے میں آنے والے دیہاتوں کے نام بھی بتا دیئے تھے اور ایک "کور سٹوری" بھی سمجھا دی تھی جو اُس نے کسی کے استفسار کرنے پر سُنانی تھی۔

"ٹرین آنے میں ابھی قریباً آدھ گھنٹہ باقی ہے" ـــــ اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں سٹیشن پر دس پندرہ منٹ پہلے ہی پہنچنا چاہیئے" ـــ خان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہاں" ـــ منوہر لال کچھ سوچتے ہوئے بولا "تم ٹھیک کہتے ہو"

دونوں کھیتوں کے درمیان ہی ایک "سمادھی" کو قدرے محفوظ جان کر وہیں چلے آئے۔ سمادھی پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ اُس پر وہ ایک دوسرے کے نزدیک بیٹھ گئے اور دونوں وقت گزاری کے لیے گفتگو کا کوئی موضوع تلاش کرنے لگے:

"کیا سوچ رہے ہو؟" اُس نے یونہی منوہر لال سے پوچھ لیا۔

"کچھ نہیں ـــ تم تو جانتے ہی ہو۔ ہمارے پاس سوچنے کے لیے وقت ہوتا ہی کب ہے اور اگر کبھی کبھار ایسا کچھ وقت مل بھی جائے تو ایک ہی سوچ ہوتی ہے"

"ہاں ـــ" خان نے اُس کی بات سمجھتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی ـــ "انسان کتنا کمزور ہوتا ہے۔ کم از کم میں تو اس حقیقت کا قائل ہو چکا ہوں"

"اب دیکھو کتنا عجیب لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کبھی کبھی تو اپنا وطن، گھر بار، ماں باپ، بھائی بہن اتنے یاد آتے ہیں کہ رگیں ٹوٹنے لگتی ہیں، لیکن ایک ہی سوچ مطمئن کر دیتی ہے کہ ہم یہاں اُنہی کے لیے تو ہیں۔ اُنہی کی خوشیوں کے لیے" وہ خاموش ہو گیا۔ شاید کچھ اور کہتے ہوئے وہ جھجک محسوس کر رہا تھا۔

دونوں چند سیکنڈ تک خاموش رہے پھر خان نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

"کس شہر کے رہنے والے ہیں آپ؟"

اُس کی بات کا جواب منوہر لال نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر دیا تھا "سارے شہر میرے ہی شہر ہیں۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے میرا وجود پاکستان کے سارے شہروں کی مٹی کا مرکب ہے"

خان سمجھ گیا کہ اتنے جذباتی لمحات میں بھی منوہر لال نے اپنی ٹریننگ کے اُصول فراموش نہیں کیے اور اُسے اپنی صحیح شناخت سے آگاہ نہیں کیا۔

"میرا جی نجانے کیوں چاہتا ہے تم سے اپنے مُلک کی باتیں کروں۔ ہاں! تم نے لاہور تو دیکھا ہو گا" ـــ پھر وہ خود ہی خان کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے بول پڑا۔

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں۔ میں کئی دفعہ لاہور گیا ہوں" اُس کا جی چاہا کہ فوراً اُسے بتا دے کہ یہی تو اُس کا شہر ہے لیکن اُس نے گول مول جواب دینا ہی مناسب سمجھا۔

پھر دونوں لاہور کی باتیں کرنے لگے اور باتوں کا یہ سلسلہ لاہور سے ڈھاکہ تک پھیلتا چلا گیا۔ وقت جس کی گردش رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، بہت تیزی سے بیت چلا تھا۔ منوہر لال نے ہی وقت کی نزاکت کا احساس کیا۔

دونوں اٹھ کر سٹیشن کی طرف چل دیئے۔

○

گاڑی آنے میں منوہر لال کے اندازے کے مطابق بمشکل پانچ دس منٹ ہی باقی تھے۔

جب وہ اُس چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ اُن کے علاوہ بمشکل تین چار سواریاں وہاں نظر آ رہی تھیں ـــ سٹیشن کے واحد پلیٹ فارم کی دیوار سے لگے ہوئے لوہے کے ٹھنڈے بنچوں پر تین چار آدمی سردی میں کپکپاتے چادریں اُوڑھے بیٹھے تھے۔

پلیٹ فارم پر بنی ٹین کی چادروں میں سے زرد بلبوں کی روشنیاں وہاں کپکپاتے ہوئے

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

اپنے ہونے کا زبردستی احساس دلا رہی تھیں۔ ٹکٹ بابو والی کھڑکی میں ایسے ہی زرد بلب کی روشنی میں ایک مریل سا چہرہ اُنہیں دکھائی دیا۔ جس نے دونوں ہاتھ کوٹوں والی انگیٹھی پر رکھے ہوئے تھے۔

"میں ٹکٹ لے آؤں" منوہر لال نے اُسے وہاں رُکنے کو کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ خان اُس سے کچھ فاصلے پر ہی رُک گیا اُس نے اپنا منہ ٹکٹ بابو کی کھڑکی کی طرف ہی کر لیا تھا۔ وہ اُن لوگوں کے نزدیک جانا نہیں چاہتا تھا۔

منوہر لال نے ایک قریبی سٹیشن کا نام لیتے ہوئے ٹکٹ بابو کو دو اعلیٰ درجے کے ٹکٹ دینے کے لیے کہا۔ اور جیب میں پیسے نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا۔ جیسے ہی ٹکٹ خرید کر واپس پلٹا اچانک سنسنی سی اُس کے بدن میں تیزی سے دوڑ گئی۔

"ہینڈز اَپ" ـــــ کوئی للکارا اور ایک پستول کی ٹھنڈی نالی اُس کی گردن سے چپک گئی۔

منوہر لال کو اپنا خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اُس نے کسی میکانکی عمل کے تابع ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ ٹکٹ بابو کو علم ہی نہ ہو سکا کہ باہر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔

"رائٹ" ـــــ اگلا حکم موصول ہوا اور جب وہ دائیں طرف گھوما تو اُسے خان بھی اسی حالت میں نظر آیا۔ ویسا ہی ایک پستول اُس کی پسلیوں میں لگا ہوا تھا اور وہ ہاتھ اُوپر اُٹھائے مسخروں کی طرح دانت نکال رہا تھا۔

"مروا دیا نا اُستاد"؟ ـــــ خان نے اُسے آنکھ مار کر کہا۔ منوہر لال فوراً اُس کا پلان سمجھ گیا۔

"ان گدھوں سے شاید پہچاننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ بہر حال ابھی اُنہیں اپنا شوق پورا کرنے دو" منوہر لال نے بڑی بارعب آواز میں کہا۔

"بکواس بند کرو" کسی نے دونوں کو گالیاں دیتے ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

ابھی تک وہ ڈھنگ سے اِن لوگوں کی شکلیں نہیں دیکھ پائے تھے۔ یہ اندازہ تو دونوں نے لگا لیا تھا کہ یہ لوگ ائر فورس سیکورٹی کے ہیں اور اُن کے دونوں شکاروں میں سے شاید کوئی ایک اندازے سے پہلے ہوش میں آ گیا یا پھر اُس طرف کوئی کسی کام سے آیا ہو گا۔ جب ہی تو یہ لوگ یہاں پہنچ گئے"۔

اِس بات کا اُنہیں آج بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس ہے بہت ہوشیار۔

○

دونوں کو وہ سٹیشن پر بنے سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں لے آئے اور دیوار کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ چاروں اُن کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ صرف ایک نے سارجنٹ کی وردی پہن رکھی تھی باقی سب نے عام کپڑے پہن رکھے تھے۔

"تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے اور وہ جیپ بھی جس میں تم آئے تھے"؟ سارجنٹ نے بڑی رعب دار آواز میں پُوچھا۔

دونوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ لوگ کارپورل اجے ساہنی تک نہیں پہنچے۔ ابھی تک اُنہوں نے دونوں کی تلاشی لینے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

"تمیز سے بات کرو۔ کون سا تیسرا ساتھی۔ کون ہو تم لوگ"؟ منوہر لال کا لہجہ اتنا گھمبیر تھا کہ خان اس کی اداکاری پہ دِل ہی دِل میں عش عش کر اٹھا۔ دوسری طرف سارجنٹ بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم کون ہو"؟ ـــــ اِس مرتبہ اُس کی آواز خاصی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"دیکھو تم لوگوں کا تعلق شاید فوج سے ہے۔ ورنہ اس علاقے کے کسی سیکورٹی یا پولیس والے کی جرأت نہیں کہ وہ ٹھاکر املوک سنگھ سے اِس طرح مُنہ پھاڑ کر بات کر سکے"۔

سارجنٹ نے اپنے ساتھیوں کی طرف باری باری دیکھا پھر اُس سے مخاطب ہوا "زیادہ

Scanned by aazamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

چالاک مت بنو۔ ورنہ....." دونوں نے اندازہ لگایا کہ سارجنٹ کا لہجہ پُر اعتماد نہیں ہے۔

منوہر لال نے اُن پر اچانک ہی بڑا بھرپور نفسیاتی وار کیا اور اپنے دونوں ہاتھ گرا کر اُس سے مخاطب ہُوا ــــ "اگر تمہارے ہاتھ مال لگ گیا ہے تو خاموشی سے اپنا حصّہ لو اور چلے جاؤ۔ ورنہ یاد رکھنا کمشنر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اُس نے "مال" کا پتہ چاروں کے درمیان بڑی ہوشیاری سے پھینک دیا تھا۔ چاروں ایک لمحے کے لیے گڑ بڑا گئے لیکن سارجنٹ جلد ہی سنبھل گیا۔ "اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھائے رکھو۔ ہم تمہاری تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"سارجنٹ" ــــ اس مرتبہ خان کی باری تھی۔ "ابھی اس شہر میں کوئی ایسا ماں کا لال نہیں جنا جو "ٹھاکر نگر" کے ٹھاکروں کی تلاشی لے سکے۔ معلوم ہوتا ہے تم وردی اُتروانے کا ارادہ کر چکے ہو" ــــ اُس نے بھی اپنے دونوں ہاتھ نیچے گرا دیئے۔

سارجنٹ کے علاوہ شاید تینوں اُن کے چکر میں آ گئے تھے اور یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اُنہوں نے غلط آدمی پکڑ لیے تھے۔ اس لیے وہ قدرے لاپرواہ ہو گئے تھے اور یہی کچھ وہ چاہتے تھے۔

"دیکھو اگر تم لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے تو ہمارے ساتھ "ٹھاکر نگر" چلو۔ یہاں سے تین چار میل کا فاصلہ ہی تو ہے۔ ورنہ یہ جان لو کہ مفت میں مارے جاؤ گے۔" منوہر لال نے آخری تیر بھی چلا دیا جو عین نشانے پر لگا۔

سارجنٹ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ شاید اُن کا مشورہ لینا چاہتا تھا۔ اُن لوگوں نے آنکھوں آنکھوں میں کچھ گفتگو کی اور سارجنٹ اُن سے مخاطب ہوا۔

"ٹھاکر صاحب! اصل میں ہمیں تین پاکستانی جاسوسوں کی تلاش ہے جو ابھی ابھی ایک واردات کر کے بھاگے ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں لیکن یاد رکھنا تم ہمیں بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ اگر تمہاری بات غلط ثابت ہوئی تو ہم تم دونوں کو وہیں موقعے پر گولی مار

دیں گے۔"

"چلو" ــــ منوہر لال نے کہا۔

جیسے ہی اُس نے قدم بڑھایا، اچانک رات کے سناٹے میں ریل گاڑی کے زوردار وسل کی آواز سنائی دی۔ چاروں ایک لمحے کے لیے گڑ بڑائے اور وہی لمحہ اُن پر قیامت ڈھا گیا: منوہر لال سیدھا سارجنٹ پر آیا تھا اور اُسے رگیدتا ہُوا دیوار تک چلا گیا۔ خان کی ٹانگ دوسرے پستول والے کی کنپٹی پر اس زور سے چلی تھی کہ اُسے دوبارہ سنبھلنے کی مہلت نہ مل سکی۔ باقی تینوں کے سنبھلنے تک دونوں پستولوں پر خان اور منوہر لال قابض ہو چکے تھے۔

"خبردار" ــــ خان للکارا۔ "اپنے ہاتھ اُٹھاؤ اور مُنہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

دُور سے آتی ٹرین کے انجن کی آواز بھی اب اُنہیں بخوبی سنائی دینے لگی تھی۔ دونوں نے بجلی کی سی پھُرتی کا مظاہرہ کیا اور جیسے ہی وہ لوگ دیوار کی طرف گھومے اُن کے ہاتھ مشینی انداز میں چلنے لگے۔ اس مرتبہ دونوں نے کنپٹیوں کو نشانہ بنایا تھا۔ چاروں کٹے ہوئے درخت کی شاخوں کی طرح ایک دوسرے پر ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ اس مرتبہ دونوں نے خاصے سخت ہاتھ دکھائے تھے۔

○

ٹرین کے سٹیشن تک پہنچنے تک وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر سے اُسے کنڈی لگا چکے تھے۔ دونوں بڑے پُر وقار طریقے سے چلتے ہوئے ٹرین کی طرف آئے۔ اُس ٹرین میں شاید دو تین بوگیاں ہی اعلیٰ درجے کی لگائی گئی تھیں۔ ٹرین کی روانگی تک دونوں اُس دروازے پر نظریں جمائے کھڑے رہے۔ سٹیشن پر دو تین سواریاں اُتری تھیں اور کمرے کے مخالف سمت میں اُس راستے پر گامزن ہو گئیں جس راستے پر چل کر وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ سوار ہونے والے وہ دونوں ہی تھے۔ گاڑی یہاں بمشکل دو منٹ ہی ٹھہری تھی

Scanned by aazzamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

لیکن یہ دو منٹ دو صدیوں پر بھاری تھے۔ جیسے ہی گاڑی نے روانگی کا وسل دیا اُنہوں یوں محسوس ہوا جیسے ایک بڑا بوجھ اُن کے دِل و دماغ پر سے اُتر گیا ہو۔

دونوں جس ڈبّے میں داخل ہوئے ـــــ وہ بالکل خالی پڑا تھا۔ ایک برتھ پر ٹرین کا ایک گارڈ پڑا اونگھ رہا تھا۔ اُن کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ بالکل نروس ہو گیا۔ پہلے تو وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ گھبراہٹ اُس کے چہرے سے عیاں تھی بالکل یوں جیسے کسی نے اُس کی چوری پکڑ لی ہو۔

اُس کے دونوں ہاتھ بے اختیار بندھے اور اُس نے دونوں کو "جے ہند" کہہ کر پرنام کیا۔ بے چارہ دونوں کو اعلیٰ سرکاری افسر سمجھ رہا تھا۔ جواب میں خان نے سر ہلا کر بڑی نخوت سے اُس کے سلام کا جواب دیا اور دونوں بڑے پُروقار انداز میں ایک برتھ پہ بیٹھ گئے۔

گارڈ نے دانت نکالتے ہُوئے وہاں سے نکل جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

گاڑی نے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے اَب رفتار پکڑ لی تھی اور دونوں خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔

"گاڑی قریباً ایک گھنٹہ بعد اگلے سٹیشن پر رُکے گی" منوہر لال نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا ـــــ "میرے خیال سے ہمیں وہیں اُتر جانا چاہیئے۔ ہم وہاں سے الگ ہو جائیں گے" ـــــ آخر میں اُس نے اپنا فیصلہ بھی سُنا دیا۔

"ٹھیک ہے" خان نے بددلی سے کہا۔ وہ خوفزدہ تو نہیں تھا لیکن یہ ضرور چاہتا تھا کہ ابھی اُس کا دوست اُس سے الگ نہ ہو۔ وہ اُس سے دوبارہ اپنے پاکستان کی بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔

منوہر لال نے اُسے راستے میں آنے والے دیہاتوں، ریلوے سٹیشنوں اور لبوں کے اڈّوں کے نام بتانے شروع کر دیئے۔ اُس نے خان کو بہت سی "محفوظ سروسز" کا ادراک بھی کروا دیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ ان گاڑیوں اور لبوں کی روانگی کے اوقات کیا ہیں۔ اُس کو اس علاقے کے چپّے چپّے سے متعلق اتنی معلومات حاصل تھیں جیسے وہ وہیں پلا بڑھا ہو۔ خان اندازہ کر سکتا تھا کہ کتنی اہم شخصیت اُس کے ہمرکاب ہے جو شخص اتنی معلومات اِس علاقے سے متعلق رکھتا تھا اُس نے اپنے مُلک کے لیے یہاں کیا کچھ نہ کیا ہو گا؟"

"کمال ہے یہ لوگ اتنی جلدی ہمارے سروں پہ پہنچ گئے" ـــــ منوہر لال نے اُسے اداس دیکھ کر خود ہی اُسے چھیڑا۔

"ہاں ہماری روانگی کے کچھ دیر بعد ہی کوئی اُس طرف کسی کام سے آیا ہو گا" خان نے اپنی رائے پیش کی۔

"تمہارا دوست بہرحال محفوظ ہے" منوہر لال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اَب تو وہ تمہارا دوست ہے۔ مَیں نے تو اُس کو یورپ میں ملاقات تک "رام رام" کر دیا ہے" خان نے بھی چاہا کہ ماحول میں موجود تناؤ کو ختم ہونا چاہیئے۔

"اُس کے جواب میں منوہر لال صرف مُسکرا کر رہ گیا۔

"خدا جانے اب زندگی میں ملاقات ہو یا نہ ہو" خان سے رہا نہ گیا۔

"ہاں ـــــ اُس کا تو علم نہیں لیکن تمہاری رفاقت میں گزرے اِس وقت پر مَیں بھی ہمیشہ فخر کروں گا۔ تم واقعی ایک بہادر انسان ہو ـــــ ایک سچّے اور سُچّے پاکستانی۔ مجھے یہ ملاقات ہمیشہ یاد رہے گی"

"مجھے بھی" ـــــ خان نے کہا۔

"اگر اللہ نے چاہا تو ممکن ہے اپنے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد جب ہم سرخرو ہو کر اپنے وطن آئیں تو ایک دوسرے سے مِل سکیں" منوہر لال نے کہا۔

"ہاں ـــــ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر مَیں ہار گیا تو تم سے کبھی مِلوں گا نہیں۔ مجھے شکست خوردہ چہرے کے ساتھ کسی کا سامنا کرتے ہوئے بہت شرم آتی ہے" خان نے

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

نجانے کیوں اُسے یہ بات کہہ دی۔ شاید اُس کے لاشعور میں موجود "را" کی پلاننگ کی تباہ کاریاں اُس کا باعث تھیں۔

"خدا نہ کرے! تم کبھی ناکام نہیں لوٹو گے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے: تم جہاں کہیں بھی جاؤ گے سرخرو ہو کر واپس آؤ گے۔"

ایک گھنٹے کا دونوں کو پتہ بھی نہ لگا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔ دونوں سٹیشن پر اُترنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یہ سٹیشن کچھ آباد رہا کرتا تھا۔ منوہر لال اچانک اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے بازو خان کی طرف پھیلا دیئے۔ خان بھی سیٹ سے اُٹھا اور اُس کے سینے سے لگ گیا۔

○

دونوں پر جدائی کے یہ لمحات بہت شاق گزر رہے تھے۔ قریباً ایک ڈیڑھ منٹ تک وہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں گنتے رہے۔ پھر منوہر لال نے سرگوشی میں کہا:

"میں تمہاری پُروقار واپسی کے لیے خدا سے دُعاگو رہوں گا۔"

"اللہ تمہیں بھی اپنی امان میں رکھے۔ تمہیں خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو ملک و قوم کی بڑی بدقسمتی ہو گی۔" خان نے کہا۔

دونوں الگ ہو گئے!

ٹرین کی رفتار اب اتنی کم ہو گئی تھی کہ دونوں باآسانی اُتر سکتے تھے۔ سٹیشن ابھی کچھ دور تھا۔ جب دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اُترے اور دُھند اور اندھیرے کی چادر میں غائب ہو گئے۔

گاڑی میں اونگھتے کسی مسافر کے لیے اُنہیں دیکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ کوئی اپنے ڈبے کی کھڑکی کھولنے کا حوصلہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں نے چھلانگ

لگانے کے بعد زمین سے چپکے رہنے ہی میں عافیت جانی اور جب ٹرین گزر گئی تب اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ دونوں کی چھٹی حس کسی پیش آمدہ خطرے کا سگنل دے رہی تھی۔

"فی امان اللہ" ــــ خان نے اُس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ" ــــ منوہر لال بولا اور اُس کی طرف دیکھے بغیر ریلوے لائن کو اُس کی مخالف سمت سے عبور کر گیا۔

عابد خان کچھ دُور تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ــــ دُھند اتنی زیادہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

بہت جلد وہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ خان نے اُس کی مخالف سمت سفر کے لیے اختیار کی تھی۔ منوہر لال کے بتائے ہوئے رستے اُس کے دماغ پر نقش تھے اور وہ اسی اندازے کے سہارے کہر کی چادر میں دُور تک دھنستا چلا جا رہا تھا۔

○

ریلوے سٹیشن پر موجود بھارتی انٹیلی جنس نے اتنی احتیاط برتی تھی کہ مقامی پولیس کو بھی اُن کی آمد سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

انہوں نے گاڑی سے متعلق بھی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ دونوں "پاکستانی کمانڈوز" کے متعلق وہ جانتے تھے کہ بہ ضرورت سے زیادہ ذہین اور ہوشیار ہیں اور کوئی بھی شک پڑنے کی صورت میں راستے ہی میں ٹرین سے چھلانگ لگا کر غائب ہو سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہ کارروائی صیغۂ راز میں رکھی تھی۔

ٹرین کے پچھلے سٹیشن سے روانگی کے بمشکل آدھ گھنٹے بعد ہی سٹیشن ماسٹر جب کسی کام سے اپنے کمرے میں گیا تو بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ ائیر فورس انٹیلی جنس نے فوراً وائرلیس کے ذریعے اگلے سٹیشن کو خبردار کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ دونوں درجہ اوّل کے ڈبے میں سفر کر رہے ہیں۔

Scanned by aazamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

اُنہوں نے راستے میں گاڑی روک کر اُنہیں گرفتار کرنا مناسب نہیں جانا تھا کیونکہ اندھیرا اور دُھند اتنی زیادہ تھی کہ دونوں باآسانی فرار ہو سکتے تھے۔ اُن لوگوں کو قوی امید تھی کہ جتنی رازداری سے اُنہوں نے دونوں کی گرفتاری کا منصوبہ ترتیب دیا ہے اُن کے بچ کر نکل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور ٹرین کے پلیٹ فارم میں داخل ہونے سے پہلے ہی مقامی سکیورٹی کے پندرہ بیس مسلح افراد اعلیٰ درجے کے تینوں ڈبوں کے دونوں اطراف چمٹ گئے تھے لیکن جب وہ ٹرین رُکنے پر ڈبوں میں داخل ہوئے تو ناکامی اُن کا مُنہ چڑا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی بوکھلائے ہوئے سکیورٹی حکام اپنے ہیڈ کوارٹر کو دونوں "کمانڈوز" کے فرار کی خبر سُنا رہے تھے جس کے جواب میں اُنہیں بے تحاشا گالیاں اور فوراً "پھیل کر" علاقے کو گھیر لینے کے احکامات موصول ہو رہے تھے۔

اُن کے بس میں اگر ہوتا تو ان جاسوسوں کو وہ کچا چبا جاتے۔ جنہوں نے دو مرتبہ اُنہیں زِک پہنچائی۔ اور اُن کے ہاتھ میں آ کر اتنی آسانی سے پھسل گئے تھے۔

○

ایک مرتبہ وہ پھر موت سے لڑ رہا تھا۔!

ایک تھکا دینے والی اور لمبی لڑائی کا آغاز ہو چکا تھا ـــــ اتنی شدید دُھند کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا اور وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا چلا جا رہا تھا۔

اس بات کا تو اُسے بخوبی علم تھا کہ شکاری کُتّے کی طرح بھارتی سکیورٹی اُس کے تعاقب میں ہے۔ دُھند کی چادر گہری ہوتی چلی جا رہی تھی اور خان اُسے تائیدِ ایزدی سمجھ رہا تھا۔

یہ بات اُس کے لیے باعثِ اطمینان تھی کہ اس گہری دُھند میں وہ لوگ ٹارچوں کی روشنی بھی دُور تک نہیں پھینک سکتے۔ اُس نے جان بوجھ کر کھیتوں کا راستہ اپنایا تھا۔

کیونکہ سڑکیں اور دوسرے محفوظ راستوں پر اب تک وہ لوگ پھیل چکے تھے۔

منوہر لال کا سمجھایا ہوا نقشہ اُس کے ذہن کے کینوس پر پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے یہ تو اندازہ نہیں تھا کہ کس گاؤں میں سفر کر رہا ہے لیکن یہ ضرور احساس تھا کہ کتنی دیر بعد اُسے برساتی نالہ، ریلوے لائن اور دوسرے اہم مقامات کے نزدیک سے گزرنا ہے۔

اُس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو پہلے ان کپڑوں سے نجات حاصل کرے۔ کیونکہ یقیناً اُس کے کپڑوں اور حلیے سے اُن لوگوں کو آگاہ کر دیا گیا ہو گا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر دُور دُور تک پھیلی سیاہیاں بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس کی بدقسمتی پر نوحہ کناں تھیں۔ عابد خان کو چلتے ہوئے قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے ہو چلے تھے اور ابھی تک اُس کا کسی سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔

وہ چلتا اور سوچتا جا رہا تھا کہ کس طرح اِس صورتحال سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرے۔ گزرے واقعات اُس کے ذہن کے پردۂ سکرین پر ایک ایک کر کے رینگ رہے تھے جب اچانک ایک خیال نے اُسے چونکا دیا۔ اُسے یاد آ گیا "کرانبالہ میں جب شام کے بعد اُس نے ایک زبردست "مذہبی جلوس" کو گزرتے دیکھا تھا تو منوہر لال نے اُسے بتایا تھا کہ یہاں "رام سوامی اُتسو" منایا جا رہا ہے۔"

اُسے اب تک اس بات کی اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ بھارت میں ہر پچاس ساٹھ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہندوؤں کا بھگوان بدل جاتا ہے۔ یہاں اتنے بے شمار بھگوان تھے کہ اُن کے نام یاد رکھنا کارِ دارد تھا۔ یہ بھی کسی مقامی بھگوان کا "اُتسو" ہو گا؛ اُس نے سوچا۔!! پھر ایک خیال کوندے کی طرح اُس کے ذہن میں لپکا کہ وہ کیوں نہ "رام بھگت" کا روپ دھار کر اس علاقے سے نکل جائے؟

○

اُسے علم تھا کہ یہاں قریباً ہر گاؤں میں موجود مندر میں لوگ آج "جگ راتا" کر

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

رہے ہوں گے۔ کسی بھی بھگت کے کپڑے ہتھیائے جا سکتے تھے۔ کسی بھی طرح ؟ اس نے سوچا اور اپنی سوچ پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اَب کھیتوں کا سلسلہ اُس نے چھوڑ دیا تھا اور اپنے حساس کان کسی مندر کے شور کو سُننے کی طرف مائل کر رہا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد ہی اُس کی مُراد بَر آئی۔ !

عورتوں اور مردوں کی ملی جلی بے ہنگم آوازوں کے پس پردہ ناشے چھینے اتنی شدت سے بجائے جا رہے تھے کہ بہروں کے بھی کان کھول دینے کو کافی ہوتے۔ اُس نے سمت کا اندازہ کر کے اُس نے اُسی جانب پیشقدمی شروع کر دی۔ دُھند کی وجہ سے سامنے کا منظر دُور تک تو نظر آ نہیں سکتا تھا بس وہ آوازوں کے انداز سے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

پھر دُھند کی اس دبیز چادر سے ایک مندر پہ کیے گئے چراغاں کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ مندر کو بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا تھا لیکن دُھند میں روشنیاں کچھ دُھندلی ہی جا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ گاؤں کے باہر بنے مندر سے کچھ فاصلے پر ایک کھیت پہ بیٹھا صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ جلد ہی اُس نے اندازہ لگا لیا کہ مندر کے نزدیک پھٹکنے کا تو تصور ہی محال ہے۔ اُس کی کامیابی صرف ایک ہی صورت میں ممکن تھی ؛ کہ کوئی بدقسمت "رام بھگت" کسی ضروری حاجت سے اِس کھیت کی طرف آئے اور وہ اُس کا شکار بنے۔

پندرہ بیس منٹ اِسی جان لیوا انتظار کی بھینٹ چڑھ گئے لیکن کوئی اُس طرف نہ آیا۔ مایوس ہو کر اَب خان نے یہاں سے اُٹھنے اور مندر سے گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی وہ اُٹھنے کے لیے پَر تول ہی رہا تھا جب اچانک اُس کے کانوں میں "رام رام" کی بھنک پڑی۔ خوشی سے اُس کا دِل بلیّوں اُچھل پڑا۔

دُھند میں اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھنا شروع کر دیا۔ جلد ہی اندھیرے میں ایک ہیولا نمایاں ہونے لگا۔

نووارد کے ہونٹ سردی سے کپکپا رہے تھے اور اُس کے مُنہ سے "رام رام" بھی بڑی مشکل سے اور بہت بگڑی ہوئی شکل میں ادا ہو رہا تھا۔ خان کماد کے کھیت میں شست لگائے بیٹھا تھا۔ "رام بھگت" اُس کے نزدیک آ رہا تھا۔ یہاں تو یوں بھی بہت اندھیرا تھا۔ اگر دِن کا اُجالا بھی ہوتا تو بھی اُس کے لیے خان کو دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔ اُس نے خود کو چُھپانے کی خصوصی تربیت کمانڈوز سے حاصل کی تھی اور کھیت کا ایک حصّہ بن کر وہیں بیٹھا ہُوا تھا۔

نووارد اُس سے بمشکل چند گز ہی آگے گیا تھا جب خان نے بیٹھے بیٹھے اچانک اپنی پوزیشن بدلی اور چیتے کے سے انداز میں پنجوں کے بَل اُچھل کر اُس پر سوار ہو گیا۔ ایک تو سردی نے ہی اُس کا حال پتلا کر رکھا تھا اُوپر سے خان آسمانی آفت کی شکل میں اُس کی گردن دبوچ رہا تھا۔ خوف کے مارے رام بھگت کا یہ حال تھا کہ اُس کے مُنہ سے کوئی آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے اُس کا شکار زمین چاٹ رہا تھا۔ آدمی درمیانی عمر کا دھان پان سا تھا۔ اُس کے گنجے سر پہ لٹکتی بالوں کی لٹ اُس کے ٹھیٹھ برہمن ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ خان نے اُسی طرح بیہوش برہمن کو کندھے پہ لادا اور ایک سمت کو چل دیا۔ اُس نے کچھ کر گزرنے سے پہلے آنے والے وقت کے متعلق بھی پلاننگ طے کر لی تھی ؛ اُسے علم تھا کہ اُس کا شکار ہوش میں آتے ہی چیخنا چلّانا شروع کر دے گا اور اُس کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے اُس کی تازہ واردات منظرِ عام پہ آئے۔

○

قریباً آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد بالآخر وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا ——— یہ کھیتوں میں گھرا

Scanned by aazamm@Urdu

aazzamm@yahoo.com

ہُوا ایک ٹیوب ویل تھا جس کے مالک نے یہاں ایک کچا سا کمرہ بنا رکھا تھا۔

کماد کی فصل پک چکی تھی اور خان جانتا تھا کہ اس ٹیوب ویل کا مالک اگر اس طرف آیا بھی تو صبح کافی دیر گئے سے آئے گا۔ اُس نے لکڑی کے دروازے کو کھولا تو دروازوں نے اِس کی حرکت پر شدید احتجاج کیا تھا۔ اندر موجود واحد چارپائی پر اُس نے بیہوش پنڈت جی کو پھینکا اور اُس کی دوائن (رسّی) کھولنے لگا۔ اُس نے اپنے شکار کی جسمانی ساخت کا اندازہ لگانے کے بعد ہاتھ ذرا ہلکا رکھا تھا۔ اِس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ دو تین گھنٹے تک تو یہ جاگ نہیں سکے گا۔

بے ہوش پنڈت کے پاؤں اور ہاتھ اُس نے اِس طرح چارپائی سے باندھ دیئے کہ اگر وہ چاہے تو خود کو رسّیوں سے آزاد کروا سکے لیکن اِس میں خاصا وقت لگ جاتا۔ اُسے علم تھا کہ اوّل تو خوفزدہ پنڈت کے ہوش میں آنے کے بعد حواس ہی باختہ ہو چکے ہوں گے اور اگر اُسے عقل بھی آگئی تو بہت دیر کے بعد آئے گی۔ رسّی سے ایک چھوٹا ٹکڑا اُس نے علیحدہ کر لیا تھا۔

باندھنے سے پہلے اُس نے "رام بھگت" کو اُس کے بلیے گیروی چولے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اُس کے گلے میں لٹکتا جینوا اور دوسرے دھاگے بھی اُس نے اُتار کر اپنے گلے میں پہن لیے تھے۔ چولا ہاتھ میں پکڑے وہ باہر آگیا۔

دروازے پر تو اُس نے دوبارہ باہر سے گنڈی لگا دی تھی اور رسّی کا وہ ٹکڑا جو اُس نے کاٹ کر الگ کر لیا تھا اِس طرح گنڈی میں پھنسا دیا کہ اندر سے بہت زور لگانے پر بھی دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔

باہر آکر اُس نے اپنا کوٹ اُتار دیا اور باقی کپڑوں پر وہی گیروی رنگ کا لمبا چوغا پہن لیا۔ ماتھے پر تلک تو لگا ہی رہتا تھا گلے میں جینوا اور اُلٹے سیدھے دھاگے ڈال کر اب وہ "رام بھگت" بن چکا تھا۔ اِس طرح کم از کم اُس کے لیے نزدیکی کسی شہر میں داخل

ہونا قدرے آسان ہو گیا تھا۔

○

واپسی کا سفر کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کوٹ اُس نے ایک کھیت میں دبا دیا تھا اور اب بڑی تیزی سے منوہر لال کے سمجھائے ہوئے نقشے کے مطابق سوئے منزل گامزن تھا۔ اُس نے اِس دوران ریلوے لائن اور دو تین نالے عبور کر لیے تھے اور اب وہ اندازاً پندرہ بیس میل دُور نکل آیا تھا۔

صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ آسمان پر صبح کاذب کی سُرخی نمایاں ہونے لگی تھی لیکن دُھند بدستور گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔

ابھی تک اُسے کسی خطرے کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اُس کا اندازہ تھا کہ اس طرف سے ناکام ہو کر اب بھارتی سکیورٹی نزدیکی قصبوں اور شہر میں اُس کے لیے جال پھیلائے گی۔ لیکن یہ کھیل اب اُس کے لیے نیا نہیں رہا تھا۔ وہ اب اِس میں بے نام سا لُطف بھی محسوس کرنے لگا تھا۔

اگر وہ منوہر لال کے سمجھائے ہوئے نقشے کے مطابق چلا تھا تو اب جس قصبے کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ وہ یقیناً ماکھن پور ہی کا قصبہ تھا۔ سورج نے بھیگے ہوئے کھیتوں اور گہری دُھند کے عقب سے سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اور خان کے قدم بڑی تیزی، احتیاط اور اعتماد سے ماکھن پور کے اُس بڑے مندر کی طرف اُٹھ رہے تھے جس کے ناوڈ سپیکروں نے آسمان سر پہ اُٹھا رکھا تھا۔

"جگ راتا" ختم ہو رہا تھا اور اب اِس مندر سے "رام سوامی اُلتسو" کا جلوس تیار ہو کر نکل رہا تھا۔ منوہر لال کے بتائے ہوئے نشانات کی مدد سے اُس نے پہچان لیا کہ یہ واقعی "ماکھن پور" ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماکھن پور کے ایک بازار میں سردی سے ٹھٹھرتے لوگوں کے ساتھ

Scanned by azam@UrduLand.com

aazzamm@yahoo.com

"رام رام" کی مالا جپتا بڑے مندر کی طرف جا رہا تھا۔ یہ سب لوگ اس جلوس میں شرکت کے لیے نزدیکی دیہاتوں سے گیروی رنگ کے لمبے لمبے چولے پہنے اس طرف آ رہے تھے۔ ماکھن پور کے نزدیکی تین چار دیہاتوں کے نام ذہن میں دھرا کر اُس نے خود کو دل ہی دل میں ایک دیہات سے منسوب کیا اور بڑے اعتماد سے مندر کی طرف چل دیا۔

رام کی پالکی مندر کے باہر دھری تھی اور اردگرد کے دیہاتوں کے سینکڑوں لوگ وہاں جمع ہو رہے تھے۔ لوگوں کی اس بھیڑ میں وہ بھی غائب ہو گیا۔ جلوس کے شرکاء میں مقامی مندر سے "پرشاد" تقسیم کیا جا رہا تھا۔ خان نے مٹھائی اور چائے کا ایک بڑا مگ پی کر خود کو تازہ دم کیا اور اپنی راہ چلنے لگا۔

جلوس نے اب آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اونچی اونچی آواز میں کورس کی شکل "آرتی" گا رہے تھے۔ وہ بھی شرکاء کی آواز میں آواز ملا کر بڑے خشوع و خضوع سے رام نام الاپ رہا تھا۔ جلوس نے شہر کا چکر لگانا شروع کر دیا تھا۔ اور اُس کے شرکاء کی تعداد اب ہزاروں میں پہنچ چکی تھی۔

جلوس اب شہر کے بڑے دروازے سے گزر رہا تھا۔ جلوس کے ہزاروں شرکاء نے اسی رنگ کا اسی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ اور کوئی بھی اُن سے الگ نظر نہیں آتا تھا۔ خان جان بوجھ کر جلوس کے قریباً درمیان میں چل رہا تھا۔ بازار کے دونوں اطراف بنے مکانات اور دکانوں پر سے لوگ جلوس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ ان پتیاں نچھاور کرنے والوں میں اُسے دو تین مشتبہ چہرے بھی دکھائی دیئے لیکن اب وہ اُن کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔

جلوس کے شرکاء اب پہلے سے تیار لاریوں میں سوار ہو کر انبالہ جا رہے تھے جہاں کسی بڑے مندر میں پوجا کی آخری رسومات ادا کرنی تھیں۔ خان بھی ایک ایسی ہی لاری کی چھت پر دوسرے لوگوں کے ساتھ سوار ہو گیا۔ وہ جان بوجھ کر چھت پر بیٹھا تھا۔ لوگ

لاریوں میں بُری طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ چھت پر بھی سوار تھے اور لاریوں کی پُشت سے لگی لوہے کی سیڑھیوں سے بھی چمٹے ہوئے تھے۔

یہ ٹوٹی پھوٹی لاریاں یاتریوں کے بوجھ سے دبی ہوئی تھیں اور خان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے بچک کر رہ جائیں گی۔ شہر کے باہر تک ایسی لاریوں کی قطار لگی ہوئی تھی اور وہ کیڑی کی چال چلتی شہر سے باہر انبالہ کو جانے والی سڑک کی طرف رینگ رہی تھیں۔

اب وہ لوگ شہر سے باہر آ چکے تھے۔ مسلسل جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے اور نعرے لگانے سے خان کو اپنا حلق اب دُکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے جوش میں اب خاصی کمی آ گئی تھی۔ شہر کے باہر دو تین میل تک یہی کیفیت رہی۔ اچانک خان نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

"کیا ہے بے؟" ایک پنڈت کے سر پر جونہی اُس نے پاؤں دھرا وہ زور سے چلایا۔

"شما کیجئے" ـــــ خان نے اُوپر بیٹھے بیٹھے اُنگلی سے پیشاب آنے کا مخصوص اشارہ کیا۔

پنڈت نے بُڑبُڑاتے ہوئے اپنا کندھا ایک طرف ہٹا لیا اور خان باقی لوگوں کی گالیاں سنتا بالآخر رینگتی بس سے نیچے اُتر آیا۔ اُس نے پیشاب کرنے کے لیے واقعی کھیتوں کا رُخ کیا تھا لیکن کھیتوں میں وہ رُکا یا بیٹھا نہیں تھا بلکہ اندر ہی اندر چلتا رہا۔

اس دوران اُس نے چولے سے نجات حاصل کر لی اور اُسے کھیتوں ہی میں دبا دیا۔ اب وہ یہاں سے ڈیڑھ میل دُور ایک دوسری سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ پٹیالہ جانے والی پنجاب روڈ ویز کی ایک بس میں سوار ہو رہا تھا۔

بس نے اُسے دوپہر کے بعد پٹیالہ پہنچا دیا ـــــ!

لاری اڈے پر پہنچتے ہی اُس نے بازار کا رُخ کیا اور ایک "وشنو ڈھابے" میں

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

جا گھسا دال پھلکا کھانے اور چائے پینے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا اُس کے چہرے پر دُور دُور تک کہیں بھی تھکاوٹ کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

پٹیالہ ہی کے ایک ہوٹل میں اُس نے اپنے لیے ایک کمرہ بُک کروایا اور جب وہ ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا تو خاصا مہذب دکھائی دے رہا تھا: ایک بریف کیس اُس کے ہاتھ میں تھا اور تازہ خریدے گئے ریڈی میڈ کپڑے اُس نے پہن رکھے تھے۔

اُسی ہوٹل سے اُس نے دہلی میں اپنے گھر کے لیے کال بُک کروائی۔

—— جب وہ اپنے کمرے میں موجود ٹیلیفون ایکسچینج پر دہلی میں رما سے بات کر رہا تھا تو اُس ہوٹل کے منیجر کی جو مقامی سی۔آئی۔ڈی کا ٹاؤٹ بھی تھا مکمل تسلی ہو چکی تھی۔

رما نے اُس کے مختصر مدت کے لیے غائب ہو جانے پر بھی بڑی بیقراری کا اظہار کیا تھا اور خان نے جان بوجھ کر مسٹر سہائے سے بھی بات کی تھی اور یہی بہانہ تراشا تھا "کہ وہ یہاں پنجاب میں سستی مارکیٹ دیکھ کر آیا ہے۔" اُس نے مسٹر سہائے کو بتایا تھا کہ اُس نے پٹیالہ میں کینوس بنانے والے بہت سے کاریگروں سے جنہوں نے اپنے گھروں میں پاور لومز لگا رکھی ہیں بات چیت کر لی ہے۔

مسٹر سہائے تو اُس پر بچھا جا رہا تھا ——!!

رات کا کھانا خان نے اپنے کمرے ہی میں منگوایا اور جلدی سو گیا۔ اگلے روز علی الصباح اُس کی آنکھ مندروں اور گوردواروں میں سے اٹھنے والے پوجا پاٹ کے شور کی آواز سے کھلی۔ ہوٹل کے منیجر نے جسے اُس نے رات ہی اپنا دوست بنا لیا تھا اُس کے لیے صبح دس بجے جانے والی گاڑی کے اوّل درجے کی سیٹ بُک کروا رکھی تھی۔

اس نے خان کو بڑا بزنس مین سمجھ کر درخواست کی تھی کہ وہ جب بھی پٹیالہ آئے اُس سے ضرور ملا کرے۔ خان نے بھی رسماً اُسے جوابی دعوت دی تھی۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

شام گئے جب وہ دہلی کے سٹیشن پر گاڑی سے اُترا تو کشور اور رما اُس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اُس نے رات ٹیلی فون پر رما کو اس بات کا امکان ظاہر کیا تھا کہ وہ شاید اس ٹرین سے واپس آئے اور وہ یہاں سٹیشن پر چلی آئی تھی۔

"میں تو اب جاتا ہوں دیدی! تم سنبھالو بھیا کو ——" کشور نے سٹیشن کے باہر آ کر موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ دفع ہو جاؤ ——" رما نے بظاہر ناراضگی کا اظہار کیا۔

"شکر ہے بھگوان کا۔ مجھے اسے ساتھ لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" خان نے اس کی روانگی پر ٹھنڈی سانس لی۔

جواب میں رما ہلکا سا قہقہہ لگا کر رہ گئی۔

دونوں نے سیدھے گھر جانے کے بجائے ایک ریستوران کا رُخ کیا —— اور تھوڑی دیر بعد ہی دہلی کے ایک مشہور ہوٹل کے فیملی کیبن میں بیٹھے ہوئے دونوں کافی کی پیالیاں سامنے رکھے اپنے مستقبل کے خواب بُن رہے تھے۔

ہال میں ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا اور خان رما کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا جو اُس سے صاف صاف کہہ رہی تھیں: ستاروں کی تابندگی اور بہاروں کی رعنائی صرف اور صرف ہمارے ہی دم سے ہے —— ہم ہی تو ہیں جنہوں نے سمندروں کو گہرائیاں دی ہیں۔

دونوں کے درمیان میز موجود ہونے کے باوجود رما کے پیار کی تپش اس کو جلائے جا رہی تھی۔ اُس کا بدن آگ کی طرح حرارت بخش اور دل دودھ میں دھوئے سنگِ مرمر کی طرح اُجلا اور بے داغ تھا۔ خان نے کئی مرتبہ اُس کے آبنوسی ماتھے پر ایک پُراسرار پُرتقدس سی چمک کو لہراتے دیکھا تھا —— اور اُس لمحے اُسے یہ لڑکی کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق دکھائی پڑتی تھی۔

aazzamm@yahoo.com

دوسری طرف رما سوچ رہی تھی: "کہ کیا زندگی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے؟"

اُس نے لڑکپن ہی سے جو ایک خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کی تعبیر کتنی جلدی اُسے مل گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی: "کہ اس سنسار میں کوئی اور ایسی خوش نصیب لڑکی بھی ہو گی جس نے اُس کی طرح خواب دیکھا اور اُس کی تعبیر بھی فوراً پا لی ——؟ ہوٹل میں لوگوں کی آمد میں مزید اضافہ ہونے لگا تھا اور رما یہاں بیٹھی خاصی گھبراہٹ محسوس کرنے لگی تھی۔

"آؤ کہیں اور چلتے ہیں۔" اُس نے اپنی کھلی آنکھوں سے خان پر جادو پھونکتے ہوئے کہا۔

"اچھا" —— خان نے کسی سحر زدہ معمول کی طرح جواب دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک مودب بیرا دونوں کو اٹھتے دیکھ کر بل لے آیا تھا۔ بل رما نے ادا کیا تھا اور ہوٹل کے باہر ایک ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگی۔ خان نے اُس سے کچھ نہ پوچھا اور اُس کے پیچھے پیچھے خاموشی سے کھنچا چلا آیا۔

"کناٹ پیلس"

رما نے دروازہ بھی خان کے لیے خود ہی کھولا تھا اور اُس کے برابر بیٹھتی ہوئی ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوئی تھی۔

راستے میں دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ خان کی خواہش تھی کہ شام ڈھلنے تک وہ لوگ گھر پہنچ جائیں کیونکہ اُسے اُسی رات اپنے پاس موجود کاغذات کو کسی اور محفوظ ہاتھوں تک پہنچانے کے بارے ہدایات موصول ہونا تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ رما کے سامنے خود کو بالکل بے بس سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ آج بھی نیلی ساڑھی میں ملبوس اس آرٹسٹ لڑکی نے اُسے مغلوب کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ اُس کا رُعبِ حسن تھا کہ خان بہت کچھ چاہنے کے باوجود اُسے کچھ نہ کہہ سکا۔

دونوں جمنا کے کنارے کنارے چلتے بہت دُور تک آ گئے تھے۔ اس دوران رما اس سے باتیں کرتی رہی اُسے اپنے بچپن، سکول، کالج کی باتیں سُناتی رہی اور وہ "ہوں، ہاں" کرتا رہا۔ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور دریا کنارے بنے اُس مخصوص پتھر پر کھڑے ہو گئے جہاں رما اکثر اُسے لایا کرتی تھی۔

دونوں ایک دوسرے میں گم دُور مغربی اُفق میں ڈوبتے سورج کا نظارہ کر رہے تھے۔ —— ڈوب جانے سے پہلے شفق کی سُرخی سے اس کے سارے دن کا بڑھاپا شگفتہ اور جوان لگ رہا تھا اور اپنی موت سے بغلگیر ہو ہو کر اُس کا سر جمنا کے پانیوں کی گہرائیوں میں ڈھلکتا جا رہا تھا۔ سورج کی روشنیوں کی موت کا یہ منظر دریا کی سطح پر زندگی کی بڑی خوبصورت پیاری رنگ برنگی اور متحرک شکلیں بنا رہا تھا۔ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اُس نے رما کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبا دیا۔

"چلئے" —— رما نے کسی پیش آمدہ طوفان کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔

"چلو"

دونوں شام ڈھلے گھر پہنچے تو گھر کے سب ہی لوگ اُن کے منتظر تھے۔ شاید کشور نے گھر والوں کو اُن کی آمد سے باخبر کر دیا تھا۔

"ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا" —— رما نے کسی کے پوچھنے سے پہلے ہی دیر ہونے کا جواز پیش کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

مسٹر سہائے نے خان کو بتایا تھا کہ بلاقی رام کو انہوں نے اگلے ہفتے اُس کے بیوی بچوں سمیت دعوت پر بُلایا ہے۔

"شکر ہے بھگوان کا کہ آپ بھی بزنس مین بننے لگے" —— خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ کھانا سب نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ پھر وہ سب ٹی۔ وی کے سامنے آ کر حسبِ سابق بیٹھ گئے۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

تھوڑی دیر بعد ہی مسٹر ارون کمار کے لیے فون آگیا۔

"ارے کیا مصیبت ہے بھئی" فون سُن کر وہ بڑبڑاتا ہوا اُسی کمرے میں آگیا۔

"کیا ہوا؟" مسٹر سہائے نے پُوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔ رات دس بجے کی گاڑی سے ایک دوست آرہا ہے۔"

"بیٹا مہمان تو بھگوان کی دیا ہے۔" مسز سہائے نے سمجھایا۔

"جی اگر وہ میں آئیں تو ـــــ اتنی رات گئے نہیں" کشور کی بات پر سب ہنس دیئے

اُس نے احتیاطاً ابھی تک اپنے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے۔ یہ فون مقامی دوستوں کی طرف سے تھا۔ جس میں اُسے بتایا گیا تھا کہ اُس نے اپنے پاس موجود کاغذات کس کو اور کہاں منتقل کرنے ہیں۔

"یار ذرا موٹر سائیکل کی چابی تو دینا" ـــــ اُس نے کشور سے درخواست کی۔

○

تھوڑی دیر بعد وہ ایئرپورٹ کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ اِس مرتبہ خصوصی احتیاط برتی گئی تھی اور اُسے صرف آدھ گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ مطلوبہ وقت تک وہ بہرحال ایئرپورٹ پر پہنچ چکا تھا۔

دہلی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر مختلف ایئرلائنز کے جہاز چڑھ اور اُتر رہے تھے اور وہ مسافروں کے لاؤنج کے بالکل سامنے بنے ٹیلی فون بوتھ کے نزدیک آکر کھڑا ہوگیا۔ ایئرپورٹ کی گھڑی نے جب ٹھیک ساڑھے نو بجائے تو اس نے ٹیلی فون بُوتھ کے گرد اس طرح دو تین چکر کاٹے کہ اگر کوئی اُس طرف دیکھ رہا ہو تو وہ اُس کی حرکات کا اچھی طرح جائزہ لے سکے۔

اِس کے بعد بُوتھ کے نزدیک کھڑے ہو کر اُس نے اپنے ہاتھ انگڑائی لینے کے سے انداز میں فضا میں بُلند کیے اور وہاں سے چلتا ہوا لمبی راہداری کے ایک کونے میں

بنے ٹی سٹال پر آگیا۔ جہاں مسافروں اور اُن کے عزیزوں کے علاوہ مختلف ائرلائنوں کے ملازمین بھی سردی میں چائے اور کافی کی چُسکیاں لے رہے تھے۔

ابھی اُسے وہاں رُکے بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے جب اُس نے ٹیلی فون بُوتھ کے عقب سے ایک مخصوص ائرلائن کی وردی میں ملبوس سٹیورڈ کو اُس طرف آتے دیکھا۔ اُس کا دل بڑی زور سے چند لمحوں کے لیے دھڑکا، پھر نارمل ہوگیا۔

"ایک چائے" ـــــ خان نے ٹی سٹال والے کو مخاطب کیا۔

"ایک نہیں دو" ـــــ نووارد اب اُس کے ساتھ کھڑا ہوگیا تھا ـــــ "معاف کیجئے" اُس نے خان کو مخاطب کیا ـــــ "سردی آج کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے۔"

"موسم کا کیا اعتبار" خان نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ اِس دوران اُس نے نووارد کی ٹائی میں لگی ایک مخصوص پن بھی دیکھ لی تھی۔

دونوں چائے کی چُسکیاں لیتے ہوئے موسم پر گفتگو کرتے رہے خان نے چاہا کہ بل ادا کر دے لیکن نووارد جس نے اپنا نام اشوک بتایا تھا ـــ اُسے روک دیا اور اپنی بیک پاکٹ سے بٹوہ نکال کر اُس میں سے پیسے نکالنے لگا۔ چائے والے کو پیسے دیتے ہوئے اُس نے بٹوہ خان کے سامنے کھولا تھا اور اُس میں موجود پاکستانی کرنسی نوٹ خاص طور سے اُسے دکھا دیئے۔ یہ آخری "کوڈ" تھا جو اُس کی طرف سے خان کے لیے منتقل ہوا۔

"آیئے چلیں" ـــــ خان نے کہا اور اُس کے آگے آگے چل دیا۔

"اُس طرف" ـــــ اشوک نے اُس کی رہنمائی ایک قدرے ویران گوشے کی طرف کی۔

دونوں ہوائی اڈے کے ٹائیلٹ روم کی طرف جا رہے تھے ـــــ اِس جگہ دونوں کے علاوہ اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ دونوں کی آنکھیں داخلے کے دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

خان نے بڑی ہوشیاری سے تہہ شدہ کاغذوں کا لفافہ نکال کر اُسے تھما دیا اور

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

آشوک نے اُس سے بھی زیادہ ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ لفافہ اپنے "زیرِ جامہ" میں محفوظ کر لیا۔

"آپ چلیں ـــــ تھوڑی دیر بعد میری فلائیٹ بھی جانے والی ہے۔ مجھے فوراً جہاز جائن کرنا ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے پتلون کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" ـــــ اُس کے ساتھی نے کہا اور خان باہر نکل آیا۔

○

خان تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا ـــــ اُس کی نظریں اشوک کے چلتے ہوئے قدموں پر جمی تھیں کہ اُسے ایک چاپ سنائی دی ـــــ وہ ٹھٹکا، سنبھلا اور مُڑ کر دیکھنے لگا:

وہاں کوئی نہیں تھا ـــــ

کوئی بھی نہیں! البتہ ایک آواز آ رہی تھی: "اب کتنا عجیب لگتا ہے یہ سب کچھ ـــــ کبھی کبھی تو اپنا وطن عزیز، گھر بار، ماں باپ، بہن بھائی اتنے یاد آتے ہیں کہ رگیں ٹوٹنے لگتی ہیں، لیکن ـــــ

ـــــ ایک ہی سوچ مطمئن کر دیتی ہے: ہم یہاں اُنہی کے لیے تو ہیں ـــــ اُنہی کی خوشیوں کے لیے!

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا، پھر اُس نے خود سے سوال کیا:

"کس شہر کے رہنے والے ہیں؟"

"میں؟"

"میں؟ ـــــ سارے شہر ہی تو میرے شہر ہیں! اب تو یوں لگتا ہے جیسے میرا وجود پاکستان کے سارے شہروں کی مٹی کا مرکب ہے۔"

اور اگر اللہ نے چاہا تو ممکن ہے اپنے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد ہم سُرخرو ہو کر

اپنے وطن میں آئیں۔

ـــــ اپنے پاکستان میں آئیں اور ایک دوسرے سے دوبارہ مل سکیں۔"

وہ دِل ہی دِل میں جانے خود سے کیا کچھ کہتا رہا اور موٹر سائیکل گھر کا راستہ بڑی تیز رفتاری سے کاٹتی رہی۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

aazzamm@yahoo.com

بہن کی پہچان

گھر پہنچنے کے لیے اُس نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ رُک رُک کر مختلف سڑکوں سے گھومتا ہُوا رات گیارہ بجے کے بعد گھر پہنچا تھا۔

پچھلے اڑتالیس گھنٹے سے جو کاغذات اُس کے جسم کا حصّہ بنے ہوئے تھے۔ اُن کی خود سے محفوظ علیحدگی اور پھر محفوظ ٹھکانے تک پہنچ جانے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

رات دیر گئے تک حسبِ معمول وہ رَما سے باتیں کرتا رہا ـــــ کبھی کبھی اُسے بڑ اُلجھن سی ہونے لگتی تھی: رَما ہمیشہ ایک سی باتیں کرتی تھی ـــ لیکن دونوں گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ایک بے نام سی تشنگی محسوس کرتے تھے۔

صُبح دیر تک وہ سوتا رہا۔ سب لوگ اپنے کام کاج سے جا چکے تھے۔ بُوڑھا سہائے ایک کُرسی پر دھوپ میں ٹانگیں پھیلائے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس نے کمرے سے باہر سہائے اور مسز سہائے پر نظر پڑتے ہی "پائے لاگوں" کا نعرہ بلند کیا اور غسلخانے میں جا گھُسا۔

ماتا جی نے اُس کے لیے تازہ ناشتہ تیار کیا تھا کیوں وہ اپنے دھرم پُتر کی اس عادت کا اندازہ لگا چکی تھیں کہ وہ کبھی باسی چیزیں نہیں کھاتا تھا۔ ناشتے سے وہ ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ سوشیل اپنے بچّوں کے ساتھ آ گئی۔ سوشیل کے بچّے اب اُس سے بہت

بے تکلف ہو گئے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی دونوں "انکل انکل" پکارتے خان کی طرف لپکے اور اُس کی باہنیں بے اختیار پھیلتی چلی گئیں۔ پھر دونوں کو اُس نے اپنے پھیلے ہُوئے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی خان نے عادت کے مطابق اخبار اُٹھایا اور اُس پر سرسری نظریں دوڑانی شروع کر دیں۔ پہلے ہی صفحے کے ایک کونے میں لگی خبر نے اُسے چونکایا۔ یہ خبر دہلی اور پنجاب کے مختلف شہروں میں پاکستانی جاسوسوں کے کارناموں کے متعلق تھی۔ اخبار نے اپنے ایک خفیہ ذریعے کے حوالے سے دعویٰ کیا تھا: کہ دو روز پہلے پاکستانی جاسوسوں نے انبالہ کے ہوائی اڈے سے کچھ انتہائی اہم دستاویزات اُڑا لی ہیں۔"

گو کہ اس خبر کی تصدیق سرکاری ذرائع نے نہیں کی تھی مگر اخبار اِس بات پر بضد تھا! اُسی اخبار نے یہ بھی لکھا تھا: "کہ اس سے پہلے بھی جاسوسوں کا یہی گروہ دہلی سے بھی بہت سی اہم دستاویزات اُڑا کر پاکستان پہنچا چکا ہے اور بھارتی انٹیلی جنس کو ان جاسوسوں نے بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔"

"دیکھی پاکستانی جاسوسوں کی خبر" ـــــ جیسے ہی خان نے اخبار لاپرواہی سے ایک طرف پھینکا سہائے نے اُسے مخاطب کیا۔

"بے پر کی اُڑاتے ہیں یہ اخبار والے" خان نے مُنہ بگاڑ کر دہلی کے کرخنداری لہجے میں کہا۔

سب ہی لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"ہونہہ" ـــــ سہائے نے مزید طنز کی ـــــ "یہ سالے ٹریننگ دے رہے ہیں اپنی چھاؤنیوں میں مُکتی باہنی کو ـــــ برخوردار میں نے آدھی زندگی مسلمان پولیس افسروں میں گزاری ہے۔ ایک بات یاد رکھنا کہ ہم تو سوچتے ہی رہ جائیں گے ۱۹۶۵ء میں بھی یہی ہوا تھا اور ۱۹۴۷ء میں بھی اُدھر کشمیر میں یہی تو ہوا تھا۔ یہ پلاننگ ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔"

Scanned by azamm@UrduLanz.com

aazzamm@yahoo.com

سہائے نے اچھا خاصا تبصرہ کر دیا۔

خان نے محسوس کیا تھا کہ جب سے وہ اس کے چھاؤنیوں میں تربیت لیتے بنگالی غداروں کو دیکھ کر آیا ہے تب سے اِن معاملات میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا تھا ورنہ تو پہلے کبھی سہائے کو اخبار غور سے پڑھتے ہی نہیں دیکھا تھا۔ اِس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی تھی کہ اَب اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ کچھ معاشی سکون میسّر آیا تھا اور اُس کی عادات میں بھی بڑے نامحسوس طریقے سے ایک تبدیلی سی آنے لگی تھی۔

"جانے بھی دیجئے بابُوجی!" سوشیل نے باپ کو ٹوکا ـــــ "ہفتہ میں ایک آدھ دفعہ آنا ہوتا ہے اور آپ پر نجانے آجکل یہ سیاست کیوں سوار ہونے لگی ہے کوئی اور بات کیجئے ناں۔"

"ارے بابا انسان ہوں میں بھی۔ مجھ پہ بھی سرد گرم کا اثر تو ہوگا۔ اچھا خیر جانے دو۔" پھر وہ خان سے مخاطب ہُوا ـــــ "کل آرہا ہے وہ ـــــ تمہارا بلاتی رام اپنے پرِیوار کو لے کر۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے مستقبل میں دو تین اور آرڈرز مِل جائیں گے۔" خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک تو تم دونوں پر نجانے بلاتی ہی کیوں سوار رہتا ہے ـــــ کون ہے یہ مُوا" مسز سہائے نے پُوچھا۔

"ارے ماتاجی! آپ دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔"

○

دیر گئے تک وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر خان سوشیل کے دونوں بچّوں کو شاپنگ کروانے اپنے ساتھ بازار لے گیا۔ اُس کی واپسی دوپہر کے بعد ہوئی۔ تب تک رَما بھی کالج سے واپس آچکی تھی۔ اُس کے انتظار میں ابھی تک کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔

"شام کو رجنی بہن بھی آرہی ہے ناں! فلم دیکھنے چلیں گے سب لوگ ـــ" اُس نے کھانے سے فارغ ہو کر کہا۔

"ارے کیوں نہیں۔ ونڈرفل۔" سوشیل نے خوشی کا اظہار کیا تو ماتاجی نے اُسے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ شاید انہیں اپنے "دھرم پُتر" کی دولت کا اس طرح ضیاع ہونا پسند نہیں تھا۔

"اصل میں کل ہمارے ہاں جو مہمان آرہے ہیں ناں ماتاجی! وہ لوگ اتنے بور ہوں گے کہ بس آپ سے کیا کہوں۔ اِس لیے مَیں چاہتا ہوں کہ آج کا دِن ذرا ٹھیک ٹھاک ہی گزرے۔"

"ارے کیوں نہیں بیٹا! پھر رجنی بیٹی بھی تو آنے والی ہے۔" مسز سہائے نے کہا۔

وہ لوگ ابھی باتیں ہی کر رہے تھے جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ رجنی کا فون تھا اور وہ اپنے دفتر سے اپنے "دھرم ویر" کو اپنی فوری آمد کی اطلاع دے رہی تھی۔

"تم ذرا موٹر سائیکل پر لے آؤ ناں اُسے۔ دیر ہو گئی تو رات کا آخری شو دیکھنا پڑے گا ـــــ مجھے تو نیند آنے لگی ہے۔" آشا نے کشور سے کہا۔

اُس نے کھا جانے والی نظروں سے آشا کی طرف دیکھا کیونکہ خان کے سامنے وہ انکار تو نہیں کر سکتا تھا! پھر اچھا کہہ کر باہر نکل گیا ـــــ کشور کی واپسی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ رجنی اَب اِس گھر کے فرد کی سی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ خان بھی اُس کے گھر میں بالکل اِسی طرح چلا جاتا تھا۔ جیسے یہاں مسٹر سہائے کے گھر میں۔ رجنی کی ماں کو وہ "موسی" کہا کرتا تھا اور اُس کا دل بھی اُس نے پہلی ہی ایک دو ملاقاتوں میں جیت لیا تھا۔ رجنی نے اپنی ماں کو بتایا تھا "کہ خان نے اُس کا بدلہ چکایا ہے۔" وہ خود اُس کی بہت ممنون تھی کہ خان نے جیتے جی اُس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتار دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خود رجنی کے ساتھ اُس کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں رجنی بغیر

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

کچھ کہے سُنے شروع ہو گئی تھی! انٹیلی جنس کی تربیت کے باوجود اُس کی عورتوں والی فطرت ابھی تک قائم تھی۔ اُس کی ہمیشہ سے خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنے پاس موجود اطلاعات جتنی جلدی ممکن ہو خان کو منتقل کر دے۔ خان اس کی باتیں اپنے ذہن میں نقش کر کے اُنہیں اپنے مُلک کو منتقل کر دیا کرتا تھا لیکن بظاہر وہ یوں دکھائی دیتا جیسے اُس کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ لے رہا ہو۔

آج رجنی نے اُسے جو اطلاع دی تھی وہ واقعی چونکا دینے والی تھی۔ اُس نے بتایا تھا "کہ آج ایک کرنل بڑی اہم اطلاعات لے کر یہاں پہنچا ہے ــــ یہ کرنل پاکستان افواج کے ہیڈ کوارٹر میں انٹیلی جنس سے ڈیل کرتا رہا ہے۔"

"سچ" ــــ؟ خان کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ "سچ" اُس نے ایکٹنگ کرتے ہوئے نہیں ادا کیا تھا۔

"ہاں بھیّا۔ ہم نے اُسے یہاں ایک شاندار بنگلے میں ٹھہرایا ہوا ہے۔" اُس نے خان کو بنگلے کے ایڈریس سے بھی مطلع کر دیا ــــ "اب دیکھنا یہاں موجود پاکستانی ایجنٹ کیسے گرفتار ہوتے ہیں۔ بھیّا ان لوگوں نے تو ہمیں چکرا کر رکھ دیا ہے۔ وہ تم نے آج اخبار دیکھا ہے ناں؟"

"ہاں! ہاں! بھئی مجھے تو ان خرافات میں کوئی دلچسپی نہیں بس تمہاری وجہ سے ایسی خبریں پڑھ لیتا ہوں کہ ہماری بہن بھی کبھی کوئی کارنامہ سرانجام دے دے اور اُس کی تصویر بھی اخبار میں اسی طرح چھپے۔ ورنہ جہنم میں جائے یہ سب کچھ۔ مجھے اِس سے کیا ــــ ہاں آج ایک خبر تو تھی ایسی" ــــ لیکن یہ سالے اخبار والے یونہی بے پَر کی اُڑا دیتے ہیں۔"

"نہیں بھیّا" ــــ رجنی نے اُسے ٹوکا "یہ بالکل سچ ہے اور وہ دونوں باتیں ہی سچ ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ؟" خان نے اُسے یونہی کُریدا۔

"آج اخبار کی یہ خبر ہمارے دفتر میں بحث کا موضوع بنی رہی اور بڑی گرما گرمی بھی ہوئی۔ ایک بڑے آفیسر نے طیش کھا کر بتایا کہ وہ خود اِس کیس کو ڈیل کر رہا ہے۔ تب ہمیں یقین آیا۔"

"اچھا بھئی اگر تم نے بھی ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو مَیں چلا ــــ" خان نے واپس مُڑتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں۔ سوری بھیّا۔ دیکھو ناں ایک تم ہی تو ہو۔ جس سے دِل کی باتیں کر لیتی ہوں اور تو کوئی ایسا ہے نہیں۔"

"ہاں بھئی یہ تو ہے۔ لیکن اب تمہارے لیے "کوئی ایسا" ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ ورنہ اس رفتار سے موٹی ہوتی رہی تو....." خان نے بات نامکمل ہی چھوڑ دی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے بابا۔ ایسی بات نہیں کریں گے۔" رجنی نے اُس کے مُنہ کے سامنے ہاتھ کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

کبھی کبھی تو خان کو رجنی سے مل کر بڑی شدت سے اپنی بہن کی یاد ستانے لگتی تھی۔ وہ سوچتا یہ رشتہ بھی کتنا نازک اور حساس ہے۔ چاہے زبردستی ہی قائم کیا جائے لیکن اپنا تقدس منوا کر رہتا ہے۔

○

موسی اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اُس کی بلائیں لینے کے لیے بے اختیار آگے بڑھی۔ اُس نے خان کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود بھی اُس کے لیے چائے بنا دی۔ دونوں کچھ دیر وہیں رہے پھر رجنی اُس کے ساتھ ہی اُن کے گھر آ گئی۔

"کوئی ڈملا صاحب اب تک تین مرتبہ فون کر چکے ہیں۔" مسز سہائے نے گھر میں داخل ہوتے ہی خان کو چیتاونی "دی۔ ڈملا نام پر وہ چونکا۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

انہوں نے یہ نمبر لکھایا ہے بھیا کہ جب آپ آئیں تو فوراً یہاں فون کر لیں۔" کشور نے ایک پرچی اُس کی طرف بڑھا دی۔

"ارے یار یہ ڈلا صاحب کب میری جان چھوڑے گا۔ ایک تو اس مُلک میں کسی سے ہنس کر بات کر لو وہی گلے لگ جاتا ہے۔ شرکان سے ایک مرتبہ ٹرین میں دوستی ہو گئی تھی۔"

"مَیں تو اسی لیے کسی سے بے تکلف ہی نہیں ہوتا۔" کشور نے فوراً ہی کہہ دیا۔

"یہ تو لوگوں پر احسان ہی کرتے ہو۔" آشا بولے بغیر نہ رہ سکی۔

پھر وہ دونوں آپس میں اُلجھنے لگے اور خان فون کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا پہلی ہی کوشش پر نمبر مل گیا۔ فون کسی مسٹر ڈ ملا نے ہی رسیو کیا تھا۔ اپنی پہچان مکمل کروانے کے بعد اُس نے خان تک تازہ مشن پہنچا دیا:

"کرنل ایکس تھری جنرل ہیڈ کوارٹر سے فرار ہوا ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق مرا نے اُسے کہیں دہلی کے رہائشی علاقے میں ٹھہرایا ہوا ہے۔ یہ شخص گو کہ اپنے ساتھ کاغذات نہیں لے جا سکا لیکن ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو اسے تلاش کر کے ٹھکانے لگا دو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

خان کی راہنمائی کے لیے اُسے دہلی کے دو تین کیمسٹوں کے نام بھی بتا دیئے گئے جن سے وہ کلوروفارم یا زہر وغیرہ بھی حاصل کر سکتا تھا۔ اُسے اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ موت کو زیادہ سے زیادہ قدرتی بنانے کی کوشش کرے۔

"او۔ کے سر۔" کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

رجنی نے اُسے تھوڑی دیر پہلے ہی جو تُرپ کا پتہ دکھایا تھا۔ وہی چال چلنے کا وقت آ گیا تھا۔ خان سمجھتا تھا کہ "ایکس۔ تھری" عہدہ رکھنے والا کرنل کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ شخص دشمن کو پاکستان انٹیلی جنس کے کام کرنے کے بنیادی طریق کار سے

آگاہ کر سکتا تھا۔ اپنے لانچنگ پیڈ دشمن کو بتا سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ دشمن کو پاکستان انٹیلی جنس کے "آبجیکٹس" سے آگاہی بہم پہنچا سکتا تھا۔

"اِسے فوراً ختم ہو جانا چاہیئے۔" خان نے سوچا اور اندر چلا آیا۔

دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کا موڈ نارمل ہو گیا تھا۔ سب لوگوں نے چائے اکٹھے ہی پی اور پھر فلم کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ساڑھے نو بجے فلم ختم ہونے پر وہ سب کے ساتھ گھر واپس آیا۔ روانگی سے پہلے ہی اُس نے اُن لوگوں کو بتا دیا تھا کہ اُسے آج رات ڈ ملا صاحب سے ہوٹل میں ضرور ملنا ہے۔

"مَیں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے مِلنے یہاں آئے۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"بھیا ابھی مل آیئے ناں۔" کشور نے رائے دی۔

"واہ جی واہ۔ اَب ایسا بھی نہیں کہ اُس گدھے کے لیے اپنی فلم کا ستیاناس کر لوں۔"

"ٹھیک ہے بھیا ایک دم شاندار۔" آشا نے نعرہ بُلند کیا تھا۔

○

کھانا اُس نے سب کے ساتھ اکٹھے کھایا۔ پھر اجازت لے کر ڈ ملا سے مِلنے چلا گیا۔ کسی نے اُس سے ہوٹل کا ایڈریس پُوچھنے کی زحمت کی تھی۔ نہ ہی اُس نے کچھ بتایا تھا۔ موٹر سائیکل لے کر وہ سب سے پہلے رات کے پہلے پہر پُرانی دہلی کے ایک محلّے میں پہنچا۔ ٹیلی فون پر اُسے یہاں کے ایک بدمعاش سے ملاقات کا طریقہ سمجھا دیا گیا تھا۔ ایک خاص آدمی کا نام جو اُسے بتایا گیا تھا کہنے پر بدمعاش کے چمچے اُسے اپنے "باس" کے پاس لے گئے تھے۔ خان نے بغیر کچھ کہے سُنے اُس کے سامنے نوٹوں کی گڈی پھینک دی تھی۔

"۳۲ بور کا ریوالور اور گولیاں۔" اُس نے کہا اور خاموش ہو رہا۔

ٹھیک ہے۔ بدمعاش نے پیسے گِننے کے بعد مطمئن ہو کر کہا۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ خان اکیلا وہیں پندرہ بیس منٹ تک بیٹھا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد اُس کی واپسی ہوئی۔ شاید اُس نے سٹاک کہیں دُور رکھا ہوا تھا۔ ریوالور اور ایک چمڑے کی تھیلی میں موجود گولیاں اُس نے خان کے سامنے پھینک دیں۔ خان نے جہاندیدہ نظروں سے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ یہ ریوالور اُس کے مُلک ہی کے "علاقہ غیر" کا بنا ہوا تھا اور سمگل ہو کر یہاں آیا تھا۔

"مَیں اپنا اطمینان کرنا چاہوں گا"۔۔۔ اُس نے بدمعاش کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کر لو۔"

"یہاں؟"۔۔۔

"ہاں"۔۔۔ پھاڑ کھانے والے لہجے میں جواب ملا۔

خان نے ریوالور لوڈ کیا اور کمرے کی کھڑکی سے باہر تین فائر یکے بعد دیگرے کر دیئے۔ مطمئن ہو کر اُس نے پستول دوبارہ لوڈ کرنے کے بعد اُسے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔ گولیوں والی تھیلی اُس نے پھینک دی تھی۔ گولیاں اپنی جیکٹ کی جیبوں میں منتقل کر لیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا۔

موٹر سائیکل اُس نے احتیاطاً یہاں سے ڈیڑھ دو فرلانگ دُور کھڑی کی تھی۔ باہر گلی میں اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ فائرنگ کی آواز پر کوئی اس طرف متوجہ نہیں ہوا تھا شاید یہ شخص پولیس کے تعاون سے اپنا دھندہ چلا رہا تھا۔

اس بات کا اُس نے بطورِ خاص خیال رکھا تھا کہ اُس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ موٹر سائیکل تک وہ محفوظ پہنچ گیا اور تھوڑی دیر بعد اُس کی موٹر سائیکل دہلی کی ایک ماڈرن آبادی کی طرف اُڑی چلی جا رہی تھی۔

اِس ماڈرن کالونی پر سناٹا چھایا ہُوا تھا کہیں کہیں بنگلوں کے برآمدوں میں لگے بلب جل رہے تھے۔ موٹر سائیکل اُس نے کالونی کے باہر بنے ایک سینما کے سٹینڈ پر کھڑی کی تھی۔

فلم کا ابھی ہاف ٹائم ہُوا تھا اور وہ جانتا تھا کہ انگریزی فلم ہاف ٹائم کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔

سینما گھر کی کھڑکی سے اس نے درمیانے درجے کا ایک ٹکٹ بھی خرید لیا تھا لیکن سینما ہال میں داخل ہونے کے بجائے باہر نکل آیا تھا۔ رجنی کا بتایا ہُوا ایڈریس اُس نے اندازے ہی سے قریباً آدھ گھنٹہ کوشش کرنے کے بعد تلاش کیا تھا۔

بنگلے کے دروازے پر لگی نیم پلیٹ روشن تھی اور اُس کے باہر کسی پولیس کے آفیسر کے نام کی تختی سجی تھی۔ خان نے اندازہ کر لیا کہ یہ "را" کا کوئی سیف ہاؤس ہے اور اپنے اصول کے مطابق ان لوگوں نے یہاں کوئی ایسی نشانی نہیں چھوڑی تھی کہ کسی کو اس جگہ پر شک گزرے۔

اَب اُسے اس بات کا اندازہ کرنا تھا کہ اندر کتنے لوگ موجود ہیں۔ بنگلے کے برآمدے والا بلب روشن تھا لیکن خان جانتا تھا کہ ایسے بنگلوں کے برآمدوں کے بلب عام حالات میں روشن ہی رکھے جاتے ہیں۔

چند منٹ تک بنگلے کے سامنے والے چھوٹے سے باغیچے میں چھپا وہ صورتحال کا جائزہ لیتا رہا۔ اُس کے ذہن میں رہ رہ کر مسٹر ڈلا کا یہ فقرہ گونج رہا تھا "کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس کا صفایا کر دیا جائے"۔ اُس شخص کا صبح تک زندہ رہنا بھی اُسے منظور نہیں تھا۔

گو کہ یہ بات اُس کی ٹریننگ کے اصولوں کے خلاف تھی لیکن اُس نے بجائے یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کے کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بارہ بجنے کو آ رہے تھے اور آدھ گھنٹے بعد فلم کا شو ختم ہو جاتا۔ اپنی جگہ سے وہ اُٹھا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر بنگلے کی پشت پر پہنچ گیا۔ بنگلے کی پچھلی دیوار کے پاس رُک کر اُس نے پستول کو جیکٹ کی جیب میں ٹھونسا۔ اپنے چہرے کو ایک بڑے رومال کی مدد سے اچھی طرح ڈھانپا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

ہر طرف سکوت طاری تھا ——!

پانی کے پائپ کے ذریعے اُس نے بنگلے کی چھت پر پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب اُسی طرف بڑھ رہا تھا۔ پائپ پر دونوں ہاتھ جما کر اُس نے ایک نظر اُوپر دوڑائی۔

اُس کی خوش قسمتی کہ بنگلہ جدید طرز کا اور ایک منزلہ ہی تھا۔ بمشکل تین چار منٹ بعد وہ چھت پر موجود تھا۔ چھت پر بیٹھ کر اُس نے پہلے تو اپنے دل کی دھڑکن کو نارمل کیا پھر جیب میں موجود پستول کو تھپتھپا کر اُن سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا جو نیچے اُتر رہی تھیں۔

اگلے ہی لمحے وہ سیڑھیوں پر سانپ کی طرح رینگتا ہوا نیچے اُتر رہا تھا۔ سیڑھیوں کا خاتمہ نیچے برآمدے میں ہُوا۔ اُس کے سامنے تین کمرے تھے جن میں سے صرف ایک میں معمولی روشنی تھی۔ برآمدے کے بالکل سامنے مین گیٹ کے ساتھ ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ یہاں کسی محافظ کی موجودگی کی چغلی کھا رہا تھا۔ اُس نے پہلے اس سے نمٹنا مناسب سمجھا اور اُس کی طرف بڑھنے لگا۔

+ Salma

باغ کی روش کے ساتھ ساتھ چلتا وہ اس پوسٹ تک پہنچ گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کسی کی موجودگی کا احساس اُسے بہرحال تھا۔ شاید اندر موجود شخص نے سردی کی شدت کی وجہ سے دروازہ بند کر رکھا تھا حالانکہ اُسے اُصولاً گیٹ پر موجود ہونا چاہیئے تھا۔

اُس نے کچھ سوچ کر آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور خود ریوالور تھام کر دروازے کے ایک طرف دیوار سے پُشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے دستک دینے پر اندر موجود شخص اُس کے اندازے کے عین مطابق بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر ہی نکلا تھا۔ جیسے ہی اُس نے پہلا پاؤں باہر نکالا خان کا ہاتھ چلا اور ریوالور کا زوردار دستہ اُس کے سر پر لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہو، خان نے بڑی پھرتی سے اُسے اپنے مضبوط بازو پر تھام لیا۔ اندر داخل ہو کر اُس نے بے ہوش شکار کو چارپائی پر پھینکا اور چارپائی ہی کی رسّی سے اُس کی مُشکیں کس دیں۔ اپنی جیب میں رکھے ٹیپ رول کی مدد سے خان نے اُس کا مُنہ اِس طرح بند کر دیا تھا کہ اُس کے لیے چلّانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اِس طرف سے نمٹ کر اُس نے دروازہ اُسی طرح بند کر دیا اور برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔

○

چند سیکنڈ میں وہ برآمدے کے اُس کمرے تک پہنچ چُکا تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ اُس کا دِل گواہی دے رہا تھا کہ یہاں اور کوئی محافظ موجود نہیں ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتا ہُوا وہ کمرے کے دروازے کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑا تھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ دروازہ کُھلا ہے یا بند۔ اُس نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا تو ہینڈل پورا گھوم گیا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ دروازہ کُھلا ہے۔ شاید اندر موجود غدّار کرنل نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ اَب بالکل محفوظ ہے۔

اپنے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھامتے ہُوئے اُس نے ہینڈل کھول کر دروازے کو جھٹکے سے کھولا۔ سامنے ایک آرام دہ کُرسی کے نزدیک رکھی میز پر ایک ٹھُنگنے سے غدّار دوہرے وجود کا آدمی کاغذ اور قلم رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ خان کو اچانک دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گیا۔

"ہینڈز اَپ" —— عابد خان نے سسکاری لی اور کرنل نہ صرف خود اُٹھ کر کھڑا ہو گیا بلکہ اُس کے دونوں ہاتھ بھی کسی میکانکی عمل کے تحت اُٹھتے چلے گئے۔ خان نے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ کاغذات اُٹھا لیے اور اُن پر ایک نظر ڈالتے ہُوئے دوبارہ وہاں پھینک دیئے۔ کرنل اپنی یادداشت کے سہارے پاکستان انٹیلی جنس سے متعلق معلومات اِن کاغذات پر اپنے نئے مالکوں کے لیے مُنتقل کر رہا تھا اور ایک فائل الگ سے اُس کے سامنے دھری تھی۔

"غدّار، بے غیرت، لعنت ہے تمہارے مسلمان ہونے پر۔ تم اپنے مسلمان بھائیوں کو اِن ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر رہے تھے۔"

Scanned by azam@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

"مم مم میں مجبور ہوں ——" وہ گھگھیایا —— "میں اُن لوگوں کے جال میں پھنس چکا ہوں۔"

"اب تک اُنہیں کیا کچھ بتا چکے ہو ——؟" خان دھاڑا۔

"کک کک کچھ بھی نہیں۔ یہی کچھ لکھ کر دینا تھا۔"

"تم تو یہی سمجھتے ہو گے کہ پاکستان چھوٹا سا ملک ہے بھارت کے مقابلے میں اور تم جیسے غداروں کا تعاون بھی دشمن کو حاصل ہے، اس لیے ہم ختم ہو جائیں گے ——" خان کے لیے اپنی نفرت اور غصے پر قابو پانا ناممکن ہو رہا تھا۔

کرنل جواب میں خاموش رہا —— !! خوف سے اُس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ موت کے سائے ابھی سے اُس کی آنکھوں میں لہرانے لگے تھے۔

ضمیر فروش انسان تُو یہ کیوں بھول گیا کہ خدا اپنے باغیوں پر یہ زمین تنگ کر دیتا ہے۔ میں پاکستان انٹیلی جنس کی طرف سے تیرے لیے خدا کا عذاب بن کر آیا ہوں۔ تو بدنصیب ہے تو —— ساری زندگی تُو نے پاکستان کی خدمت کی اور جب مرنے کا وقت آیا ہے تو تیرا شمار کافروں کے ساتھیوں میں ہونے والا ہے۔ کاش تیری یہ حالت دیکھنے کے لیے تیرا کوئی اپنا مالک یہاں موجود ہوتا۔"

"کک کک کیا مطلب —— دیکھو تم مجھے مار نہیں سکتے۔" موت کے ذکر نے اُسے بوکھلا دیا تھا۔

"بے وقوف انسان کسی کو مارنا یا زندہ رکھنا خدا کے اختیار میں ہے۔ میں اگر دیوار کے گڑھ میں داخل ہو کر تم تک پہنچ سکتا ہوں تو تمہیں سزا کیوں نہیں دے سکتا؟" خان نے کہا اور اُس کے ساتھ ہی اُسے وقت گزرنے کا احساس ہوا۔

"اپنا مُنہ دیوار کی طرف کر لو ——" اُس نے کرنل کو حکم دیا۔

"مم مم مجھے معاف کر دو —— خدا....."

"خبردار اگر ناپاک زبان سے خدا کا نام نکالا" —— خان نے تڑپ کر کہا۔ "تم خدا کے دھتکارے ہوئے انسان ہو۔ تم نے کفرانِ نعمت کیا ہے —— اپنے مسلمان بھائیوں کو دھوکا دیا ہے۔ اُن کو جو اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر تمہیں پال رہے تھے۔ تم نے ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچا اور دشمن کی چال میں آ کر اُنہی کو ختم کرنے پر تُل گئے۔"

"مجھے احساس ہے.....؟"

"شٹ اپ —— مُنہ دیوار کی طرف کرو۔" اُس کے لہجے میں نجانے کیا قہر چھپا تھا کہ کرنل گھبرا کر دوسری جانب گھوم گیا۔

خان پھرتی سے ایک قدم آگے بڑھا اور اُس کا بایاں ہاتھ ایک خاص پوزیشن بناتا ہوا کرنل کی گردن پہ ایک مخصوص جگہ ٹکرایا۔ مُنہ سے کوئی آواز نکالے بغیر دوہرے بدن کا غدار ننگا لی چپ چاپ زمین بوس ہو گیا —— امکانات میں شامل وہ بات کہ اُس کی موت زیادہ سے زیادہ نیچرل نظر آئے، جانے اُس کے لاشعور کے کس گوشے میں دفن ہو چکی تھی۔

چودہ سو سال کے شہدا باری باری اُس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے اُس کا ذہن اپنے ٹریننگ کلاس روم میں پہنچ چکا تھا۔ یورپ، افریقہ، بلادِ عرب اور ہندوستان کہاں کہاں ان غداروں نے شہدا کی اُن قربانیوں پر پانی نہیں پھیرا تھا؛ اُسے یاد آ گیا کہ سراج الدولہ کو انہی سانپوں نے ڈسا تھا، شیرِ میسور انہی ننگِ ملت ننگِ وطن فروشوں کی بدبختیوں کا شکار ہوا تھا —— اُس کا دل پکار رہا تھا: "اُس کے اسلاف کی قربانیاں ضائع کرنے والے یہی غدار ہیں۔"

یہ کرنل پاکستان کا نہیں تاریخ کا مجرم تھا —— !

اُس نے سوچا اس کی موت ایسی ہو کہ دوسرے نصیحت اختیار کریں اور اس کے ورغلانے والوں کو بھی علم ہو جائے کہ اب مسلمان ان ننگِ ملت غداروں کو سزا بھی

Scanned by aazzamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

دے سکتے ہیں۔" نہیں کرنل۔ میں اتنی بے بسی سے اپنے پورے پاکستان کو مرنے نہیں دوں گا"۔۔۔ وہ بڑبڑایا اور اُس نے تمام کاغذات اکٹھے کر کے سامنے والی کھڑکی کے ساتھ لٹکتے پردے کے نیچے ڈھیر لگا دیئے۔ فائل الگ کرنا وہ نہیں بھولا تھا جو اُس کے جسم کا حصہ بن چکی تھی۔ پھر کرنل ہی کے سگریٹ لائیٹر سے اُس نے ان کاغذات کو آگ لگا دی۔

جب تک پردوں نے آگ نہ پکڑی وہ وہیں کھڑا رہا۔ میز پہ رکھی کمرے کی چابی اُس نے اُٹھا لی تھی۔ اب اُس نے میز کو آگ کے شعلوں کے نزدیک کر دیا تھا۔ آبنوسی لکڑی کی میز نے فوراً آگ پکڑ لی۔ پھر وہ کمرے میں موجود تمام فرنیچر کو دیوانہ وار آگ میں جھونکتا چلا گیا۔ دھوئیں سے کمرہ بھرنے لگا تھا۔ جب وہ باہر نکل آیا۔ اُس نے کمرے کو باہر سے لاک کر دیا تھا۔

اور اب وہ اُسی راستے سے واپس جا رہا تھا جس سے یہاں اندر داخل ہوا تھا۔

○

واپسی کا سفر اُس نے دیوانہ وار بھاگتے ہوئے طے کیا تھا۔۔۔ سینما کے باہر ہی رُک کر اُس نے ایک پان سگریٹ کی دُکان سے پان خریدا اور مُنہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ سینما ہال کے دروازے اب کھلنے لگے تھے۔ آخری شو ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے کچھ لوگوں کے باہر نکلنے کا انتظار کیا۔ جب سائیکل سٹینڈ پر خاصا جمگھٹا لگ گیا تو اُس نے بھی اپنی موٹر سائیکل باہر نکالی اور گھر کی طرف چل دیا۔

گھر واپس جاتے ہوئے اُس نے جان بوجھ کر وہی راستہ اختیار کیا تھا جو ماڈرن کالونی سے گزر کر جاتا تھا۔ بنگلے کے باہر لوگ اکٹھے ہو کر شور مچا رہے تھے اور شعلے آسمان کو چھونے لگے تھے۔ سارا بنگلہ آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

ایک پھیکی سی مسکراہٹ خود بخود اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اُسے بالکل ایسا ہی احساس ہوا تھا جیسا کسی مزدور کو دن بھر کی مزدوری کے بعد ملنے والا انعام حاصل

کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ کچھ اور موٹر سائیکل سوار بھی وہاں رک رک کے آگ کا نظارہ کرنے لگے تھے۔ چند لمحوں کے لیے وہ بھی وہاں ٹھہر گیا۔

دُور سے فائر بریگیڈ کی گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کی جیپوں کے مخصوص ہارن سنائی دے رہے تھے۔ اُس نے اب وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ باقی لوگ بھی کسی ممکنہ گواہی کے خوف سے وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے تھے۔

پان چباتا ہوا وہ اپنے گھر کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا۔ سردی خاصی زیادہ تھی لیکن اُسے کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ گھر کے باہر اُس نے موٹر سائیکل بند کر دی۔ باہر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ خان نے گھنٹی بجانے کے بجائے اُسے خود کھولنا زیادہ مناسب جانا۔۔۔

دروازے کو پھلانگ کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ اُس نے کُنڈی بغیر آواز پیدا کیے کھولی۔۔۔ موٹر سائیکل اندر دھکیلی، اور پھر دوبارہ کُنڈی لگا دی۔ گھر کے قریباً سبھی لوگ اُس کا انتظار کرنے کے بعد سو گئے تھے۔ خان نے کسی کو جگانے کے بجائے موٹر سائیکل اندر کھڑی کر دی اور اپنے کمرے تک بھی بغیر آہٹ پیدا کیے چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنی چارپائی پر لمبی تان کر سو رہا تھا۔

○

صبح وہ حسبِ معمول بیدار ہوا تھا۔ اُس نے بروقت غُسل کیا اور گھر والوں کے ساتھ پاٹھ میں بھی شرکت کی۔ ہندو گھرانوں کی روایت کے مطابق سب لوگ مل کر پاٹھ کر رہے تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی اس میں شریک ہو جایا کرتا تھا۔

پاٹھ سے فراغت پر وہ معمول کے مطابق اخبار کا مطالعہ کرنے لگا: اخبار کے پہلے ہی صفحے پر دہلی کی اُس ماڈرن کالونی کے ایک بنگلے میں پُراسرار آگ لگنے کا واقعہ

Scanned by aazamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

بڑے سنسنی خیز انداز میں رپورٹ کیا گیا تھا یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہاں سے ایک جلی ہوئی لاش بھی برآمد ہوئی ہے اور بنگلے کا بے ہوش چوکیدار بھی جو زخمی تھا۔

اخبار نے اس واردات کے متعلق اپنے اندازے قائم کیے تھے اور اس کے پیچھے کسی گہری سازش کا رونا بھی رویا تھا ـــــ مسکراتے ہوئے اُس نے اخبار وہیں رکھ دیا اور ناشتے کی میز پر آگیا۔

آج بلاقی رام نے اُن کے ہاں دعوت پر آنا تھا۔ سہائے نے ناشتے کی میز پر ہی اُس کی آمد اور پروگرام سے متعلق مشورے شروع کر دیئے تھے۔ رُما نے کالج سے ـــــ چھٹی کر لی تھی کیونکہ گھر میں کام بہت تھا۔ کشور اور آشا نے اس سلسلے میں کسی بھی بوریت کا سامنا کرنے سے کالج چلے جانا بہتر سمجھا تھا۔

دوپہر تک بلاقی رام اور اُس کے گھر والوں کی آمد تک سب ہی لوگ کام میں جُتے رہے۔ بلاقی رام دوپہر سے کچھ دیر پہلے اپنے پریوار سمیت ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں آگیا تھا۔ اُس نے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے اور اپنے ساتوں بچوں کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ صوبیدار بلاقی رام کی پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ تین لڑکیاں بڑی تھیں اور دو چھوٹی۔ تینوں نے میک اَپ میں ایک دوسرے کو مات دی ہوئی تھی اور بالکل ایک دوسری کی ہم عمر دکھائی دیتی تھیں۔ اُنہیں جب بھی موقع ملتا، خان سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کہہ دیتیں۔ رُما نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی تھی کہ تینوں ہی خان پر لٹو ہو گئی تھیں وہ اِن تینوں لڑکیوں اور خان کی بوکھلاہٹ سے بیک وقت لُطف اندوز ہو رہی تھی۔

بلاقی رام کے بچوں نے وہ اُدھم مچائی تھی کہ خدا کی پناہ۔ کشور اور آشا بھی کالج سے واپس آچکے تھے اور دونوں خاصے زچ دکھائی دے رہے تھے۔ کشور تو بطورِ احتجاج گھر سے باہر ہی چلا گیا تھا۔

خان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بلاقی رام کی لڑکیوں سے جان چھڑانا تھا جو اس کے گلے کا ہار بن رہی تھیں ـــــ وہ دل ہی دل میں خدا سے دُعا مانگ رہا تھا کہ اس کی روانگی کا کوئی بہانہ بن جائے۔ رُما سے اُس نے متعدد مرتبہ اس مصیبت سے چھٹکارے کی درخواست کی تھی لیکن وہ سوائے ہنسنے کے اور کچھ نہ کر سکی۔

بلاقی رام کی زبان مسلسل چل رہی تھی اور وہ بے تحاشہ کھاتے کھاتے اپنی بہادری کے جعلی واقعات بھی سُنا رہا تھا۔ پھر موضوعِ گفتگو پاکستانی جاسوس بن گئے۔ ظاہر ہے یوں بھی پاکستانی کمانڈوز اور جاسوس ہر بھارتی کے حواس پر سوار کر دیئے تھے اور خان نے اندازہ لگایا تھا کہ زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ان کے ذکر سے محفوظ رہا ہو۔

بلاقی رام بڑے فخر سے مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا اُن لوگوں کو بتا رہا تھا کہ کس طرح بھارتی فوج بنگالی غداروں اور مقامی بدمعاشوں اور فوجیوں پر مشتمل ایک فوج "مکتی باہنی" کے نام سے تیار کر رہی ہے جو مشرقی پاکستان میں سرگرمِ عمل ہے۔ اس نے بتایا کہ جلد ہی ان لوگوں کی کارروائیاں دُنیا کے سامنے آنے لگیں گی اور یہ سب مل کر "بنگلہ دیش" بنا ڈالیں گے۔

پاکستانی کمانڈوز کے ذکر کے بعد وہ اپنی بے ایمانی کے کارنامے سنانے ہی لگا تھا کہ عین ان لمحات میں جب بوریت سے خان کا سر دُکھنے لگا تھا۔ رُما نے اُسے رجنی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ خدا کا شکر گزار ہوتا اُٹھ کر فون والے کمرے میں آگیا۔ رجنی نے اُسے اطلاع دی تھی کہ پانچ بجے اُسے چھٹی ملے گی۔ خان اُسے آکر لے جائے۔ وہ اب کس کو ہر بات بتانا اپنا فرض خیال کرنے لگی تھی۔

چار بج رہے تھے جب خان نے بلاقی رام اور اُس کے پریوار سے ضروری کام کا بہانہ کر کے معذرت کر دی۔ روانگی سے پہلے اُس نے مسٹر سہائے کو ایک طرف لے جا کر

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

ہدایت کی تھی کہ وہ بچّوں کی مٹھائی کے بہانے روانگی کے وقت سو روپیہ دے دیں۔ اور

"میں ایسا بچّہ بھی نہیں ہوں کہ یہ بات نہ سمجھ سکوں۔" انہوں نے خان سے کہا اور ہنس دیئے

رجنی کے دفتر کے اندر جانا آج نجانے کیوں اُس نے مناسب نہ سمجھا اور مین گیٹ ہی سے اُسے فون پر اپنی آمد کی اطلاع کر دی۔ وہ یہاں تک رکشہ پر آیا تھا اور اب اُس نے رکشہ والے کو رخصت کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُسے رجنی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ خان جان بوجھ کر دروازے سے کچھ دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔

"غضب ہو گیا بھیّا" ـــــ رجنی نے اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی دُہائی دی۔

"ٹھہرو ٹھہرو" ـــــ اُس نے رجنی کے مُنہ کے سامنے ہاتھ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر کوئی بڑی خبر ہے تو مجھے نہ سنانا۔ مَیں پہلے ہی بہت بور ہو چکا ہوں۔ آج وہ کمبخت صوبے دار اپنے پریوار سمیت دعوت پر آیا ہوا تھا۔"

"اوہو! بھیّا" ـــــ رجنی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا ـــــ "ایک تو تم بات ٹپّو ہی توڑ دیتے ہو۔ معلوم ہے مَیں کیا بتانے والی تھی۔"

"معلوم ہے؟"

"کیا؟"

"اسے یہی کہو گی کہ کوئی بنگالی جنرل بھاگ کر آیا ہے یا کسی پاکستانی جاسوس نے کوئی ریلوے لائین اُڑا دی ہے۔ ایک تو تمہارے سر پہ یہ ہر وقت جو نوکری سوار رہتی ہے۔ اِس سے مَیں بڑا تنگ آ گیا ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں" ـــــ رجنی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا ـــــ "وہ جو مَیں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ ایک بنگالی کرنل بھاگ کر آ گیا ہے ـــــ اُسے پاکستانی انٹیلی جنس نے یہاں قتل کروا دیا ہے۔"

"ہیں" ـــــ اِس مرتبہ خان نے واقعی بوکھلا جانے والی ایکٹنگ کی تھی۔ "لیکن اتنی بڑی خبر اخبار میں تو چھپی نہیں۔"

"چھپی ہے ـــــ اور آپ نے پڑھی بھی ہے" ـــــ رجنی نے کہا۔

"کمال ہے بھئی نہ تو میرا حافظہ اتنا کمزور ہوا ہے اور نہ ہی میری نظر۔"

"بات یہ ہے بھیّا کہ ایسی خبریں بظاہر کسی کو نظر نہیں آتیں۔ تم نے آج اخبار میں ماڈرن کالونی کے ایک بنگلے میں آگ لگنے کی خبر تو پڑھی ہے نا؟"

"ہاں! ہاں!! وہ تو پڑھی ہے۔"

"اسی میں تو جل کر مرا ہے یہ کرنل" ـــــ رجنی نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

جواب میں خان نے بڑا زوردار قہقہہ لگایا ـــــ "ایک تو تم لوگ ہر بات میں بات نکال لیتے ہو ـــــ یہ بال کی کھال نکالنے والی عادت کچھ اچھی نہیں۔ بنگلے میں کسی وجہ سے آگ لگ گئی اور تم نے سمجھ لیا کہ اُسے قتل کیا گیا ہے۔" خان نے بڑے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بھیّا ایک تو تمہاری یہ عادت مجھے بہت بُری لگتی ہے۔ میری ہر بات پر تنقید شروع کر دیتے ہو۔"

"اوہ سوری" ـــــ خان نے یکدم سنجیدہ ہونے کی اداکاری کر کے رجنی کو بوکھلا ہی تو دیا تھا۔ "دیکھو رجنی کیا ہُوا جو ہمارا کوئی خون کا رشتہ نہیں، لیکن کبھی کبھی میرا من کہتا ہے ضرور کسی پچھلے جنم میں ہم بہن بھائی بچھڑ گئے ہیں۔ مَیں تمہیں دُکھی کرنے کا تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا ـــــ میری کسی بات کا بُرا مت مانا کرو ـــــ یہ میرا سٹائل ہے۔"

رجنی نے بیقرار ہو کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ارے نہیں بھیّا! اگر مَیں کبھی بے تکلفی پر اُتر آؤں تو تم سیریس نہ ہو جایا کرو۔ یہ تو مَیں یونہی کہہ دیتی ہوں ـــــ اگر تم سے

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

نہ کہوں تو کس سے کہوں ؟"

"اچھا چلو کچھ پیتے ہیں" ـــــ خان نے ایک سنیک بار نزدیک آنے پر کہا۔

"اے ـــــ" رجنی نے بظاہر اُس کا موڈ نارمل کرنے کے لیے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لوفروں کے سے انداز میں سیٹی بجائی ـــــ "بیا ناراض کاہے کو ہوتا ہے آدُناں" ـــــ اُس نے اپنا لہجہ بگاڑ کر کہا اور خان کے بازو میں بازو ڈال کر سنیک بار کی طرف چلنے لگی۔ یہ سب کچھ اُس نے اتنی بے تکلفی سے کیا کہ وہاں سے گزرنے والے راہگیر دونوں کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔

"کچھ خیال کرو ان لوگوں کا" ـــــ خان نے اُسے ٹہوکا دیا۔

"جلتے ہیں سالے ـــــ جلنے دو ناں" ـــــ رجنی نے بڑے فلمی انداز میں کہا اور اسی پوزیشن میں سنیک بار کے دروازے تک چلی آئی۔

دونوں ایک خالی میز پر جم گئے۔ ایک مودب بیرا اُن کے نزدیک آن کھڑا ہو گیا۔

"میرے لیے کافی ـــــ اور صاحب جو پسند فرمائیں" اُس نے بیرے سے کہا۔

"میرے لیے بھی کافی" ـــــ خان نے بیرے سے کہا اور خاموشی سے رجنی کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کی آنکھوں میں ابھی تک شرارت ناچ رہی تھی۔

"بھیّا ایک بات بتاؤ گے ؟"

"جی"

"تم واقعی میری بات کا غصّہ کرتے ہو ـــــ ؟"

"سچ کہہ دوں"

"ہاں"

"نہیں ـــــ دیکھو رجنی آئندہ مجھ سے یہ سوال بھی کبھی نہ کرنا۔ میں تمہارے متعلق کیا سوچتا ہوں۔ تمہارے لیے کیا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بھگوان ہی جان سکتا ہے"

"میں جانتی ہوں۔ میرا من کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کوئی طاقت مجھے تمہارے ملنے کے بعد سے احساس دلانے لگی ہے جیسے میری کوئی بہت بڑی کمی پوری ہو گئی ہو"

خان چُپ رہا۔

"خیر یہ بات تو پوری سُننا ہی پڑے گی" رجنی نے پھر اُسے چھیڑا۔

"اچھا بیا سنا دو لیکن اس ہوٹل سے باہر نہیں"

"بھیّا ہماری اطلاع کے مطابق پہلے کرنل کی گردن کی ہڈی توڑی گئی اور دروازے پر موجود گارڈ بھی زخمی تھا۔ کسی نے اُس پر اچانک ہی حملہ کیا تھا ـــــ اُس کے بعد اُسے ہوش نہیں رہا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی ملا تھا"

"بھئی اس کا مطلب تو یہی ہے کہ یہ لوگ بہت تیز ہیں" خان نے یہ بات بالکل اسی طرح کہہ دی تھی جیسے اُس کی گفتگو بہت سنجیدگی سے سُن رہا ہو۔

"یہی تو میں کہتی ہوں کہ ہمیں اپنے دشمن کو کمزور نہیں جاننا چاہیئے، لیکن میرا باس نہیں سُنتا۔ گدھا کہیں کا۔ کسی روز دیکھ لینا یہ لوگ ہمارا ہیڈ کوارٹر بھی آکر اُڑا جائیں گے"

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ تم اُنہیں اپنے ذہن پر ہی سوار کر لو۔ اگر تمہارے افسر نالائق ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاکستانی بہت بہادر لوگ ہیں۔ بھئی ایسا تو ہوتا ہی ہے" اُس نے رجنی سے کہا۔

دونوں بہن بھائی اب باہر نکل آئے تھے۔ خان اُسے زبردستی ایک نزدیکی مارکیٹ میں لے گیا تھا۔ اُس نے رجنی کو "نہ نہ" کرنے کے باوجود دو تین ساڑھیاں خرید کر دی تھیں اور موسی جی کے لیے الگ سے ساڑھی لینا بھی نہیں بھولا تھا۔ دونوں مارکیٹ کے باہر کسی رکشہ کے انتظار میں کھڑے تھے جب اُن کی پشت پر کسی نے رجنی کو "رجنی جی"

Scanned by aazzamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

کہہ کر پکارا۔ خان رجنی کے ساتھ ہی چونکا اور ایکدم پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ اُس کے سامنے کھلتے ہوئے رنگ کا ایک نوجوان جس کی شکل سے ذہانت اور شرافت ٹپک رہی تھی بڑا مودب کھڑا تھا۔

"ہیلو احمد کیسے ہو؟" ——

"جی ٹھیک ہوں" —— اُس نے خان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے بھیّا ہیں ارون کمار، اور آپ ہیں احمد کمال بیگ میرے کالج کے ساتھی ہیں۔" رجنی نے دونوں کا تعارف کرایا۔

رجنی بہت بیباک لڑکی تھی۔ "را" کی تربیت نے گو کہ اُسے بے حیا بنانے کی بھی مقدور بھر کوشش کی تھی لیکن ابھی تک اُس کی گھٹی میں موجود نسوانیت اور شرافت کا مکمل جنازہ نہیں نکلا تھا۔ وہ بہت زیادہ "بے تکلف" اور "بے جھجک" ضرور ہو گئی تھی لیکن اُس میں ابھی تک مشرقی عورت کی روایتی شرم و حیا باقی تھی۔ خان نے محسوس کیا تھا کہ احمد کمال بیگ سے اُس کا تعارف کرواتے وقت رجنی بالکل ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اُس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"آیئے ایک کپ چائے پی لیں" —— خان نے اُسے تعارف اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھنے کے بعد دعوت دی۔

"جی" —— وہ کچھ جھجک محسوس کر رہا تھا۔ شاید رجنی کی بھی یہی حالت تھی ——

"پھر کبھی سہی۔"

"ارے پھر کیوں بھائی۔ آؤ بھی۔"

خان واپس اُسی سنیک بار کی طرف مڑ گیا۔ اُس نے جان بوجھ کر دونوں کو اپنے پیچھے آنے اور آپس میں گفتگو کرنے کا موقع دیا تھا۔ دوبارہ وہ اُسی میز پر آ کر بیٹھ گئے جس سے ابھی ابھی اُٹھ کر گئے تھے۔

"کیا کام کرتے ہیں آپ"؟ ——

"میں نے ایم۔ اے کیا ہے اور اب والد صاحب کا بزنس سنبھال رہا ہوں۔"

"کوئی نوکری کر لیتے" —— خان نے اُسے چھیڑا۔

"یہ نوکری نہیں کر سکتے۔ مُغل بادشاہوں کی اولاد ہیں نال" —— رجنی نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ماحول کو ذرا خوشگوار بنانا چاہا۔

"آپ تو جانتے ہی ہیں کمار جی! نوکری اوّل تو ملتی نہیں۔ اگر مل بھی جائے تو اتنی تنخواہ میں گزارہ ہی نہیں۔ پھر میرے سوا ابا جان کا اور ہے بھی کون۔ اللہ کا شکر ہے اچھا بھلا بزنس ہے وہی سنبھال لوں گا۔" کمال بیگ نے جواب دیا۔

چائے پیتے ہوئے خان اُس سے زبردستی بے تکلف ہو گیا تھا اور وہاں سے اُٹھنے سے پہلے وہ اِن دونوں کے متعلق ایک اندازہ قائم کر چکا تھا وہ جان گیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ ہے کہ جسے پاٹنا دونوں ہی کے لیے ممکن نہیں۔ بھارت میں متضاد مذاہب کے لڑکے لڑکیاں آپس میں شادیاں تو ضرور کر لیتے تھے لیکن اِس کی اُنہیں بہت زیادہ قیمت بھی ادا کرنی پڑتی تھی۔

یہاں تو معاملہ اور بھی سنگین تھا۔ رجنی نہ صرف ہندو لڑکی تھی بلکہ بھارت کی اعلیٰ ترین انٹیلی جنس "را" میں بھی زیرِ تربیت تھی اور اب اُس کے لیے اپنی مرضی سے زندہ رہنے کے مواقع بہت کم تھے۔ جس سادگی اور خلوص سے رجنی اُسے بھائی کے ناطے لوٹ کر چاہنے لگی تھی اِس کے بعد خان کے لیے اُسے اِس طرح بے سہارا چھوڑ دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ اُس کے بزنس کا حصّہ نہیں تھا، لیکن وہ دُنیا کی دوسری انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرح کوئی پیشہ ور جاسوس تو نہ تھا۔ وہ ایک نظریاتی مملکت کا اور مخصوص نظریات کا حامل مسلمان لڑکا تھا۔ جس

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

کے لیے انسانی معاملات سے بالکل کٹ کر صرف دوسرے کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اِس مُلاقات نے اُسے خاصا بوجھل کر دیا تھا۔!!

احمد کمال بیگ دونوں کو ٹیکسی تک چھوڑنے آیا تھا۔ دونوں گھر پہنچنے تک خاموش رہے تھے۔ ٹیکسی خان نے جان بوجھ کر گھر سے کچھ دُور ہی چھوڑ دی تھی۔ رجنی بھی سمجھ گئی کہ وہ اُس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ دونوں خاموش چند قدم چلتے رہے پھر رجنی رُک گئی۔

"ناراض ہیں آپ؟" اُس نے خان سے نظریں ملائے بغیر پُوچھا۔

"ہاں ـــــ لیکن ہاں اِس بات پر نہیں جو تم سمجھ رہی ہو، بلکہ اِس پر کہ تم مجھے بھی عام قسم کا متعصب ہندو جان لیا ـــــ" خان نے شکایت بھرے لہجے میں

"بھیّا" رجنی نے شدتِ جذبات سے بے قابو ہو کر کہا۔ اُسے اپنے کانوں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں رجنی! مَیں سچ کہہ رہا ہوں۔ مَیں تمہارا بھائیوں جیسا دوست اور دوستوں جیسا بھائی ہوں۔ مجھ سے تمہیں کچھ نہیں چھپانا چاہیئے ـــــ محبت کرنے والے بہت بہادر ہوتے ہیں رجنی، اور محبت اِن تمام قباحتوں سے بہت ارفع واعلیٰ قسم کا کوئی جذبہ ہے۔ یہ مذہب کی تہمید سے آزاد ہے رجنی ـــــ بالکل آزاد۔"

"بھیّا ـــــ رجنی نے شدّت جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا سر اُس کے سینے سے لگا دیا۔ خان نے محسوس کیا جیسے وہ رو رہی تھی۔

"حوصلہ کرو پگل۔ میرے جیتے جی تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہونی چاہیئے۔ تمہارے لیے وہ سب کچھ کر گزروں گا جو میرے اختیار میں ہے۔" خان نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

خان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی موسی جی کی باچھیں کھِل گئیں۔ وہ حسبِ سابق بے اختیار اُس کی بلائیں لینے کے لیے آگے بڑھی۔ خان وقتاً فوقتاً اُس کے لیے کچھ لے آتا تھا۔ تھوڑی دیر تک اپنی "موسی جی" کے پاس بیٹھ کر وہ واپس چلا آیا۔

○

گھر پہنچا تو بلاتی رام اپنی فیملی سمیت رُخصت ہو چکا تھا۔ خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رات گئے تک آشا اور کشور، بلاتی رام کی بیٹیوں کا نام لے لے کر اُسے چھیڑتے رہے اور وہ اُن کے ساتھ ساتھ ہنستا رہا۔ بلاتی رام نے روانگی سے پہلے سہائے کی مہمان نوازی کا خصوصی شکریہ ادا کیا تھا اور سہائے کو اگلے بڑے آرڈر کی خوشخبری بھی سُنا دی تھی۔

کرنل ایکس کی موت کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا ـــــ بھارتی انٹیلی جنس کے لیے! وہ لوگ ہل کر ہی تو رہ گئے تھے۔ خان نے پے در پے اُن پر بہت سی چوٹیں کر دی تھیں۔ اور اُنہیں اِس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ پاکستان کا کوئی بہت ہی ذہین ایجنٹ اُن میں آن گھسا ہے۔ اِس بات کا احساس خان کو بھی بخوبی تھا اور اُس کے افسران کو بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن لوگوں نے خان کو فی الحال پردہ سکرین سے ہٹا لیا تھا۔

ـــــ اور اُس نے دو ماہ کا یہ صبر آزما عرصہ بڑی خاموشی سے گزارا۔ اِس دوران بس وہ معمول کی معلومات بلاتی رام اور رجنی کے ذریعے حاصل کرتا رہا۔

اِن دو مہینوں میں اُس نے ایک کام ضرور کیا تھا کہ رجنی اور احمد کمال بیگ دونوں کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا "کہ دُنیا کی کوئی طاقت اگر اُن کا جذبہ سچا ہے تو اُنہیں آپس میں جُدا نہیں کر سکتی" ـــــ اور اس کام میں اُس کی سب سے زیادہ مدد کی تھی رُما نے ـــــ خان پہلے تو رُما سے یہ بات کرتے ہوئے بھی جھجکتا تھا، لیکن ایک روز اُس نے پہلے تو بین السطور میں بات کر کے اُس کی رائے معلوم کی پھر رُما کو اصلیت بتا ہی دی۔ وہ حیران ہی تو رہ گیا جب رُما نے بڑی گرمجوشی سے اُن دونوں

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

کے لیے نیک جذبات کا اظہار کیا۔

"اُس موٹی نے آج تک مجھے بھی اِس بات کی ہَوا نہیں لگنے دی۔ کوئی بات نہیں، پوچھ لوں گی اُس سے" ـــــ اُس نے گلہ کیا تھا۔

احمد کمال بیگ کا والد اس حد تک تیار تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے یہاں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھارت کے کسی بھی دوسرے صوبے میں بسنے کے لیے تیار تھا ـــ اُس نے اُن لوگوں کو یہاں تک کہہ دیا: کہ اگر ضرورت پیش آئی تو وہ دونوں کو مُلک سے باہر بھیج دے گا۔" اَب مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ رجنی کی ماں سے بات کرنے کا اور ـــ اِس کے لیے خان کسی اچھے موقعے کی تلاش میں تھا۔

○

حالات ہر روز نیا رُخ اختیار کر رہے تھے۔

رجنی کو سب انسپکٹر کا عہدہ مِل چُکا تھا لیکن اُس کی خدمات ہیڈ کوارٹر ہی کے لیے مخصوص تھیں۔

مُشرقی پاکستان اور مغربی سرحد سے بھاگ کر آنے والے غداروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور "را" نے اِن لوگوں کو سُدھا کر مشرقی پاکستان میں داخل کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ اِس سلسلے میں ایک خاص سیل بنایا گیا تھا جس میں رجنی بھی شامل تھی۔ بنیادی طور پر تو اُس کے فرائض میں اِن بنگالیوں کا دِل لبھانا اور اُن کے دِل و دماغ کو ماؤف کر کے اُن میں پاکستان کے خلاف نفرت کا زہر گھولنا تھا لیکن رجنی اپنی نوکری سے کبھی انصاف نہ کر سکی۔

احمد کمال بیگ سے منسوب ہو جانے کے بعد وہ ذہنی طور پر خود کو مسلمان سمجھنے لگ گئی تھی اور جانتی تھی: "کہ جلد یا بدیر ایک تو اُس کا مذہب بدل جائے گا اور دوسرے اُسے اس لعنتی نوکری سے بھی چھٹکارا مِل جائے گا۔"

اُس کا دِل کئی بار چاہا کہ اِس گھٹن سے جلد ہی نجات حاصل کر لے اور یہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت نکالے لیکن خان نے ابھی اُسے کوئی بھی جذباتی قدم اٹھانے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

وہ کوئی سیاسی لیڈر تو نہیں تھا کہ حالات پر اُس کی نظر بہت گہری ہوتی لیکن ایک بات وہ بہرحال جانتا تھا: کہ اِن حالات میں جب سارا بھارت مسلم دشمنی کی آگ میں جُھلس رہا ہے "را" کی ایک سب انسپکٹر کا کسی مسلمان سے شادی کرنا دونوں کو زندہ درگور کر دے گا۔

"جیسے ہی اخبارات کے ہاتھ یہ خبر لگے گی وہ اسے اُچھالیں گے اور سارے بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دی جائیں گی۔ اس سوسائٹی میں گو کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوتی اور حکومت بھی اپنے دعوئ سیکولرازم کے تحت بظاہر اُن کی حوصلہ افزائی کرتی ـــ لیکن دونوں کا انجام ـــ؟"

وہ یہ سوچ کر ہی تھرّا کر رہ جاتا ـــ!!

○

بھارت میں آئے اُسے قریباً ایک سال ہو گیا تھا۔ وہ دسمبر ۷۰ء میں یہاں آیا تھا اور اب نومبر ۷۱ء آ چُکا تھا۔ سردیوں میں وہ یہاں آیا تھا اور گرمیوں کے بعد اب پھر سردی زور پکڑنے لگی تھی۔ اس دوران اُس نے بیسیوں انفرادی اور اجتماعی کارنامے سرانجام دیے تھے۔ پَل پَل کی خبر اپنے مُلک کو پہنچائی تھی۔

مشرقی پاکستان میں مُکتی باہنی کو بھارتی فوج کی مکمل سرپرستی حاصل تھی اور اُن لوگوں نے عملاً مشرقی پاکستان میں سوائے کنٹونمنٹ ایریا اور بڑے بڑے شہروں کے اپنی بادشاہی قائم کر لی تھی۔ خان کو مکمل طور پر "را" سے نتھی کر دیا تھا۔ اُسے مشرقی پاکستان میں دُشمن کے اختیار کرنے والے ہتھکنڈوں سے اپنے مُلک کو وقت سے پہلے آگاہ

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

کرنے کے فرائض سونپے گئے تھے۔ بھارتی اور بین الاقوامی اخبارات پڑھ پڑھ کر اُس کا ذہن ماؤف ہونے لگتا۔

وہ سوچتا: "اگرچہ دشمن کی تمام پلاننگ کی خبر ملک میں پہلے پہنچ جاتی ہے پھر بھی وہ کامیاب کیوں نہیں ہوتے؟ بالآخر اُسے سمجھ آگئی: کہ مشرقی پاکستان میں مقابلہ ایک دشمن سے نہیں تھا۔ وہاں کی فضاؤں، ہوائیں، ندی، نالے، دریا، جنگل، درخت، پہاڑ سب پاکستانی فوج کے دشمن ہو رہے تھے! دشمن کا جب جی چاہتا اُن کی پشت میں بڑے اطمینان اور معصومیت سے چھرا گھونپ دیتا۔

اُس کی اطلاعات پر فوراً عمل ہوتا اور دشمن کے مذموم مقاصد کو ناکام بنانے کے لیے متبادل پلاننگ کی جاتی لیکن ابھی یہ پلاننگ پاکستانی افسروں کے ذہنوں ہی میں ہوتی تھی کہ دشمن کو اُس کا علم اپنے "ذرائع" سے ہو جاتا اور وہ فوراً اپنی سکیم بدل کر حملہ آور ہو جاتا۔

جولائی کے آغاز ہی میں بھارتی توپخانے نے مشرقی سرحدوں کے دُور اندر تک گولہ باری شروع کر دی تھی اور بھارتی فوجیں اَب باقاعدہ پاکستانی فوج پر حملہ کرنے لگی تھیں۔

خان تک جب یہ خبریں پہنچتیں تو وہ پریشان ضرور ہوتا لیکن اُسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ جلد یا بدیر اُس کی باہمت فوج کے جیالے دشمن کا منہ توڑ کر رکھ دیں گے

○

"را" کے دفتر میں اَب اکثر لوگ اُسے رجنی کے بھائی کے ناطے پہچاننے لگے تھے۔ وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے بسا اوقات تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ دیا کرتا تھا۔ اُس نے اِس تمام عرصے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک و قوم کے لیے کام کیا۔

وہ نومبر کی ہی ایک شام تھی ——!!

آج بنگالی فوجی افسران کے اعزاز میں ایک اہم پارٹی دی جا رہی تھی۔ جس میں دہلی کے بڑے بڑے لوگ بھی شامل تھے۔ خان ایسی کسی بھی بیہودہ پارٹی میں نہیں جایا کرتا تھا لیکن رجنی نے اُس سے درخواست کی تھی: "کہ وہ شام ڈھلتے ہی اُسے لینے آجائے خود بھی وہاں رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے خان سے کہا تھا کہ اِس دوران وہ پارٹی سے فرار ہونے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لے گی۔"

شام ڈھلے وہ موٹر سائیکل لے کر اُس طرف چل دیا —— جائے تقریب کے نزدیک اُس نے موٹر سائیکل کھڑی کر دی تھی۔ اِس کے نزدیک ہی تقریب کے شرکا گاڑیوں سے اُتر اُتر کر شامیانے کی طرف جا رہے تھے۔ رجنی نے اُسے یہیں رُکنے کو کہا تھا۔

بڑی بے چینی سے وہ اُس کا منتظر تھا۔ جب اچانک ایک سرکاری کار اُس سے چند قدم دُور آکر کھڑی ہو گئی۔ تیز روشنی میں ایک بڑی باوقار خاتون اُس میں سے نمودار ہوئی اور جیسے ہی کار سے باہر نکل کر وہ خان کی طرف گھومی۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو —— وہ خوبصورت لڑکی اور خان لاکھ پردوں میں ہونے کے باوجود بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتے۔

یہ وہ خوبصورت ناگن تھی جس نے سرحد کے اندر داخل ہوتے ہی اُس پر پھن پھیلایا تھا اور وہ اُسے ایک ریلوے لائن کے پار دھکا دے کر بھاگ نکلا تھا! "اس طرح آج اچانک ایک سال بعد وہ اِس سے یوں ٹکرا جائے گا ——" خان نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا —— سال پہلے کے واقعات کی فلم چند لمحوں میں اُس کے ذہن کے پردے پر چل گئی۔

لڑکی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تھا۔ خان نے دوسرے ہی لمحے چہرہ دوسری

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

طرف پھیر لیا۔ اُس کے لیے سوا اِس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ موٹر سائیکل سٹارٹ کرے اور وہاں سے بھاگ جائے ـــــ اور اُس نے ایسا ہی کیا۔

لیکن ابھی بمشکل اُس نے گیئر بدلا ہی تھا جب اُسے اپنی پشت پر "بھیّا" کی جانی پہچانی آواز سنائی دی ـــــ یہ رجنی تھی جو اچانک کسی طرف سے وہاں آگئی تھی ـــــ آج تقدیر نے اُس کے لیے جال پھیلایا تھا اور اَب وہ واقعی اِس میں پھنس چکا تھا۔ بادلِ نخواستہ اُس نے موٹر سائیکل روکی اور رجنی کے پیچھے بیٹھتے ہی اُسے سٹارٹ کر دیا۔

ایک لمحے کے لیے اُس نے پلٹ کر دیکھا ـــــ ناگن اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

○

خان نے اپنی دانست میں یہی سمجھا تھا: کہ آرمی انٹیلی جنس کی کیپٹن سلوچنا نے اُسے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ بھول رہا تھا: کہ سلوچنا نے اُسے کبھی بھلایا ہی نہیں تھا ـــــ خان کا اُس کے ہاتھوں میں آکر نکل جانا اُس کے کیریئر کا شاید سب سے ہولناک سانحہ تھا ـــــ اور آج جب اُس نے "را" کے اِس اجتماع میں انسپکٹر رجنی کے ساتھ خان کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے تو وہ مُن ہو کر ہی رہ گئی تھی ـــــ! اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ آج تک اِن آنکھوں نے کبھی دھوکا نہیں کھایا۔

دُور تک وہ موٹر سائیکل کی پچھلی بتّی پر نظریں جمائے کھڑی رہی ـــــ انسپکٹر رجنی اُس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اُس کا شمار کیپٹن سلوچنا کی بڑی لائق شاگردوں میں ہوتا تھا۔ ایک لمحے کو اُس نے یہ بھی ضرور سوچا: "کہیں یہ نظر کا دھوکا ہی نہ ہو"۔ لیکن اُس نے دِل کے بجائے ذہن سے زیادہ کام لیا اور جب اُسے اپنے ہر سوال کا جواب ہاں ہی ہاں میں ملا تو اُسے یقین آگیا: "کہ یہ وہی پاکستانی ایجنٹ ہے جو اُسے ریلوے لائن کے پار دھکا دے کر بھاگ گیا تھا"۔

"اور اگر یہ شخص واقعی وہی ہے تو اِس کا زیادہ دیر تک آزاد رہنا اُس کے مُلک کے لیے اور زیادہ تباہ کُن ثابت ہوگا ـــــ" کیپٹن سلوچنا نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے وہ روبہ عمل تھی: وہ بجائے تقریب گاہ کی طرف جانے کے اچانک ہی دوسری طرف گھوم گئی ـــــ اُس کا رُخ "را" کے آپریشن روم کی طرف تھا۔

○

بمشکل پانچ منٹ بعد ایک مودب سیکورٹی آفیسر اُس کے سامنے انسپکٹر رجنی کی پرسنل فائل میں رجنی کا تمام پس منظر، خاندانی روابط، نئے اور پرانے دوستوں کے پتوں کے ساتھ موجود تھے۔

"را" اپنے کسی ایجنٹ سے یونہی آنکھیں بند نہیں کر لیتی تھی۔ وہاں اُس کی آمد و رفت اور اُس کے حلقہ احباب کا مکمل ریکارڈ اُسے لاعلم رکھ کر رکھا جاتا تھا۔ خان کے شاید وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اُس کی کوئی تصویر بھی اِس "پرسنل فائل" کا ایک حصّہ بن کر رہ گئی تھی۔ دوسری بہت سی تصویروں کی طرح ـــــ!!

کیپٹن سلوچنا کی آنکھیں اب دھوکہ کھانے کو تیار نہیں تھیں۔ اِس تصویر میں گو کہ خان نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں پر گہرے رنگ کے شیشوں کی عینک بھی موجود تھی لیکن سلوچنا کو یقین آگیا تھا کہ یہ وہی ہے ـــــ بالکل وہی!

اب اُس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یہ کارنامہ بڑی خاموشی سے اور اچانک انجام دینا چاہتی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک پرائیویٹ کار میں سول کپڑے پہنے وہ رجنی کے گھر کی طرف اُڑی چلی جا رہی تھی ـــــ اُس کا ذہن کار سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے سفر کر رہا تھا۔

○

خان بظاہر تو مطمئن تھا لیکن اِس کی چھٹی حِس نے کسی پیش آمدہ خطرے کی نشاندہی

scanned by aazamm@yahoo.com

aazzamm@yahoo.com

بھی کر دی تھی۔ احتیاط ملحوظِ خاطر رکھتے ہُوئے ہی اُس نے رجنی کو کالونی کے باہر ہی اُتار دیا۔

"میں ذرا احمد کمال سے ملنے جا رہا ہوں ایک ضروری کام ہے اور میں نے اُسے وقت بھی تقریباً یہی دیا ہُوا ہے۔ بیچارہ پریشان ہوگا۔ پھر کام بھی تمہارا ہے اِس لیے بُرا مت ماننا ——" اُس نے اچانک موٹر سائیکل رُکنے پر حیران کھڑی رجنی کو کہا اور اُس کا جواب سُنے بغیر ہی موٹر سائیکل دوبارہ سٹارٹ کر دی۔

کالونی سے کچھ دُور واقع ایک سینما گھر کے سائیکل اسٹینڈ پر اُس نے موٹر سائیکل کھڑی کر دی اب اُس کا رُخ قریبی ٹیلیفون بُوتھ کی طرف تھا —— کسی آمدہ خطرے کی صورت میں وہ فرار کی صورت پہلے ہی تلاش کر لینا چاہتا تھا۔

اِس سے قبل اُس سے عموماً خود ہی کوئی رابطہ قائم کرتا تھا اور اُسے کوئی فون نمبر رابطے کے لیے دے دیا جاتا تھا۔ اِس وقت اُس کے پاس کوئی ایسا نمبر بھی نہیں تھا جس سے وہ اِس صورتحال میں راہنمائی حاصل کر سکتا۔

اُس نے بڑی اُمید کے ساتھ ایک دوسرے مُلک کے نمبر پہ کال بُک کروائی تھی اور بُوتھ پر موجود کلرک کی مٹھی بھی گرم کر دی تاکہ وہ اُس کا نمبر دوسروں سے پہلے لگا دے پھر بھی اُسے قریباً آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا —— اور آدھ گھنٹے کے بعد اُسے اطلاع ملی کہ اُس کا دیا ہُوا نمبر موسمی خرابی کی وجہ سے مل نہیں رہا۔

خان کو اِس صورتِ حال نے چکرا کر ہی رکھ دیا تھا ——!!

کال بُوتھ سے باہر آ کر وہ کچھ سوچتا ہُوا سینما کی طرف چل دیا۔ کسی آمدہ خیال کے تحت اچانک ہی اُس نے گھر فون کیا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ فون رُما نے ریسیو کیا۔

"ہیلو رُما....."

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟" —— رُما نے دوسری طرف سے فوراً سوال کیا اور خان کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیوں بھئی خیریت" —— اُس کو اپنی آواز حلق میں گھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"بھگوان کے لیے اُرون —— جلدی بتاؤ —— اور ہاں گھر نہیں آنا۔ میں وہاں آتی ہوں" رُما نے اتنی بہت سی باتیں جتنی جلدی اور تیزی میں کہہ دی تھیں۔ اُس سے خان اُس پر گزرنے والے طوفان کی شدّت کا اندازہ بخوبی کر سکتا تھا۔

○

رُما رجنی کے گھر موجود تھی جب رجنی وہاں آئی کیونکہ آج اُن دونوں نے شام کے بعد اپنی ایک سہیلی کے ہاں جانا تھا رُما کا خیال تھا کہ وہ اندازاً اُس وقت تک گھر پہنچ جائے گی اور رُما نے سوچا، وہیں سے دونوں چلی جائیں گی۔

رجنی کی آمد کے بمشکل پندرہ منٹ بعد ہی جب وہ دونوں گھر سے رُخصت ہو رہی تھیں ایک تیز رفتار کار اُن کے دروازے پر آ کر رُکی۔ کار میں سے برآمد ہونے والی شخصیت پر نظر پڑتے ہی رجنی کو یوں لگا جیسے اچانک کسی نے اُس کا دِل مُٹھی میں جکڑ کر زور سے دبا دیا ہو۔ اُس کے چہرے کی اچانک بدلتی رنگت نے رُما کو بُوکھلا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔

رجنی نے چاہا ایک قدم اُٹھائے لیکن کیپٹن سلوچنا پر نظر پڑتے ہی جیسے زمین نے اُس کے پاؤں جکڑ لیے "سلوچنا کی اچانک اور ہنگامی آمد کا ضرور کوئی اہم سبب ہوگا اور معاملہ خاصا سیریس" رجنی نے دِل ہی دِل میں سوچا۔

"ہیلو انسپکٹر رجنی" —— سلوچنا نے اُس کے نزدیک آ کر کہا۔

"ہیلو" —— رجنی کو معمولی سا مسکرانے کے لیے بھی بہت زور صرف کرنا پڑا۔

"آؤ اندر بیٹھتے ہیں" —— اُس نے رجنی سے کہا اور بڑی بے تکلفی سے اُس کے

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

بازو کو تھپتھپاتی اندر کمرے میں چلی آئی ـــــ "آپ کا پرتیجے ۔"

"یہ ماتا جی کی شاگرد ہے کلپنا ـــــ آج پہلی مرتبہ مل ہے مجھ سے ۔" کسی لاشعوری عمل کے تابع رجنی نے جھوٹ بول دیا۔ اُسکی چھٹی حس چلّا چلّا کر کسی جلد لوٹنے والی قیامت کا احساس دِلا رہی تھی ـــــ "تم ذرا چلو۔ موسی جی سے کہنا مَیں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی۔"

اُس نے رَما کی طرف مُڑ کر ایک آنکھ دبائی۔

رَما کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اُسے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ رجنی کا جھوٹ، پھر اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبانا ـــــ وہ ایک لمحے کے لیے بوکھلائی ضرور تھی لیکن سنبھل گئی۔ صورتحال کی سنگینی کا احساس اُسے بڑی شدّت سے ہو گیا تھا۔ اُس نے سوچا ضرور کچھ خطرناک بات ہے ورنہ رجنی یوں اُسے یہاں سے نہ بھگاتی۔

بظاہر خود کو صورتحال سے لاتعلق کر کے وہ دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی لیکن اپنے کان جیسے وہ اُس کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔

"مس رجنی تمہارا وہ دوست ارون کمار کہاں ہے؟" اُسے سلوچنا کی آواز سنائی دی۔

"کیوں ـــــ آپ کون ہوتی ہیں میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنے والی۔" رجنی نے شاید جان بُوجھ کر اپنی آواز بلند رکھی تھی تاکہ دوسرے کمرے میں موجود رَما کی سہیلی کو صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو جائے۔

"انسپکٹر رجنی وہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں رہا ـــــ" سلوچنا دھاڑی: "ارون کمار پاک سپائی ہے ـــــ بہت خطرناک ایجنٹ۔"

رَما کو یوں لگا جیسے کسی نے بڑے زور سے گھونسا اُس کے دل پر مار دیا ہو۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ" ـــــ رجنی کی بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔

"وقت ضائع نہ کرو رجنی ورنہ معاملہ سنگین بھی ہو سکتا ہے۔ کہاں ہے وہ ـــــ؟"

"اُس سے میری دوستی پُرانی نہیں کیپٹن! اور ہونا کہاں ہے اُسے؟ اپنے گھر ہوگا۔ لیکن آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے ـــــ شاید آپ کو دھوکا ہُوا ہے ـــــ"

"رہتا کہاں ہے وہ ـــــ؟" سلوچنا غرّائی۔

"اُدھر گنج منڈی کی طرف کہیں رہتا ہے ـــــ مجھے اُس کے گھر کا علم ہے۔ نمبر وغیرہ یاد نہیں۔"

"رجنی تمہیں فوراً میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

"لیکن مَیں اپنے پرسنل باس کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کروں گی۔"

"مَیں کیپٹن سلوچنا تمہیں حکم دیتی ہوں۔" اِس مرتبہ سلوچنا کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

دوسرے کمرے میں موجود رَما کی باقی تمام حسّات کو تو موت آچکی تھی، شاید سُننے کی حس ابھی زندہ تھی۔ اُس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لے لیا تھا۔

"اوکے۔ مَیں آپ کے ساتھ پہلے آفس جاؤں گی اور اپنے باس سے اجازت کے بغیر کوئی اگلا قدم نہیں اُٹھاؤں گی۔"

"رجنی تمہیں اِس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا" ـــــ سلوچنا نے دھمکی دی۔

ایک بات تو رَما واضح طور پر محسوس کر سکتی تھی کہ رجنی بہرصورت ارون کو بچانا چاہتی ہے ورنہ وہ اُس کا نام غلط نہ بتاتی نہ ہی اس طرح وقت کو ٹالتی۔

"مَیں لباس تبدیل کر لوں۔" کہہ کر وہ سلوچنا کی کوئی بات سُنے بغیر اُس کمرے میں چلی آئی تھی جہاں رَما موجود تھی۔ موسی شاید کسی ساتھ والے کوارٹر میں گئی ہوئی تھی۔ ورنہ اَب تک وہ یہاں ضرور آجاتی۔

دوسرے کمرے میں رَما کو دیکھ کر اُس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا پھر

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

بڑی باوقار چال چلتی ہوئی اُس کی طرف آئی۔ اُس نے اپنے مُنہ پر انگلی رکھ کر اشارہ کر دیا تھا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے تاکہ اُس کی وہاں موجودگی کا سلوچنا کو علم نہ ہو سکے۔ دو قدم مزید آگے بڑھ کر وہ رُما سے لپٹ گئی۔

"رُما ـــــ میری دوست!" اُس نے رُما کے کان کے نزدیک مُنہ کر کے سسکاری بھری۔ "وقت بہت کم ہے صرف میری بات غور سے سُن لو۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے۔ کون نہیں! بس وہ میرا بھائی تھا ـــــ رُما ایک روز اُس نے کہا تھا ممکن ہے مُشکل حالات میں مَیں اُسے پہچاننے سے انکار کر دوں ـــــ اگر زندگی میں کبھی اروِن بھیّا سے مُلاقات ہو جائے تو اُسے بتا دینا کہ اُس کی راجپوت بہن نے اُسے مرتے دَم تک نہیں بُھلایا تھا۔ رُما میں تم دونوں کی محبت پر قربان ہونے جا رہی ہوں، اس اُمید پر کہ تم بھی اس محبت کا بھرم رکھو گی رُما! ایک نہ ایک روز یہ لوگ تم تک پہنچ جائیں گے ـــــ اور وہ زندگی موت سے بدتر ہو گی ـــــ اگر مرنا ہی ہے تو اروِن بھیّا کی محبت پر مر جاؤ ـــــ" اُس نے رُما کا بوسہ لیا اور نزدیکی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

رُما کی قوتِ سماعت تو ابھی تک زندہ تھی لیکن قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اب تک جانے کتنی ہچکیاں اُس کے حلق میں دَم توڑ چکی تھیں۔ اُس نے رجنی سے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ ایک پھانس سی اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے رجنی نے الماری سے اپنا سروس پستول نکالا اُس کے چیمبر میں گولیاں لوڈ کیں اور دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں اِس طرح پستول دیکھ کر سلوچنا اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی۔

"کیپٹن سلوچنا!" ـــــ اُس نے پستول سیدھا کرتے ہوئے کہا ـــــ "میں جانتی ہوں کہ تم جھوٹ نہیں کہو گی ـــــ تم اپنے کام کی ماہر ہو؛ اگر میں نے اروِن کمار کو گرفتار

بھی کروا دیا تو بھی تم لوگ مجھے زندہ درگور کر دو گے۔ میں راجپوت لڑکی ہوں مس سلوچنا! کسی تفتیشی مرکز میں تمہارے سدھائے ہوئے کتّوں سے اپنا جسم نچوانے سے مر جانا میرے لیے زیادہ موزوں ہے کیپٹن سلوچنا! میں مرتے دَم جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میرا بھائی پاکستانی جاسوس ہے اگر علم ہو بھی جاتا تو بھی میں اُسے تمہارے ہاتھوں گرفتار نہ کرواتی۔ لیکن وطن سے غدّاری کا میں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا ـــــ اور ہاں کیپٹن سلوچنا! تم ہی شاید ایک ایسی ہستی ہو جس سے میرے بھائی کو خطرہ لاحق ہے۔ مَیں اپنے ساتھ ہی یہ کہانی بھی ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ کیپٹن سلوچنا!" ـــــ وہ شیرنی کی طرح دھاڑی:۔ "تمہیں بھی میرے ساتھ ہی مرنا ہو گا، ہاں ـــــ تمہیں! تاکہ یہ راز تمہارے ساتھ ہی، ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے۔"

ایک لمحے کے لیے رُک کر اُس نے پستول والے ہاتھ کو حرکت دی۔ "زیادہ ہوشیاری نہ دکھانا کیپٹن۔ اپنی جگہ بیٹھی رہو۔" اُس نے محسوس کیا تھا کہ شاید سلوچنا کے جسم میں حرکت ہوئی ہے! سلوچنا اپنی جگہ دوبارہ جم کر رہ گئی۔

اُسے یہ لڑکی اِس لمحے کالی کا کوئی رُوپ دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے "سلوچنا! جو عورت اپنی جان دینے جا رہی ہے وہ اُس کی جان بھی لے سکتی ہے۔"

"سلوچنا! تم میری اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکو گی کیونکہ تم اس رشتے کو سمجھ ہی نہیں سکتی جو میرے اور اُس کے درمیان اُستوار ہو چکا تھا۔ اور ہاں مرنے سے پہلے یہ بھی جان لو کہ مَیں نے تمہیں اِس کا ایڈریس بھی غلط بتایا ہے ـــــ اب سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے والی فلائیٹ میں وہ دہلی سے جا چکا ہے ـــــ تم اس کی گرد کو بھی اَب نہیں پہنچ سکو گی۔"

"رجنی" ـــــ سلوچنا اپنی جگہ بیٹھی بیٹھی چیخی۔ غصّے سے اُس کے جبڑے باہر نکل رہے تھے۔ اُس نے اپنے دانت دانتوں پر سختی سے جما رکھے تھے۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

"شٹ اپ" ـــــ رجنی چلائی۔ پستول سیدھا کرتے ہوئے اُس نے سلوچنا پر بہت نزدیک سے تین گولیاں فائر کر دیں۔ تینوں گولیاں سلوچنا کے سر پر لگی تھیں۔

اُس کو زیادہ تڑپنے کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

اُس کے ساتھ ہی اُس کے ہاتھ کا رخ بدلا اور رما کی سماعت ایک اور دھماکے سے لرز کر رہ گئی ـــــ رجنی نے اپنے ہاتھوں اپنی جان بھی لے لی تھی۔

رما کے دِل پر جیسے کسی نے آرا چلا دیا ہو۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے دوسرے کمرے میں جھانکا۔ پھر دیوانہ وار باہر کو لپکی۔

تصویر کے دونوں رُخ

پاکستان کے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں قریباً سبھی اہم شخصیات ایک گول میز کے گرد براجمان تھیں۔

اُن کے سامنے ایک فائل میں مختلف خطوط کی فوٹو سٹیٹ موجود تھیں۔ جن کے ساتھ ایک سرکاری نوٹ الگ سے لکھا گیا تھا ـــــ جس میں تفصیلاً بتایا گیا تھا کہ یہ انٹیلی جنس کے ایجنٹ، عابد خان کی حاصل کردہ وہ فائل ہے جو اس نے غدار بنگالی کرنل سے چھین کر اپنے قبضے میں لی اور پھر منوہر لال (کوڈ نام) نے اپنی جان پر کھیل کر یہ رپورٹ سرحد پار تک پہنچائی تھی ـــــ خان نے بنگالی کرنل کو جہنم رسید کرنے کے فوراً ہی بعد اُن لوگوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور اگلے ہی روز دہلی کے ایک ریستوران میں منوہر لال نے اُس سے کاغذات وصول کر کے سرحد پار پہنچا دیئے تھے۔

اس فائل میں جو "را" نے بنگالی کرنل کو اپنا رعب جمانے کے لیے مطالعے کو دی تھی، اُس کے مختلف ایجنٹوں کی رپورٹیں موجود تھیں۔ جن کے ذریعے بنگالی کرنل کو یہ باور کروایا گیا تھا کہ اگر اس کے ذہن میں کوئی شک شبہ موجود ہو ـــــ تو اس فائل کے مطالعے کے بعد وہ ختم ہو جائے اور وہ جی جان سے اپنے نئے مالکوں کے ساتھ وفادار ہو جائے!!

ان خطوط کے ذریعے دشمن کے عزائم بے نقاب ہو گئے تھے ـــــ عابد خان کی اس رپورٹ نے اُن لوگوں کے شبہات کو یقین میں بدل دیا تھا۔ گو کہ وہ اس سے پہلے سے

Scanned by azamm@UrduFanz.com

Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

aazzamm@yahoo.com

دشمن کی مکمل پلاننگ جو اُس نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں بدلنے کے لیے تیار کی ہوئی تھی ـــــ کی روداد بھی اپنے مُلک میں پہنچا چُکا تھا ـــــ لیکن اس فائل میں "را" کے مختلف ایجنٹوں نے خطوط نے اُن لوگوں باور کروا دیا تھا کہ بغاوت سارے مشرقی پاکستان میں پھیل چُکی تھی سب لوگ باری باری فائل میں لگے خطوط پڑھ رہے تھے ـــــ!!

○

ٹاپ سیکرٹ

کونفیڈنشل رپورٹ

..... صرف اُسی کے لیے جس سے یہ متعلق ہے۔

حسبِ حُکم مَیں نے "وائیٹ فلاور" سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ہماری ملاقات نمبر ۵ پر ہوئی۔ "فلاور" یہاں ایک پناہ گاہ میں چھپا ہوا ہے۔ اُس نے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ اگر اُسے مطلوبہ رقم یعنی ۲ لاکھ روپیہ (مقامی کرنسی) پہنچا دی جائے تو وہ ارد گرد کے دیہاتوں سے کم از کم ایک ہزار کارکن مکتی باہنی کے لیے فراہم کر سکتا ہے۔

مَیں نے اُسے یقین دہانی کروا دی ہے کہ کسی بھی مُشکل کے وقت ہم اُسے ممکن امداد بہم پہنچائیں گے اور ضرورت پڑنے پر اُسے سرحد پار بھی جانا ہوگا۔ "وائٹ فلاور" نے میرے لیے بہت کام کیا ہے اُس کی خاص کمزوری عورت اور شراب میں بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو میرا "کوڈ میسج" مل چُکا ہوگا۔ دو لڑکیاں فوراً اُس کے روانہ کر دیں۔

مَیں نے اِس بات کا خاص طور سے اہتمام کیا ہے کہ اگر "وائیٹ فلاور" ہمارے لیے خطرہ بننے لگے تو اُسے کسی بھی غیر محسوس طریقے سے مروا دیا جائے۔

"سی ون" کی طرف سے بھیجا ہُوا پہلا پارسل کل مل گیا تھا۔ مَیں نے اسلحہ تقسیم کروا دیا ہے۔ اور ان لوگوں کو خصوصی ہدایت کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ غیر بنگالیوں کا قتلِ عام کریں تاکہ پاکستانی فوج مجبور ہو کر چھاؤنیوں سے باہر نکل آئے اور اس کا بنگالیوں سے براہِ راست ٹکراؤ ہو جائے۔

ایجنٹ ۰۰ ایکس

○

ٹاپ سیکرٹ

کونفیڈنشل رپورٹ ..... صرف وہی پڑھے جس سے متعلق ہے

چاٹگام کے پوائنٹ نمبر ۱۰ سے اطلاع ملی ہے کہ "قادر باہنی" نے کل معمول کی گشت پر جانے والے ایک فوجی کنوائے پر دھوکے سے حملہ کر دیا۔ جب اُن کا تعاقب کرتے ہُوئے پاکستانی فوج ایک گاؤں میں داخل ہوئی تو بھاگتے ہُوئے ان لوگوں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق وہاں تین دیہاتیوں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا اور دُور دُور تک دیہاتوں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ پاکستانی فوج نے ہنستے بستے گناہ بنگالیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا ہے۔

منصوبے کے مطابق ہمارے آدمی جن کے پاس اسلحہ موجود تھا لوگوں کو اشتعال دلا کر فوج کے مقابل لے آئے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ دیہاتیوں اور فوج کا تصادم ناگزیر ہو گیا ـــــ پندرہ آدمی مارے گئے ـــــ ہمارا منصوبہ بالکل کامیاب رہا۔

ایجنٹ نمبر ون ـــــ ۱۸ تھین ایکس کو حسبِ حُکم یہ کارنامہ انجام دینے پر کرنسی نوٹ بھیج دیئے ہیں.....

اِس سلسلے میں انسپکٹر شاروا کمار ری نے جو خصوصی خدمات انجام دی ہیں۔ اُن کے

Scanned by aazamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

پیش نظر اُس کی ترقی کی سفارش کی جاتی ہے .....

ایجنٹ فاکس اوَن

○

ٹاپ سیکرٹ

کونفیڈنشل رپورٹ

.....صرف وہی پڑھے جس سے متعلق ہے۔

راجشاھی میں موجود "گروپ نمبر ۱۶" کے لیے اگلا پروگرام ۔ ۲۸ اگست رات ٹھیک پونے دو بجے "پوائنٹ نمبر ۹۳" پر شمال کی جانب سے ایک گن بوٹ آکر رُکے گی .....

تین ٹارچیں سُرخ رنگ کی مسلسل جلا بُجھا کر سگنل پاس کیے جائیں گے...

تین منٹ انتظار کے بعد پھر تین سگنل دیئے جائیں گے ..... اسی ترتیب سے گروپ نمبر ۱۷" جوابی کوڈ دھرائے گا ..... دو منٹ کے مزید انتظار کے بعد "گروپ نمبر ۱۷" کا مقامی کمانڈر بوٹ تک جائے گا .....

پہلے سے موصول شدہ کوڈ کے تبادلے کے بعد اسلحہ اور گن بوٹ میں موجود تین بھارتی کمانڈوز "گروپ نمبر ۱۷" میں شامل ہو جائیں گے ۔

(مُقرّر) ۲۸ اگست ..... پوائنٹ نمبر ۹۳ ..... شمال کی سمت ..... رات دو بجے .....

آپ کی طرف سے بھیجی ہوئی تینوں لڑکیاں مسلمان بنگالی ملازم پیشہ خواتین کے روپ میں ہم نے تین اعلیٰ افسروں کے گھروں میں داخل کر دی ہیں اور اُنہوں نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے .....

ہمیں قوی اُمید ہے کہ جلد ہی یہ تینوں افسروں سے ناجائز تعلقات قائم کر کے اُن

سے راز حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی .....

ہیڈ کوارٹر کی طرف سے موصول ہونے والے نئے احکامات اور مطلوبہ آپریشنز اُن تک پہنچا دیئے گئے ہیں .....

ایجنٹ سی او ۔ تھری

○

ٹاپ سیکرٹ

کونفیڈنشل

رپورٹ ویسٹرن کمانڈ

.....صرف وہی پڑھے جس سے متعلق ہے۔

ویسٹرن فرنٹ کی طرف سے آنے والی مختلف ایجنٹوں کی رپورٹوں کے بعد ہم نے یہ سفارشات مرتّب کی ہیں۔

ا۔ ایسٹ بنگال جیسی نوعیّت کا ایک ماسٹر پلان فوراً تیار کر کے یہاں ویسٹ میں اُس پر کام شروع کر دیا جائے۔ ہم نے اس سلسلے میں ترجیحات مقرّر کی اُن کی تفصیل۔

الف ..... اپنے نظریات کے حامل افراد کی ہمدردیاں ہمیں پہلے ہی حاصل ہیں۔ اُن کو اپنے اصل مقاصد سے لاعلم رکھ کر اور صوبائی آزادی کا لالچ دے کر ہم باآسانی اپنے راستے پر لا سکتے ہیں۔

ب ..... تربیت یافتہ لڑکیوں کے ذریعے حکومت میں موجود آزاد خیال اور ہمارے نظریات سے اتفاق رکھنے والے افسران کو قابو کیا جا سکتا ہے۔

ج ..... کچھ لوگوں کے راز حاصل کر کے اُنہیں بلیک میل کر کے اپنا کام کیا جا سکتا ہے۔

د ..... لالچ، دباؤ، دھمکی کے ہتھیار استعمال ہو سکتے ہیں (وقتاً فوقتاً)

۲۔ نوجوانوں کے ذریعے ہم اپنے مقاصد میں اس طرح کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

Scanned by azam@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

الف ..... اُن کی درسگاہوں تک رسائی حاصل کر کے اُن کے اساتذہ کے ذریعے اُن میں نظریۂ پاکستان کے خلاف پرچار کیا جائے۔

ب ..... طلبا کے لیڈروں کو رشوت، جنسی ترغیب یا لالچ دے کر درسگاہوں میں اپنی حامی طلبا تنظیمیں قائم کی جا سکتی ہیں۔

۳۔ خواتین میں کام کرنے کے لیے اور اُنہیں اپنی ہمنوا بنانے کے لیے درج ذیل سفارشات طے پائی ہیں۔

الف ..... ترقی پسند (پروگریسو) خواتین تک اپنی ایجنٹوں کے ذریعے رسائی حاصل کی جائے۔

ب ..... خواتین میں آزاد خیالی کو رواج دیا جائے اس سلسلے میں اُن تک لٹریچر پہنچانا شروع کر دیا گیا ہے۔

(انتہائی اہم نوٹ)

ہم نے اپنے کام کے لیے کچھ لوگوں کو تیار کر لیا ہے....

(میسج ری پیٹ)

.....

.....

ایجنٹ تھری الیف

○

اس فائل کے ساتھ ہی ایک اور فائل بھی اِن لوگوں کے سامنے دھری تھی، جس میں بھارتی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کے وہ بیانات اور تقریریں تھیں جن میں اُس نے دُنیا بھر کو چیخ چیخ کر یہ بتایا تھا کہ پاکستانی فوج بنگالیوں کا قتلِ عام کر رہی ہے اور بھارت پر زبردستی جنگ مسلط کی جا رہی ہے۔

اس فائل کے ساتھ ایک تیسری فائل میں جو بھارتی انٹیلی جنس "را" کی ہیت ترکیبی اور اُس کے مشرقی پاکستان میں شروع ہونے والے آپریشنز سے متعلق تھی، پہلے ہی حصہ پر ایک نقشہ چسپاں کیا گیا تھا۔

اس نقشے میں بھارت کی اس حال ہی میں قیام پانے والی انٹیلی جنس کے طریقِ کار اور کارپردازان کے عہدوں کی نشاندہی کی گئی تھی جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس گھناؤنی مہم کی براہِ راست کمان بھارتی وزیرِ اعظم کر رہی ہے جو بھارتی انٹیلی جنس "را" کی براہِ راست نگران اعلیٰ تھی۔ کتنا تضاد تھا ——

کتنا بڑا دھوکہ تھا ——

کتنا اذیت ناک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ بنگالیوں کی تقدیر سے اور شاطر اپنی چرب زبانی کی وجہ سے "مظلوم" بھی بنا بیٹھا تھا ——!!

Scanned by azamm@UrduFanz.com

Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

aazzamm@yahoo.com

شبنم

دیوانہ وار بھاگتی ہوئی وہ اپنے گھر پہنچی تھی۔

یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے کسی نے گھر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا ورنہ اُس کی بظاہر حالت دیکھ کر ہر کوئی اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتا ــــ!! وہ اسی اُمید پر گھر آئی تھی کہ شاید اروِن کمار گھر پہ موجود ہو۔ لیکن یہاں تو کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ رسوئی میں شاید ماتا رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔

اُس پر عجیب وحشت سی طاری تھی "زندگی اتنی اچانک اور تیز چوٹ کر جائے گی" اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اپنی عزیز ترین سہیلی کی خودکشی اور اپنی متاعِ حیات کے متعلق یہ انکشاف "کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے" اس صورتحال نے اُسے کاٹھ کر رکھ دیا تھا۔ رَما کو یوں محسوس پڑتا تھا جیسے کوئی تیز دھار چھری سے اُسے کاٹتا چلا جا رہا ہو بہت دُور اندر تک ــــ اُس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہتا تھا لیکن وہ رو نہیں سکتی تھی۔

اپنی سہیل کے یہ الفاظ ابھی تک اُس کے ذہن میں دھماکہ پیدا کر رہے تھے: "کہ یہ لوگ بالآخر اُس تک پہنچ جائیں گے" اور وہ بخوبی جانتی تھی کہ تب جینا اُس کے لیے جہنم بنا دیا جائے گا ــــ پھر وہ کیا کرے؟ ــــ اُس نے زندگی میں کبھی اروِن سے الگ رہ کر جینے کا سوچا ہی نہیں تھا۔ اَب کیسے اُس سے الگ رہ کر جی

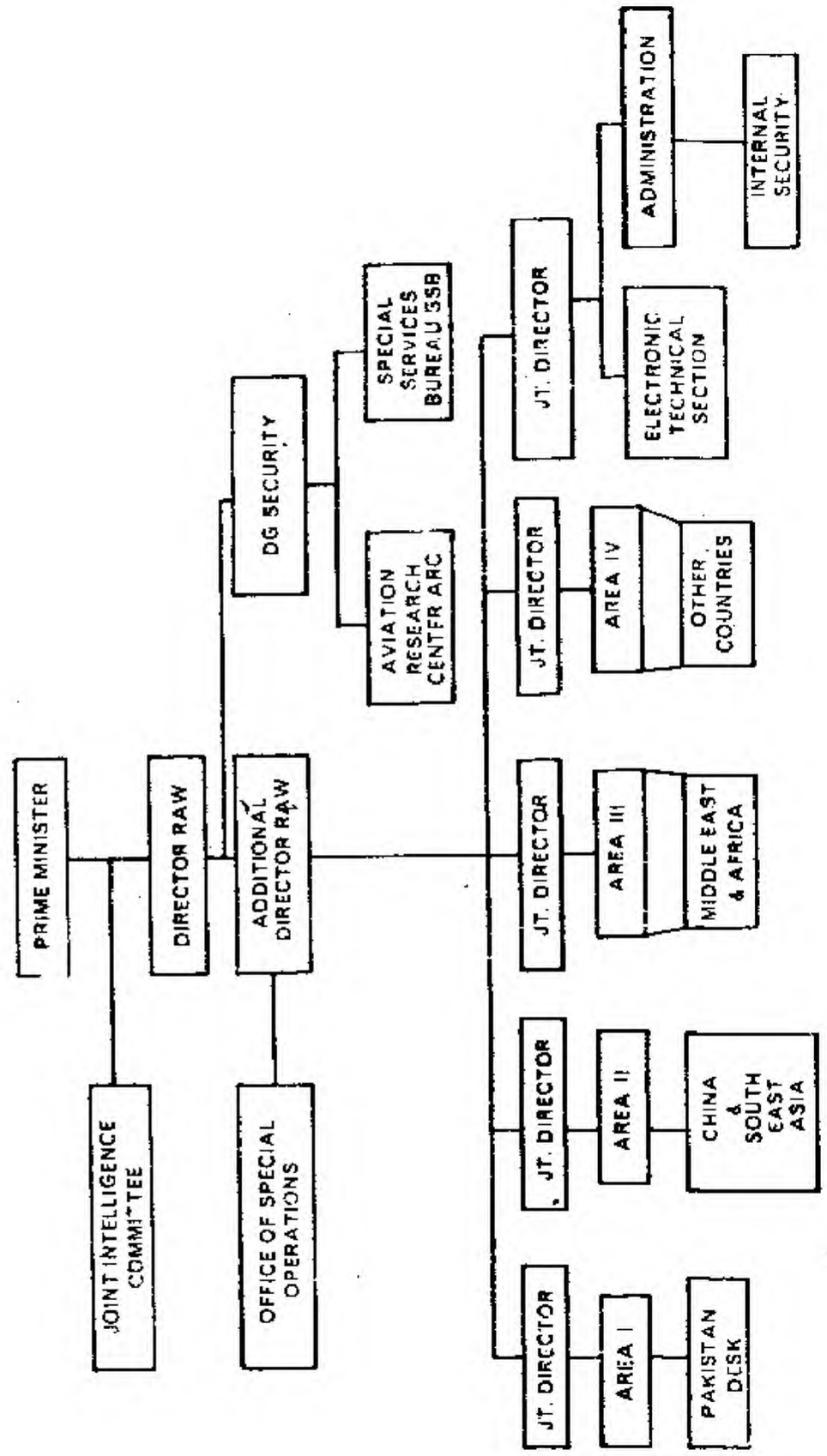

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

سکے گی ؟ کس طرح ممکن ہوگا اُس کے لیے اروِن کو بھُول جانا ؟

"نہیں اروِن ! تم جو کوئی بھی ہو میرے ہو۔ مَیں جیتے جی تم سے الگ نہیں رہ سکتی۔ مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی مکمل انسان اور مرد دیکھا ہے۔ اِس سوسائٹی میں جہاں ہر سمت بھیڑیوں کے غول عورتوں پر جھپٹنے کے لیے مُنڈلا رہے ہیں ایک تم ہی تو تھے جسے مَیں نے کھو جانا تھا ـــــ" وہ دِل ہی دِل میں جانے خُود کو کیا کچھ کہتی رہی کہ :

ـــــ اچانک ہی فون کی گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے خان اُس سے مخاطب تھا :

"رُما تم اگر کچھ کہنا چاہتی ہو تو فوراً کہہ ڈالو" ـــــ خان نے اُس کو اپنی موجودگی بتانے سے احتراز برتا۔

"اروِن کُمار وقت کم ہے۔ بھگوان کے لیے مجھ پر دشواش کرو۔ مَیں آج بھی صرف تمہاری رُما ہوں ـــــ تمہاری رُما" وہ قریباً رو دی۔

"ٹھیک ہے تم کناٹ پیلس کی اُس بنچ پر آجاؤ جہاں ہم اکثر بیٹھا کرتے ہیں" خان نے کہا اور فون بند کر دیا۔

○

اُس کا دِل گواہی دے رہا تھا کہ رُما اُسے دھوکہ نہیں دے رہی۔ یوں بھی اس صورتحال میں اُس کو اگر کسی طرف سے مدد کی اُمید تھی تو وہ رُما ہی تھی۔

ابھی تک اُس کا رابطہ "دوستوں" سے نہیں ہُوا تھا کہ اُدھر سے موصولہ کسی ہدایت پر عمل پیرا ہو سکے۔ اب تو اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا خود کرنا تھا ـــــ اور اِن حالات میں اُس کے پاس سوا اِس کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ سرحد عبور کر کے وطن واپس لوٹ جائے۔ فی الوقت یہ زمین اُس پر تنگ تھی۔ اگلے ہی لمحے ایک رکشہ

پر وہ کناٹ پیلس جا رہا تھا۔

کناٹ پیلس کے اُس مخصوص بنچ پر اُس کی نظریں جمی تھیں اور خود وہ اُس راستے پر کھڑا تھا جو اُس طرف آتا تھا۔ اُس نے خود کو چھپائے رکھنے کے لیے ایسی جگہ تلاش کی تھی جہاں وہ دُور تک اُس طرف آتے ہوئے رُما پر نظر رکھ سکتا تھا۔

اپنی آمد کے بمشکل چند منٹ بعد اُس نے دُور سڑک کنارے ایک ٹیکسی رُکتے دیکھی جس سے رُما برآمد ہوئی۔ وہ بڑے پتے تُلے اور محتاط قدموں سے اس طرف آ رہی تھی۔ خان کے نزدیک سے گزر کر وہ اُس مخصوص بنچ تک پہنچی اور اُس پر بیٹھ گئی۔

دس منٹ تک خان اپنی جگہ کھڑا اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ رُما بار بار بے چینی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دس منٹ بعد اُس نے اپنا بیگ اٹھایا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ پھر دوبارہ اُس بنچ پر بیٹھ گئی ـــــ خان نے اُس دوران بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ نہ کوئی اُس کی نگرانی کر رہا ہے۔ نہ ہی کسی نے اُس کا تعاقب کیا تھا ـــــ وہ اپنی جگہ سے باہر نکلا اور اچانک ہی اُس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"اروِن ـــــ" خان پر نظریں پڑتے ہی رُما پھٹ پڑی۔

وہ قریباً بھاگتی ہوئی اُس کی طرف آئی اور اُس سے لپٹ گئی۔ خان نے محسوس کیا اُس کا سارا جسم لرز رہا ہے۔

"اروِن ـــــ" دوبارہ اُس نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا اور سسک پڑی "یہ کیا ہو گیا اروِن ـــــ میری محبت کو کس کی نظر کھا گئی ؟"

"رُما پاگل مت بنو اِس طرف کوئی بھی آ سکتا ہے آؤ کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" اُس نے رُما کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اُسے خود سے الگ کر دیا۔

○

Scanned by azzamm@UrduPoint.com

aazzamm@yahoo.com

ایک قدرے ویران اور لوگوں کی آمدورفت سے محفوظ گوشۂ عافیت میں بیٹھے دونوں مصروفِ گفتگو تھے: رُما نے سسکیاں لیتے ہوئے اُسے اَب تک کی کہانی سنائی تھی۔

رجنی کی موت پر خان کا دل بھی بھر آیا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ بہت شدت سے انسانی جذبات اُس پر غالب آئے تھے۔ رجنی کی اس طرح بے بسی کی موت نے اُس کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا احمد کمال بیگ نے اپنا قریباً سارا سرمایہ جرمنی منتقل کر دیا تھا اور اَب وہ رجنی سے شادی کر کے وہیں جرمنی میں بسنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

ابھی اگلے ہی روز دونوں باپ بیٹا اُسے ملے تھے۔ اُنہوں نے رجنی کے لیے مسلمان عورت کے نام سے پاسپورٹ حاصل کرنے کے انتظامات بھی کر لیے تھے اور ویزا لگتے ہی یہاں سے فرار ہو جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

اُسے اپنے انجام کی تو فکر نہیں تھی۔ ایسے کسی بھی سانحے کے لیے وہ ذہنی طور پر ایک لمبے عرصے سے تیاری کرتا آ رہا تھا؛ لیکن احمد کمال بیگ کے خواب اس طرح اچانک ٹوٹ جائیں گے ——؟ یہ سوچ ہی اُسے رُلا دینے کے لیے کافی تھی! پھر وہ رُما سے مخاطب ہُوا:

"رُما! مَیں نے کتنی مرتبہ چاہا کہ تمہیں اپنی اصلیت بتا کر تمہاری دُنیا سے نکل جاؤں لیکن حالات نے مجھے کبھی اپنی مرضی سے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا —— تم نے سُنا وہ سچ ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ نادانستگی میں تمہارے ساتھ مَیں نے بہت بڑا ظلم کیا ہے —— بے انصافی کی ہے لیکن میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ رُما بسا اوقات واقعی انسان تقدیر کے ہاتھوں میں موم کی گُڑیا بن کر رہ جاتا ہے۔ تم سے مل کر —— تمہیں پا کر مَیں خود کو انسانیت کے کسی بڑے اعلیٰ درجے پر فائز کوئی شخصیت جاننے لگا تھا۔ تم نے میری زندگی اتنی بھرپور کر دی تھی کہ مجھے کبھی مستقبل کی ہولناکیاں جاننے کا وقت ہی نہ ملا —— مَیں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ کسی روز یوں اچانک یہ الوژن اس طرح ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ مَیں یہ کبھی نہیں کہوں گا رُما کہ مَیں تم سے شرمندہ ہوں، کیونکہ انسان جس سے محبت کرے اُس کے سامنے شرمندگی کا اظہار نہیں کیا جاتا —— پھر بھی تم مجھے جو بھی سزا سناؤ اُسے پانے کے لیے تیار ہوں" —— اِتنا اُس نے رُما کو پُرسکون دیکھ کر کہا۔

جواب میں رُما کچھ کہے بغیر اُس کے سینے سے سر ٹکا کر سسکنے لگی۔ پھر اچانک وہ خاموش ہو گئی۔ اُس نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا۔ خان کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی:

"مَیں اپنا جیون تمہارے نام لگا چکی ہوں اُرون! اَب میرا جینا اور مرنا تمہارے ہی ساتھ ہے۔ اگر تم مجھے چھوڑ کر بھاگنا چاہو تو بھی یاد رکھو: یہاں سے میری لاش ہی گھر واپس جائے گی۔ مَیں اپنے قدموں پر چل کر نہیں جاؤں گی اور ہاں ——" اُس نے ایک لمحے کے توقف سے دوبارہ کہا —— "یہ نہ سمجھ لینا مَیں نے مستقبل میں پیش آمدہ کسی بدنامی کے خوف سے تمہارے ساتھ مرنے اور جینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ مجھے تم میں پہلے ہی روز کوئی غیر معمولی بات ضرور نظر آئی تھی اُرون —— میرا دل اول روز ہی سے گواہی دیتا آ رہا ہے کہ تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ مَیں نے کئی دفعہ تم سے یہ بات کہی بھی لیکن ....." وہ خاموش ہو گئی۔

اُس نے یہ بات اتنے مضبوط لہجے میں کہی تھی کہ خان ٹوٹ کر رہ گیا، اُسے اپنی شخصیت اِس دھان پان لڑکی کے سامنے بالکل بودی محسوس ہونے لگی تھی۔ رُما آج اُس پر چھا گئی تھی۔

اُس نے رُما کو مستقبل کے تمام خدشات کا احساس دلایا، اُسے بتایا: "کہ وہ کتنا اہم اور انقلابی فیصلہ کر رہی ہے —— وہ اپنا مذہب ہی نہیں اپنی ملّت اور پہچان بھی خان کی خاطر بدلنے جا رہی تھی —— لیکن رُما کے پائے استقامت میں اُس کی طرف

aazzamm@yahoo.com

سے بتائے گئے مستقبل کے خدشات کوئی لرزش پیدا نہ کر سکے ـــــ وہ تو مضبوط چٹان کی طرح ڈٹ کر کھڑی تھی۔

موسمی تغیرات جس کے آہنی عزائم سے سر ٹکرا کر دم توڑ دیا کرتے ہیں۔ اُس نے اپنے ضمیر کی عدالت میں رجنی کی موت کے فوراً بعد اپنا مقدمہ دائر کر دیا تھا اور وہاں سے کلیرنس سرٹیفکیٹ ملنے ہی پر اب وہ ایک فیصلے پر پہنچی تھی۔

"تو ٹھیک ہے میں تمہیں بھی سرحد پار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا رُما ـــــ اور پھر زندگی ہماری ہوگی۔ جہاں بھر کی خوشیاں تمہاری جھولی میں ڈال دوں گا۔ اگر تم نے میرے ساتھ ہی مرنے جینے کا پیمان باندھا ہے تو یہ تمہارا اکیلا فیصلہ نہیں رُما میں بھی اس میں تمہارا ساتھی ہوں۔ اتنی ہی شدت سے میں بھی تمہارے اس فیصلے میں شامل ہوں۔"

رُما نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنا سر اُس کے فراخ سینے میں سمیٹ لیا۔

○

خان سوچنے لگا: یہ اُس کی کتنی خوش قسمتی تھی کہ کیپٹن سلوچنا نے جب اُس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی تو اُسی لمحے اُس نے اُس کا تعاقب نہ کیا۔ وہ کبھی بھی اُن لوگوں کے ہاتھوں بچ کر نہ نکل سکتا۔ رُما نے اُسے رجنی کی موت تک دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ بتا دیا تھا۔ خان نے جان لیا تھا کہ رجنی نے مرتے دم تک اُس کے متعلق اپنی ایجنسی کو اندھیرے میں رکھا ہے اُس نے آخری لمحات میں بھی سلوچنا کو ڈاج کیا تھا کہ اروِن کمار جہاز کے ذریعے دہلی سے روانہ ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بھی ناممکن تھا کہ سلوچنا نے اس کے متعلق کوئی اہم نوٹ اپنی روانگی پر وہاں نہ چھوڑا ہو۔ یہ زمین اب اُس پر تنگ ہو چکی تھی۔

خان سمجھ سکتا تھا کہ اُن لوگوں نے اب تک تمام اہم مقامات پر ناکے لگا دیئے

ہوں گے ـــــ!!

آج کی رات اُس نے دہلی ہی میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن یہ رات کہاں کاٹی جائے۔ اُس نے جب یہ مسئلہ رُما کے سامنے رکھا تو رُما نے اُس کا حل بھی نکال دیا۔

"میری ایک آرٹسٹ دوست ہے یہاں۔ ابھی دس پندرہ روز پہلے ہی وہ بنگال سے آئی ہے۔ بہت آزاد خیال ہے اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے۔ کسی کو علم نہیں اُس کی اور میری دوستی کا۔ ایک ایگزیبیشن پر ہمارا تعارف ہوا تھا۔ میرا خیال ہے اگر میں تمہیں اپنے دوست کی حیثیت سے وہاں لے جاؤں تو وہ بخوشی ہمیں رات بسر کرنے کی اجازت دے دے گی۔

خان نے کُرید کُرید کر اُس سے اُس کی بنگالی آرٹسٹ دوست مسز ٹیگور کے متعلق سوالات پُوچھے پھر مطمئن ہو کر اُس کے فیصلے پر ہی صاد کر دیا۔

○

کناٹ پلیس سے وہ اندھیرا پھیلنے کے بعد باہر نکلے تھے۔ خان نے اپنی جیکٹ رُما کو پہنا دی تھی اور خود اُس کی چادر اوڑھ لی تھی کہ اُس کا مُنہ بھی قدرے چھُپا رہے۔ مسز ٹیگور کا فلیٹ دہلی کی ایک جدید طرز کی آبادی میں تھا۔ دونوں نے ٹیکسی کچھ دُور ہی چھوڑ دی تھی اور اب پیدل ہی اُس کے فلیٹ کی طرف جا رہے تھے۔

مسز ٹیگور کہیں جانے کے لیے پَر تول رہی تھی جب دونوں نے اچانک ہی اُس کے دروازے پر دستک دی! رُما کو ایک مرد کے ساتھ دیکھ کر بنگالی آرٹسٹ لڑکی کی باچھیں کھِل گئیں۔ اُس کی شکل دیکھ کر قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی "مسز" رہی ہے۔

رُما نے اروِن کا تعارف اُس سے سری واس کے نام سے کروایا تھا۔ مسز ٹیگور خان کی توقعات سے زیادہ مہمان نواز ثابت ہوئی۔ اُس نے دونوں کے لیے کافی تیار کر دی اور

Scanned by aazamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے رُما نے خان کی سمجھائی ہوئی کہانی اُس کے سامنے دُھرا دی۔

اُس نے مسز ٹیگور کو بتایا کہ دونوں نے ظالم سماج سے بھاگ کر سول میرج کرنے کا پروگرام بنایا ہے لیکن دونوں کے رشتہ دار اُن کی تلاش میں ہیں۔ فی الوقت انہیں دو تین روز چھُپ کر گزارنے ہوں گے۔ اِس کے بعد ہی کوئی اگلا قدم اُٹھائیں گے۔

مسز ٹیگور نے پہلے تو اُن کے جذبہ محبت اور اُس عدیم المثال قُربانی کو سراہا جو وہ ایک دوسرے کے لیے دینے جا رہے تھے پھر اُنہیں یقین دلایا کہ وہ ممکن حد تک اُن کا ساتھ دے گی اور دو تین دن تو کیا وہ اگر چاہیں تو اپنی ساری زندگی اُس کے فلیٹ پر گزار دیں۔

اُس نے رُما کو بتایا کہ صبح اُسے ضروری کام سے پٹیالہ جانا ہے صرف دو روز کے لیے! اِس دوران وہ اُن کے لیے گھر کا فریج بھر کر جائے گی۔ واپسی پر وہ دونوں کو لے دوست سول جج کی عدالت میں پیش کر کے اُن کو رشتہ ازدواج میں مُنسلک کروا دے اور پولیس کی مکمل حفاظت بھی اُنہیں میسر آ جائے گی۔

دونوں نے اُس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے التجا کی تھی کہ فی الوقت وہ کسی کو بھول کر بھی اُن کا تذکرہ نہ کرے بلکہ یہ بھول ہی جائے کہ اُس کی غیر موجودگی میں کوئی اُس کے فلیٹ میں موجود ہے۔ رُما نے اُسے بتایا تھا کہ سری واس کا ایک دوست میرٹھ میں بہت بڑا وکیل ہے۔ اُس نے تمام بندوبست کر رکھا ہے۔ ایک اہم کیس کے سلسلے میں وہ چندی گڑھ گیا ہوا ہے۔ دو تین روز میں واپس آ جائے گا اور وہ میرٹھ اُسی کے ہاں جا کر سول میرج کریں گے۔

"سری واس جی کے کچھ خاندانی تنازعات ہیں ـــــ اور بھی مسائل ہیں۔ بس تم وہی کرنا جو میں کہہ رہی ہوں"۔ رُما نے اُسے سمجھایا۔

"اچھا بیٹا" ـــــ مسز ٹیگور نے کہا اور وہ کسی کام سے تھوڑی دیر بعد باہر چلی گئی۔

مسز ٹیگور کی واپسی رات دیر گئے ہوئی۔ شراب کے نشے سے اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور خان بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کس کام سے گئی ہو گی۔ دونوں نے سہارا دے کر اُسے بیڈ روم تک پہنچایا، مسز ٹیگور تو تھوڑی دیر بعد ہی سو گئی۔ لیکن وہ دونوں رات کافی دیر گئے تک جاگتے رہے۔

رُما نے خود ہی اُس کے لیے دو تین مرتبہ چائے تیار کی تھی۔ دونوں کا دِل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن دونوں نے ہی ایک دوسرے کا دِل رکھنے کیلئے چند لقمے آملیٹ کے ساتھ زہر مار کر لیے تھے۔ ڈرائنگ روم میں دونوں چلے آئے تھے۔ اُنہوں نے ٹی وی لگا لیا تھا اور خود کو بظاہر اُس میں محو بھی کیے ہوئے تھے لیکن دونوں ہی سمجھتے تھے کہ اُن کا دھیان ٹی وی کے بجائے اپنے اپنے مُستقبل کی طرف ہے۔

○

جس علاقے میں اُن لوگوں نے پناہ لی تھی خوش قسمتی سے یہ وہ علاقہ تھا جہاں لوگ ایک دوسرے کے معاملات میں کم ہی مداخلت کیا کرتے تھے۔ وہ رات دونوں نے قریباً جاگ کر گزاری۔ خان نے اُس دوران دو مرتبہ اس فون سے کال بُک کروائی لیکن مقامی ایکسچینج میں کوئی خرابی ہونے کی وجہ سے اُس کا رابطہ کسی بھی طرح اپنے "دوستوں" سے قائم نہ ہو سکا۔

سحر ہونے سے کچھ دیر پہلے اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ صبح دیر گئے تک سوتا رہا۔ رُما نے اِس دوران جان بوجھ کر اُسے بیدار نہ کیا۔ شاید وہ اَب اپنا دُکھ ہی خان کا دُکھ جاننے لگی تھی۔ ابھی تک نہ تو اُس نے خان سے اُس کا اصلی نام اور پہچان دریافت کی تھی، نہ ہی خان نے خود اُسے کچھ بتایا تھا۔ ایک مرتبہ جب اُس نے بین السطور میں ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا تو خان نے اُسے مُسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"رُما ـــــ ابھی ایسی کوئی بات نہ کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے

Scanned by aazzamm@yahoo.com

aazzamm@yahoo.com

گا۔ سب کچھ تم جان لوگی۔" اور رما خاموش ہو گئی تھی۔

جب رما نے ناشتہ تیار کرنے کے کافی دیر بعد اُسے بیدار کیا تو سورج بنگالی آرٹسٹ لڑکی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ بستر سے چھلانگ لگا کر وہ اٹھا اور باتھ روم میں جا گھسا۔ جب وہ نہا دھو کر باہر نکلا تو خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ رما نے آج بھی اُس کے لیے وہی ناشتہ تیار کیا تھا جو وہ گھر میں اُس کے لیے تیار کیا کرتی تھی۔ اُس لمحے جب وہ خان کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھ رہی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ خان سے بڑھ کر اُس کے درد کو اور کون جان سکتا تھا۔ اُس نے پھر بھی رما سے کچھ نہ پوچھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جی بھر کے رو لے تاکہ اس کا من کچھ تو ہلکا پڑ جائے۔

"شما کرنا"۔۔۔ کہہ کر رما باتھ روم میں چلی گئی۔

باتھ روم سے اُس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی۔ خان اس کے چہرے پر ٹوٹتے کرب کو دیکھ کر بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ اُسے اپنی ہچکیوں کا گلہ گھونٹنے میں کیا کیا جتن خود سے نہ کرنے پڑے ہوں گے۔ رما نے اپنا چہرہ پانی سے دھو لیا تھا۔ آنسوؤں سے دھلے چہرے پہ زبردستی کی مسکراہٹ جمائے جب وہ خان کے سامنے آئی تو خان کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے اپنے شعور کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ اُس لمحے رما کا دکھ اپنا دکھ جانا۔ ابھی تک اُس نے ناشتے کو چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

رما نے اُس کے چہرے کی کیفیات سے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ اُس کے درد نے اُس کے محبوب کو بھی دکھی کر دیا ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے خان کے لیے چائے بنائی اور پیالی خان کی طرف بڑھا دی۔ خان نے خاموشی سے پیالی تھام لی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لیے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ جمالی تھی۔

صبح پھر اُس نے چاہا کہ فون پر رابطہ قائم کرے۔ بعد از خرابیٔ بسیار دوسری طرف رابطہ قائم ہو گیا لیکن خان کو اُدھر سے اطلاع ملی کہ متعلقہ آدمی جن سے اُس نے بات کرنی ہے دو دن کی چھٹی پر گئے ہیں۔ اُسے اچھی طرح سمجھ آ گئی کہ ایسی ہنگامی صورتحال کی کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔۔۔۔ شاید یہی اُن لوگوں کا کمزور ترین پہلو تھا۔

خان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اب زندگی اور موت کا یہ معرکہ اُسے اکیلے ہی لڑنا ہو گا۔ اُس نے اپنی پرواہ کبھی نہیں کی تھی لیکن رما کا ساتھ۔۔۔؟ کیا وہ رما کو اپنے ساتھ سرحد پار کروا کر پاکستان لے جا سکے گا؟ اُس نے سوچا اور سہم کر رہ گیا۔

شام تک اُس نے ایک طویل خط اپنے غیر ملکی کوریئر ایڈریس، کے لیے لکھا۔ دوپہر کو وہ تھوڑی دیر کے لیے بازار گیا تھا اور وہاں سے ڈاک کا لفافہ اور دوسری چیزیں خرید کر لے آیا تھا۔ شام کے بعد پھر وہ باہر نکلا اور وہ خط نزدیکی لیٹر بکس میں ڈال کر واپس آ گیا، اس دوران اُس نے رما کو فارغ نہیں بیٹھنے دیا تھا۔

○

اُس کے ذہن نے یہاں سے فرار کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

اب وہ اُس منصوبے کے مطابق تیاری کر رہا تھا۔ بازار سے وہ کپڑا لے آیا تھا۔ اور شام تک رما نے مسز ٹیگور کے ہاں رکھی سلائی مشین پہ مقامی مسلمان عورتوں کے زیر استعمال رہنے والا برقعہ تیار کر لیا تھا۔

خان نے یہاں سے اُسے چھپا کر نکالنے کا قصد کیا تھا۔ اس بات کا اُسے بہرحال اطمینان تھا کہ دو دن تک دہلی سے باہر جانے والے راستوں کی کڑی نگرانی کرنے اور شہر میں مختلف مقامات پہ اُن دونوں کو تلاش کرنے کے بعد اب کم از کم انٹیلی جنس کو یہ دھوکہ ضرور ہو چکا ہو گا کہ وہ دونوں دہلی سے نکل چکے ہیں۔ اُس نے یہاں دو دن تک یونہی چھپنے کا فیصلہ نہیں کر لیا تھا۔ یہ بات اُس کے ذہن میں بہرحال موجود رہی تھی کہ

Scanned by aazzamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

اُنہیں قدرت نے یہاں چھپنے اور محفوظ رہنے کا موقعہ دیا ہے۔

شام ڈھلے مسز ٹیگور واپس آگئی ـــــ!

اُس نے دونوں کی خیریت بڑے خوشگوار موڈ میں دریافت کی تھی۔ اُس کی آمد تک رُما نے برقعہ اپنے بیگ میں تہہ کر کے رکھ لیا تھا۔ مسز ٹیگور سفر سے خاصی تھک چکی تھی۔ اور اپنی تھکاوٹ دُور کرنے کے لیے اُس نے حسبِ عادت مے نوشی شروع کر دی تھی۔

خان نے یہی موقعہ غنیمت جانا اور رات کے اندھیرے ہی میں دہلی کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ شراب کے نشے سے مدہوش مسز ٹیگور کو انہوں نے رسماً اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ اور اُس کی ہزاروں نیک خواہشات اپنے جلو میں لیے باہر نکل آئے۔ مسز ٹیگور تو دونوں کو اسٹیشن تک چھوڑنے پر تلی ہوئی تھی لیکن خان نے بدقت تمام اُسے منع کیا۔

دونوں نے رات دس بجے کے بعد وہاں سے نکلنے کا منصوبہ دوپہر کو ریلوے انکوائری سے مختلف گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل دریافت کرنے کے بعد ہی طے کیا تھا۔ رات کے اس پہر دو تین گاڑیاں پنجاب کی طرف جاتی تھیں اور خان نے اُس سمت سے سرحد عبور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُسے سرحدی علاقے کی الف بے کا بھی علم نہیں تھا۔ کیونکہ اس علاقے کی سرحد کے متعلق اُس نے نقشہ تو ضرور دیکھا تھا لیکن عملی طور پہ کبھی اس طرح پنجاب یا کشمیر سرحد سے اُس نے سرحد عبور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

راجستھان سے متعلق اُسے کچھ معلومات ضرور تھیں لیکن وہ جانتا تھا کہ اس بات کا علم بھارتی انٹیلی جنس کو بھی ہے کہ وہ راجستھان کی سرحد سے تھوڑی بہت آشنائی رکھتا ہے۔ ایک تو ویسے ہی سرحدی علاقہ آجکل فوج سے پٹا پڑا تھا اُس پر مستزاد سیکورٹی کا وہ جال تھا جو اُن لوگوں نے اُس کے خیال کے مطابق اُس کے استقبال کے لیے تان رکھا ہوگا۔ وہ اکیلا ہوتا تو بھی کچھ بات تھی۔ لیکن اب تو حالات یکسر ہی

مختلف تھے۔

بُرقعہ رُما نے فلیٹ سے کچھ فاصلے پر پہنچتے ہی پہن لیا تھا۔

"اب یہ بھی بتا دیجئے "بیگم صاحبہ" کہ آپ کو کس نام سے مخاطب کروں"۔ خان نے اُس کے کان میں سرگوشی کی! وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح رُما کے ذہن پہ پڑا سوچ کا بھاری پتھر ایک طرف کو ہٹ جائے۔

"کسی بھی نام سے"۔ رُما بھی اُس کا دُکھ جانتی تھی مسکرا کر بولی۔

"پھر بھی کوئی ایک نام جو تمہیں اچھا لگتا ہو؟"

"ہاں ہے ایک۔ میری دوست تھی۔ ایف۔ اے تک ہم اکٹھے ہی پڑھے تھے۔ شبنم۔ ہاں شبنم نام تھا اُس کا"

"ٹھیک ہے میں تمہیں شبنم ہی سمجھوں گا"

"ہاں اور ہمیشہ یہی سمجھنا۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ضمیر پر میرے لیے کچھ بھی بوجھ رہے۔ میں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ، بلیک میلنگ یا خوف سے نہیں کیا۔ میں نے اپنا مذہب چھوڑنے کا فیصلہ بڑی ایمانداری سے کیا ہے اور اس پر ہمیشہ قائم رہوں گی۔ اب آپ کو اس نام سے نہیں پکاروں گی۔ مجھے بھی کوئی نام بتا دیجئے"۔

اُس لمحے رُما کی ان باتوں نے خان کو بڑا حوصلہ دیا۔ اُس کے لہجے میں جھلکتے اعتماد نے خان کو یقین دلا دیا تھا کہ یہ آرٹسٹ دھان پان سی لڑکی اب اُس کی ذات ہی کا کوئی حصّہ بن کر رہ گئی ہے۔ اُس لمحے وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ رُما کی قربانی نے جو وہ اُس کے لیے، اُس کی ملّت اور مُلک کے لیے دینے جا رہی تھی۔ اُسے ایک بے نام سا احساسِ تفاخر بخشا تھا اور وہ خود کو واقعی اس جہان سے الگ تھلگ محسوس کرنے لگا تھا۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اُس نے اپنی حیثیت کو نہیں بھلایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی، لاشعوری طور پر بھی، اپنے پیشے کے تقدس سے کسی بھی غداری کا مرتکب ہو۔ اُس کی ٹریننگ کا اوّلین اصول بھی یہی تھا "کہ دشمن کی سرزمین پر اُس نے کسی کو کبھی اپنا اصلی نام نہیں بتانا۔"

"مجھے بھی فی الوقت جس نام سے چاہو پکار لو ——" خان نے مسکرا کر اُس کی خواہش کو ٹالنا چاہا۔

"ٹھیک ہے میں آپ کو طاہر کہوں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

دونوں ایک ٹیکسی کے ذریعے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تھے۔ خان نے ٹیکسی سٹیشن سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی تھی۔ دو تین گلیاں گھومنے کے بعد اُس نے تھوڑی دیر بعد آنے والی "ملوخان میل" کے درجہ دوم کی ٹکٹیں خرید لیں۔ دونوں ویٹنگ روم میں جا بیٹھے۔ ان تین چار دِنوں میں اُس کی داڑھی نکل آئی تھی اور چہرے پر دوبارہ چیشہ جم گیا تھا جس نے اُس کی شناخت کو قدرے بدل بھی دیا تھا۔

اُس نے لدھیانہ کے ٹکٹ خریدے تھے لیکن راستے ہی میں اُتر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ٹریننگ کلاس روم میں لٹکا بھارتی سرحدی علاقے کا بڑا سا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کو یاد آ گیا: "کہ پنجاب اور کشمیر کے سنگم پر سرحد پر بے شمار ندی نالے، ٹیلے اور جنگلی گھاس کا لامتناہی سلسلہ موجود ہے۔ اِس کی آڑ میں وہ لوگ کچھ آسانی تلاش کر سکتے تھے۔" یہی جان کر اُس نے دِل ہی دِل میں وہی علاقہ سرحد عبور کرنے کے لیے منتخب کر لیا تھا۔

ابھی تک اُس نے رُما کو اپنے کسی فیصلے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ رُما بھی اب حالات کو خاصا سمجھنے اور جاننے لگی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اُس کے محبوب کے علاوہ بھی خان کا اِس

زمین سے کوئی اور رشتہ بھی ہے اور خان اُس رشتے سے کبھی دستبردار نہیں ہوگا۔

○

گاڑی اب متعلقہ پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ خان نے اپنی مقامی اسلامی اقدار کو ملحوظِ نظر رکھا تھا اور وہ شبنم کو ایک زنانہ ڈبے میں بٹھا کر خود اُس سے ملحقہ ڈبے میں آن بیٹھا تھا۔ گاڑی دیکھتے ہی دیکھتے مسافروں کے بوجھ سے دوہری ہونے لگی تھی۔

جالندھر تک وہ ہر اسٹیشن پر اُتر کر ساتھ والے زنانے ڈبے کی کھڑکی سے لگی شبنم کے احوال جانتا رہا۔ ہر اسٹیشن پر اُتر کر وہ چند منٹ ہی کے لیے سہی شبنم کو بہت سی کربناک سوچوں سے نجات بخش دیتا تھا۔ اُس نے ہر اسٹیشن پر اُس سے مستقبل کی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ اُسے اپنے والدین گھر بار کے متعلق بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ اُس نے شبنم سے کہا تھا کہ اُس کی اِس عظیم قربانی پر اُس کی زمین پر بسنے والا ہر نفس اُسے نذرِ عقیدت گزارے گا۔

شبنم کو جالندھر ریلوے اسٹیشن تک وہ مستقبل کے سہانے خوابوں سے بہلاتا ہوا آیا تھا۔ رات نے اپنی بساط لپیٹنی شروع کر دی تھی جب وہ گاڑی سے اُترے۔ خان کی ہدایت کے مطابق شبنم نے گاڑی کے ڈبے ہی میں برقعے سے نجات حاصل کر لی تھی۔ یہاں سے اُنہیں سکھوں کے بھیس میں سفر کرنا تھا۔ اُس نے بھی دہلی میں خریدی ہوئی پگڑی جسے اب تک اُس نے راجستھانی مسلمانوں کے سے انداز میں باندھ رکھا تھا۔ اب سکھوں کی پگڑی کی شکل میں باندھ لیا تھا۔

شبنم نے نہ چاہتے ہوئے بھی خان کے اصرار پر ماتھے پر بندی سجا لی تھی۔ اُس نے برقعہ گاڑی ہی میں چھوڑ دیا تھا اور مقامی عورتوں کی طرح اَب ساڑھی پر چادر اوڑھ لی تھی۔

نیند گو کہ دونوں کے نزدیک بھی نہیں پھٹکی تھی لیکن شبنم کی آنکھوں سے جھلکتی صبح کی سُرخی نے خان کو مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ سُرخ سُرخ ڈورے جو نیند پوری نہ کرنے کی وجہ سے

Scanned by azamm@UrduFanz.com

اُس کی آنکھوں میں بسیرا کر چکے تھے۔ بادامی آنکھوں کے سحر کو دوچند کر رہے تھے خان نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور رُعبِ حُسن سے تائب ہو کر نظریں ہٹالیں:

اُسے یوں لگا جیسے کچھ دیر اور اگر وہ اِن آنکھوں میں جھانکتا رہا تو پتھر کا ہو جائے گا۔!

○

ویٹنگ روم بالکل خالی تھا۔ دونوں وہیں آن بیٹھے اور اَب صبح کا انتظار کرنے لگے ـــــ ویٹنگ روم کے بلب کی دم توڑتی روشنی میں ایک مرتبہ پھر اُس نے شبنم کی طرف دیکھا۔ پوری واقعیت سے اُس کے حُسن کو محسوس کیا اور بہت سا اُس پر ٹکٹکی باندھ کر اُس کے سامنے بیٹھ رہا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ محبت کی دیوی زہرہ کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہو۔

اُس لمحے جب وہ جالندھر ریلوے اسٹیشن کے دوسرے درجے کے ویٹنگ روم میں اِس بادامی آنکھوں والی آرٹسٹ لڑکی کے سامنے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا تو جیسے مستقبل کے سارے وسوسے سارے اندیشے اور حال کی تمام تلخیاں دم توڑ کر رہ گئی تھیں۔ وہ خود کو اس ویٹنگ روم سے باہر کسی مرغزار میں حُسن کی اس دیوی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اُسے وہ طلسماتی اور پریوں کی کہانیاں یاد آنے لگی تھیں جو اِس کو بچپن میں میٹھی نیند سُلانے کے لیے اُس کی ماں سُنایا کرتی تھی۔

اس ساحرہ کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی قیامتوں میں ڈوبتا اُبھرتا جانے کب تک وہ خواب زاروں کے بھولے بھٹکے جزیروں میں اُس کے سنگ سنگ بادلوں کے دوش پر اُڑتا رہا۔ رات اُس کے ساتھ ساتھ سفر کرتی اَب دِن کے پہلو میں اُترنے کے لیے پَر تول رہی تھی۔ اُس لمحے جب صبح کی پہلی کرن نے خان کے دِل کے دروازے

aazzamm@yahoo.com

پر دستک دی اور اسٹیشن کے نزدیکی کسی گردوارے سے پُرسوز آوازوں نے مِل کر کوئی بھجن الاپنا شروع کیا تو اُسے یوں لگا جیسے وہ خود بھی سُر کے کسی گہرے ساگر میں بہنے لگا ہو ـــ تمام کومل اور تیور سروں کے راگ اِس زہرہ گداز کٹورا آنکھوں والی لڑکی کے بدن سے پھوٹنے لگے تھے۔

نور کے ایک ہالے نے اپنا نام بدلنے کے بعد سے اُسکے چہرے پر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور اُس کے ملکوتی حُسن کا گداز اور گہرا ہو چلا تھا۔

سورج کی چمکتی کرنوں کے ساتھ ہی خان نے ایک الاؤ سا اپنے ہونٹوں پر دہکتا محسوس کیا۔ شبنم کی آنکھوں کا سحر جیسے اَب اپنے جوبن پہ آ چکا تھا اور خان کے لیے سوائے اِن آنکھوں کے سحر کو تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا ـــــ!!

عقیدت اور محبت کے ملے جُلے جذبے کے ساتھ وہ نیم بیہوت سا اپنی جگہ سے اُٹھا۔ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اُس نے دو تین قدم شبنم کی طرف بڑھائے اور اُسے انتہائی قریب آ کر یوں کھوئی کھوئی حسرت ناک نگاہوں سے دیکھنے لگا کہ جیسے ابھی کوئی اُس کی شبنم کو اُس سے چھین کر لے جائے گا ـــــ!

شبنم مبہوت سی اپنی جگہ بیٹھی رہی ـــــ!!

دونوں نے وہیں ویٹنگ روم میں چائے پی اور باہر نکل آئے۔ ایک سائیکل رکشہ میں تھوڑی دیر بعد وہ نزدیکی لاری اڈے کی طرف جا رہے تھے۔ خان نے احتیاطاً ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس خرید لیا تھا اور اب بادی النظر میں یہی دکھائی دے رہا تھا جیسے یہ نوبیاہتا جوڑا اپنے کسی عزیز کے ہاں جا رہا ہے۔

پٹھانکوٹ کے دو ٹکٹ اُس نے خریدے اور ایک ڈی لکس بس میں بیٹھ گیا۔ دوپہر کے بعد تک بس نے اُنہیں پٹھانکوٹ پہنچا دیا۔ دونوں نے لاری اڈے ہی میں موجود ایک ویشنو ڈھابے پر کھانا کھایا۔ خان نے اس کے ساتھ شام ڈھلنے تک کا وقت

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

دانستہ پٹھانکوٹ کے بازاروں میں گھوم پھر کر گزارا۔ اِس دوران اُس نے محسوس کیا کہ شبنم نے کچھ چادریں اور ساڑھیاں اپنے پاس موجود پیسوں سے خرید لی تھیں۔

جلد ہی اُسے سمجھ آگئی کہ یہ سب کچھ وہ خان کی ماں اور بہن کے لیے خرید رہی ہے مشرقی لڑکیوں کی وہ روایتی اقدار جو اُن کے کردار کا خاصہ ہوتی ہیں کو اس لڑکی نے جی جان سے اپنا رکھا تھا۔

"بے چاری لڑکی ——" خان نے دِل ہی دِل میں سوچا۔ "جانے کتنے ارمان دِل میں بسائے وہ یہاں سے رُخصت ہو رہی تھی۔ کتنا یقین تھا اُسے بحافظت خان کے مُلک اور گھر تک پہنچ جانے کا۔!

اُسے اب شبنم پہ پیار کے ساتھ رحم بھی آنے لگا تھا۔!!

شام ڈھلنے کے بعد وہ ایک بس کے ذریعے کھٹوعہ جا رہے تھے۔ کھٹوعہ تک وہ شبنم کو سمجھاتا آیا تھا کہ اُسے کس طرح چلنا ہوگا؟ کیسے سرحد عبور کرنا ہوگی؟ —— اُس نے دانست میں شبنم کو خاصا دلیر بنا دیا تھا جبکہ رُما سے شبنم بننے کے بعد اُس کی ذات میں جو ایک بھرپور اعتماد آگیا تھا اُس کا شاید خان کو مطلق احساس ہی نہ ہو سکا۔ وہ نہ جان سکا کہ شبنم اَب اُس کی طفل تسلیوں سے بالکل بے نیاز ہو چکی ہے —— وہ تو خود کو اُس پر نچھاور کر دینے کا عزم لے کر اُس کے سنگ سنگ چل رہی تھی۔ اُس نے تو ذات کی نفی تب ہی کر دی تھی جب اُس نے اپنا سماج، دھرم چھوڑ کر اُس کی ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اَب اُس کی اپنی ذات، اپنی پہچان کوئی رہی ہی نہیں تھی۔ اَب اُس کا جو کچھ بھی تھا، یہی عابد خان تھا جسے وہ جانے کتنی مرتبہ طاہر کہہ کر مخاطب کر چکی تھی۔

○

کھٹوعہ پہنچنے تک رات ہو چکی تھی —— !!

دونوں کھٹوعہ چیک پوسٹ سے پہلے ہی اُتر گئے۔ لاری آگے نکل بہ نکھہ

نے اندازے سے سمت کا تعین کیا اور مغرب کی طرف سڑک سے نیچے اُترنے لگا۔ شبنم اُس کے تعاقب میں تھی۔ نزدیک کوئی گاؤں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی دُور کچے راستے پر چلنے کے بعد خان نے شبنم سے اٹیچی کیس لے کر ایک ندی میں پھینک دیا۔ اُس میں موجود چادریں شبنم نے پہلے ہی اپنے گلے میں لٹکتے بیگ میں مُنتقل کر لی تھیں۔

بیگ خان نے پکڑ کر اپنی پیٹھ پر باندھ لیا تھا۔ چلتے چلتے کبھی کبھی رُک کر وہ شبنم کی طرف دیکھ لیتا تھا —— اور شبنم کو جیسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اَب خان نے اُس کی طرف دیکھنا ہے کیونکہ ہر دفعہ اُس نے اُسے مُسکراتے ہی پایا۔

اُس لمحے جب محبت کی وادی پُرخار کے یہ دو مسافر موت کی شاہراہ پر ایک دوسرے کے سنگ سنگ چل رہے تھے خان نے ایک پُراسرار سا تقدس، طمانیت اور بھرپور اعتماد شبنم کے چہرے پر جھلکتا دیکھ لیا تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھی —— خان کو شدت سے اُس لمحے شبنم کے کمرے میں اُس کے ہاتھ سے بنی ہوئی اُس لڑکی کی پینٹنگ یاد آگئی جو سمندر کے کنارے لہروں کے دوش پہ بالکل خاموش اور پُرسکون کھڑی تھی! اپنے سینے میں سارے سمندر کا تلاطم دبائے آج یہ لڑکی بھی بالکل شانت اور مطمئن موت کے سفر پہ اُس کے ہمرکاب تھی۔

آسمان بالکل صاف تھا اور خان کے سر پہ راہنمائی کے لیے تمام ستارے موجود تھے۔ اُس کو بخوبی یہ احساس تھا کہ کون اُس کا ہمراہی ہے اور یہ راستہ جو بظاہر بہت آسان دکھائی پڑتا تھا —— کتنا مُشکل تھا۔

دونوں ابھی بمُشکل آدھ گھنٹہ ہی چل پائے تھے جب خان کی جہاندیدہ نظروں نے اپنے داہنی طرف سے اُٹھنے والی معمولی سی روشنی کو دیکھ کر اندازہ کر لیا۔ اُس کے چلتے قدم ساکت ہو گئے۔ شبنم بھی ٹھٹھک کر رُک گئی۔ اُس نے تربیت کے مطابق اپنے

Scanned by aazamm@yahoo.com
UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

دانستہ بھائی کے درمیان ایک خاص فاصلہ برقرار رکھا تھا اور اُسے ہدایت دے چکا تھا کہ کس طرح اُسے چلنا ہے اور خطرہ محسوس ہونے پر کس طرح خان کو متوجہ کرنا ہے۔

شبنم اُس کے نزدیک پہنچ گئی تھی ـــــ!!

"شاید فوج ہے اِس طرف" ـــــ خان نے سرگوشی کی اور اُس کا ہاتھ تھام کر مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیا۔

اُس نے دائیں طرف سے اُٹھنے والے طوفان سے بچنے کے لیے کم از کم دو میل لمبا چکر کاٹا تھا اور اندازہ کر سکتا تھا کہ شبنم کتنا تھک چکی ہو گی لیکن کیا مجال جو اُس نے ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالا ہو۔ اِس دوران دو تین مرتبہ رُک کر خان نے اُسے نزدیک آنے کا موقعہ بھی دیا تھا اور اُس کی خیریت دریافت کر چکا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ شبنم کے انکار کے باوجود اب تک دو مرتبہ اُس کے مُنہ میں گلے کی خراش دُور کرنے کے لیے میٹھے ڈراپس ڈالے تھے۔

ابھی وہ لوگ اِس سمت میں ایک گھنٹہ ہی چل پائے تھے جب دوبارہ زمین نے عابد خان کے پاؤں پکڑ لیے۔ اِس مرتبہ دائیں بائیں اطراف سے روشنیاں اُس کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر شبنم کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنا شروع کر دیا ـــــ یہ احساس اُسے فوراً ہو گیا تھا کہ دونوں بدقسمتی سے گھیرے میں آ چکے ہیں۔

عین اُن لمحات میں جب اُس نے شبنم کا ہاتھ تھام کر دوڑ لگائی تھی شبنم نے ایک ستارہ اپنے سر پر ٹوٹتا محسوس کیا۔ اُس کا دل ہی تو دہل کر رہ گیا۔ ابھی اُنہوں نے ایک آدھ فرلانگ کا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک روشنی کا ایسا ہی طوفان اُن کے سامنے اُٹھا۔

خان کے قدم وہیں جم کر رہ گئے ـــــ!!

شبنم کا بازو پکڑے وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس لمحے اُس نے خوف کے

سائے شبنم کی آنکھوں میں لہراتے دیکھ لیے تھے۔ خوفزدہ ہرنی کی طرح اُس کی آنکھیں سارے چہرے پر پھیل گئی تھیں اور خان سوچ رہا تھا کہ ان آنکھوں کی جوت کب تک جلے گی؟

اُسے اپنی طرف اِس طرح دیکھتے ہوئے پا کر شبنم پھر زبردستی مسکرا دی۔ حالات کی سنگینی کا احساس اُس کے لاشعور نے اُسے بخوبی دلا دیا تھا۔

"گھبرانا نہیں ـــــ مجھے بوجھ نہ سمجھنا۔ تمہیں میری قسم ہے طاہر! اگر مجھے چھوڑ کر زندگی بچ سکے تو نکل جانا" ـــــ شبنم کے مُنہ سے نکلے اِن الفاظ نے اُسے کاٹ کر رکھ دیا۔

○

"آؤ چلیں" ـــــ خان نے سرگوشی کی۔

وہ یہاں رُک کر بے بس پرندوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مرنے سے پہلے زندگی کے لیے ایک آخری کوشش ہی اُس کی تربیت کا بہترین اصول تھی۔ فی الوقت اُس نے ایک نزدیکی کھیت کو چھپنے کے لیے تاکا تھا۔ شبنم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے وہ اُس کھیت میں گھستا چلا گیا ـــــ اچانک ہی وہ پھر رُک گیا۔

"کھیت میں خاردار تار ـــــ مائینز (بارودی سُرنگیں)"

اُس کے ذہن نے اُسے جھنجوڑا۔ خان فوراً واپس پلٹا تاکہ دوسرے کھیت کا رُخ کرے پھر باہر قدموں کی آواز نے اُسے شبنم سمیت وہیں زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔

شاید کوئی پیٹرول پارٹی اِس طرف آ نکلی تھی ـــــ!!

اُس نے دو تین منٹ اِسی طرح لیٹے رہنے کے بعد اِس اُمید پر کہ اب وہ پیٹرول پارٹی آگے نکل چکی ہو گی۔ وہاں سے اُٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں دوبارہ بڑی احتیاط سے پاؤں دھرتے کھیت سے باہر نکل رہے تھے ـــــ!! جیسے ہی وہ کھیت سے برآمد ہوئے اچانک ہی شبنم کا پاؤں رپٹ گیا ـــــ تکلیف کی شدت سے اُس کے مُنہ سے "ہائے"

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

نکلی۔

"ہالٹ"۔۔۔ ایک للکار گونجی۔

گھبراہٹ میں شبنم نے اپنا سر اُوپر کیا اور سامنے سے ہالٹ کی آواز کے ساتھ ہی فائر کی ہوئی گولی اُس کے خوبصورت ماتھے میں جا گھسی۔ وہ تڑپ کر دوبارہ زمین پر گر پڑی!!

خان نے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی اُس کی طرف جست لگائی اور اُس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُسے اپنا دِل پہلو سے نکلتا محسوس ہوا۔ گولی شبنم کے سر میں لگی تھی اور خون ایک لمحے میں اُس کے سارے چہرے پر پھیل گیا تھا۔

"طاہر"۔۔۔ اُس نے خان کے کچھ کہنے سے پہلے بمشکل کہا ۔۔۔ "مجھے کلمہ پڑھانا"

"عابد ۔۔۔" ہاں شبنم عابد نام ہے میرا ۔۔۔ لا الٰہ ۔۔۔۔۔" اُس نے شبنم کو کلمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ شبنم نے کلمہ بدقت تمام شدید فائرنگ کی آوازوں میں پڑھا تھا۔

اُن کے چاروں طرف انگارے تڑپ رہے تھے لیکن خان اس ماحول سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اُس نے بے اختیار جھک کر اُس کا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا۔ تکلیف کی ناقابلِ بیان اذیت کے باوجود شبنم کے چہرے پہ ایک مقدس مسکراہٹ نے احاطہ کر لیا تھا۔

"عابد ۔۔۔۔ مم ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ شما کر دینا۔ میری وجہ سے ۔۔۔۔۔"

عین اُن لمحات میں اُسے عابد خان کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اپنے چہرے پر گرتے محسوس ہوئے۔ ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیلتی چلی گئی پھر یہ مسکراہٹ امر ہو گئی۔ اُس کی گردن اچانک ایک طرف ڈھلک گئی۔

خان دیوانہ وار اُسے جھنجوڑنے لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے باہر فضا میں تڑپنے والی تمام گولیاں اُس کے دِل میں گھس گئی ہوں۔

اُس کی تمام حسیات مر چکی تھیں۔ اردگرد ہونے والی فائرنگ کی آوازوں کو موت

چکی تھی۔

اُس کے کانوں میں آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ حلق میں اچانک ایک تیز کڑواہٹ گھس آئی تھی۔ ایک زہر سا اُس کے سانسوں میں پھیل رہا تھا۔ پھر اُسے یوں لگا جیسے یہ کڑواہٹ اُسکی رگ رگ میں پھیلتی چلی جا رہی ہو۔ یہ کیفیت کچھ دیر کے بعد ختم ہونے لگی۔ اُسے جلد ہی احساس ہونے لگا:

کہ ۔۔۔ زمانہ گزر گیا ہے۔ وہ آرٹسٹ لڑکی جس کی اُنگلیاں زندگی کا حسن تخلیق کرتی تھیں۔ اُس کے برش، رنگ، کینوس، سب ہی کچھ تو اُس کے چاروں اطراف بکھر گیا تھا۔ کسی ڈوگرہ سپاہی کی سٹین گن سے نکلی گولی نے خدا کی ودیعت کردہ ایک حسین زندگی کو چاٹ لیا تھا۔

۔۔۔ اِس خوبصورت لڑکی نے جسے دہلی کی ایگزیبیشن میں پہلا انعام ملا تھا جس کی تصویروں کو مسز ٹیگور نے "لافانی شاہکار" کہا تھا۔ جس نے زندگی کے خوبصورت ترین رنگ وقت کی کینوس پر بکھیرے تھے۔ بڑی آسانی سے بغیر کوئی احتجاج کیے جان دے دی تھی ۔۔۔!!

اُس نے ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں کے پس منظر میں خدائے رقص سے زندگی کی دکھشا مانگتی پاروتی بنائی تھی۔ اُس کی بنائی ہوئی پاروتی نے زندگی کی ترشنا کے لیے امرت مانگا تھا۔ اُس کی تصویر میں رقص کرتی پاروتی نے زندگی کے زہر کو رقص میں رچا لیا تھا۔

خان نے اُس "شاہکار" کو دیکھ کر کہا تھا ۔۔۔ "رما یہ زندگی کا زہر ہے۔ زندگی امرت کبھی نہیں ہوتی۔"

تب آرٹسٹ لڑکی نے مسکرا کر کہا تھا ۔۔۔ "آپ اب بھی یہ بات سوچتے ہیں۔ مجھے پانے کے بعد بھی۔"

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

پھر اُس کی آنکھیں اچانک ہی جھلکنے لگیں۔ اُس کے گرداگرد سرسراتی ہوا نے سسکیاں بھرنی شروع کر دی تھیں۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور زندگی اِس گھور اندھیرے میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔

تب کسی نامحسوس عمل کے تابع وہ انتہائی درد اور صدمے کی کیفیت میں جھکا اور اُس کے ہونٹ شبنم کے خون سے رنگے ماتھے پر جم گئے۔

اُس کی شبنم نے تپش کا ایک جھونکا بھی تو برداشت نہیں کیا تھا ——!!

کتنی آسانی سے وہ بکھر گئی تھی ——!!

Scanned by azamm@UrduFanz.com

Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com

شہید کا پیام

پسلیوں پر لگنے والی ایک زوردار ٹھوکر نے اُسے شبنم سے الگ کیا اور —— سرحدی پوسٹ سے پٹھانکوٹ چھاؤنی تک کا سفر اُس نے عالمِ بے خودی میں طے کیا۔

—— اِس دوران اُن لوگوں نے وحشیوں کی طرح اُسے پیٹ ڈالا: وہ بار بار اُس سے ایک ہی سوال کر رہے تھے۔ وہ کون ہے ؟

یہ لڑکی جو مر گئی وہ کون تھی ؟

خان اُن کے سوالات پر مار کھاتے کھاتے کبھی سوال کرنے والے کی طرف دیکھ لیتا اور بس —— چھاؤنی میں ساری رات اُسے بیدردی سے پیٹنے کے بعد وہ لوگ کام کی صرف ایک ہی بات جان سکے تھے: "کہ جس شخص کو اُنہوں نے گرفتار کیا ہے اُس کا نام خان ہے —— صرف خان!"

ہفتہ بھر اپنے سارے گُر آزمانے کے بعد آرمی والوں نے اُسے سول انٹیلی جنس کو سونپ دیا۔ اِس دوران گو کہ اُس نے ہر ممکنہ اور انسانی اختیار میں موجود جسمانی عذاب برداشت کیا تھا —— لیکن وہ مطمئن تھا۔ اس اذیت ناکی کے لیے وہ ذہنی طور پر ایک لمبے عرصے سے تیاری کر رہا تھا —— !! لیکن —— جس روحانی کرب نے اُسے اِس دوران گھیرے رکھا اُس کا ایک ایک لمحہ عابد خان پر قیامت بن کر ٹوٹ رہا تھا۔

○

aazzamm@yahoo.com

آرمی انٹیلی جنس سے سول انٹیلی جنس تک کا سفر بڑا طویل اور جان لیوا تھا۔ سچی بات تو یہ کہ پہلے پندرہ بیس روز کی مار ہی نے اُسے اب جسمانی اذیتوں سے بے نیاز کر دیا تھا؛ اُس کے جسم پر کوئی ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں بچی تھی جسے اُن لوگوں نے نہ نوچ ڈالا ہو۔

آٹھ مہینے تک اُسے بھارت کے قریباً ہر بڑے تفتیشی مرکز میں لے جایا گیا، لیکن ہر جگہ وہ ناقابلِ تسخیر اور چیلنج بنا رہا۔ بڑے بڑے نامور تفتیشی افسران نے اُسے چیلنج جان کر قبول کیا لیکن آخر اپنی ہار مان کر بیٹھ رہے۔

آٹھ مہینے بعد بالآخر اُسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ جیل میں اُسے ہر ممکن جسمانی اور ذہنی عذاب دیا گیا ـــــ لیکن اُس کا عزم ناقابلِ تسخیر رہا! جیل میں پہنچنے تک اُس پر ایک اور بڑی قیامت ٹوٹ چکی تھی:

پاکستان دولخت ہونے کا سانحہ اُسے توڑ چکا تھا! جس روز اُس نے بھارت کے ایک تفتیشی مرکز میں یہ خبر ایک انٹیلی جنس افسر کی زبانی سُنی تو وہ چکرا کر رہ گیا، لیکن اُس نے افسر کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ پھر اُس کا حوصلہ توڑنے کے لیے اُسے ریڈیو کے ذریعے پاکستان اور دُنیا کے دوسرے بڑے ریڈیو سٹیشنوں سے بھی یہ خبر سُنائی گئی۔

یہ سانحہ بھی اُس نے خود پر جھیلا لیکن اُس کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آسکی۔ اُس نے کبھی بھارتی سیکورٹی کو خوش ہونے کا موقع نہ دیا۔

جیل میں آکر اُسکی جسمانی حالت کو قدرے سکون ملا تھا ـــــ اُسے جیل کے سب سے خطرناک احاطے پھانسی کوٹھڑیوں میں خطرناک قیدی جان کر رکھا گیا تھا۔ لیکن پولیس کے برعکس جیل کے عملے اور وہاں موجود قیدیوں نے اُس کی بہادری کو خراجِ تحسین پیش کیا اور انٹیلی جنس کی ہدایات کے بالکل برعکس اُسے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔

انٹیلی جنس والوں نے آخر میں اُس سے پھانسی کا ڈرامہ بھی کھیلا لیکن وہ بھی ناکام رہا۔ عابد خان کا لکھا ہوا آخری اور طویل خط اُس کے ہیڈ کوارٹر کو موصول ہو چکا تھا۔

اُس کی اس طرح گرفتاری نے بہت سے دِلوں کو خون کے آنسو رُلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ اُس کی لمبی تفتیش پر بھی کُڑھتے رہے۔ دراصل ذہنی طور پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سانحے نے بھی ان لوگوں کو روحانی موت سے دوچار کر رکھا تھا۔

○

خان کے انسٹرکٹر نے اُسے اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھلایا تھا۔ وہ اُس گھڑی کا بہرحال مُنتظر تھا؛ جب عابد خان کو جیل میں لایا جاتا اور وہاں سے اُسے عدالت میں پیش کیا جاتا۔

اُس کی ریٹائرمنٹ میں بمشکل تین چار ماہ باقی تھے جب اُسے یہ خوشخبری بھی مل گئی ـــــ وہ اپنے دل پر موجود ایک بھاری بوجھ کو ہٹانے کے لیے خان کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی ایک منصوبہ اُسے فرار کروانے کا اپنے اعلیٰ حکام کو پیش کر چکا تھا۔

اُس کی مساعی رنگ لائیں بالآخر اُس کے منصوبے پر صاد کر دیا گیا اور ایک روز جب خان اپنی تاریخ بھگتنے پٹھانکوٹ کچہری جا رہا تھا تو اُسے ایک خفیہ پیغام تیار رہنے کا مل گیا: "اُس کے فرار کے لیے ـــــ بالآخر اُس کی چوتھی تاریخ پیشی مقرر کی گئی تھی۔"

○

اُس پیشی پر جب وہ عدالت میں پہنچا تو نگرانی کے لیے حسبِ معمول پولیس کا ایک حوالدار اور ایک سپاہی اُس کے ساتھ موجود تھے۔ تاریخ بھگتنے کے بعد جب وہ لوگ احاطہ کچہری سے باہر آرہے تھے تو اچانک ہی ایک سکھ پولیس والوں سے ٹکرا گیا۔ اُسے اس "بیچارے مسلمان قیدی" پر بہت ترس آرہا تھا۔ یہ منوہر لال تھا۔ خان نے پہچان لیا۔

پولیس گارد والے ایسے "خدا خوفی" کرنے والوں کے مُنتظر ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ عموماً کچہریوں میں غیر مُلکی قیدیوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے اور اُن کی کچھ نقد امداد بھی کر

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

دیا کرتے تھے۔ اِن لوگوں کی وجہ سے گارد والوں کو بھی مُفت کی روٹی کھانے کو مل جاتی تھی ورنہ تو اُنہیں دوپہر کا کھانا بھی اپنی جیب سے کھانا پڑتا تھا۔ جو اُن کے اصولوں کے بالکل ہی خلاف تھا۔

"آئیے آپ کو کھانا کھلائیں"۔۔۔ اُس سکھ نے پولیس والوں کو آفر دی اور وہ فوراً مان گئے۔

"مَیں بھی اُدھر قید رہا ہوں۔ میری بھی لوگ اسی طرح مدد کیا کرتے تھے۔ مہاراج جی! کچھ بھی ہو۔ مَیں تو اِن لوگوں کا احسان کبھی نہیں بُھلا سکتا۔" اُس نے ایک غیر آباد سے ہوٹل کے کیبن میں اُن لوگوں کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

کھانا آنے تک سکھ نے اپنی دھوتی کی "ڈب" سے ایک بوتل بھی نکال لی تھی۔ اور ہوٹل کے گلاسوں ہی میں چار آدھے آدھے گلاس تیار کر کے سامنے رکھ لیے تھے۔ کیبن کا ہارڈ بورڈ کا بنا دروازہ بند تھا۔ ملازم اُن کے سامنے کھانا رکھ کر چلا گیا تھا۔ دونوں گارد کے مُلازم شراب کا پیگ ایک گھونٹ میں ہی ڈکار گئے تھے جبکہ سکھ اور خان نے صرف گلاسوں کو چھونے پر ہی اکتفا کیا۔

شراب اُن کے معدے میں پہنچنے کی دیر تھی جب دونوں کو خان نے نیم مُردہ سے ہو کر وہیں میز پر گرتے دیکھا۔ اُنہیں آواز نکالنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ اُن کے ڈھیر ہوتے ہی سکھ نے بڑی پھُرتی سے اپنی جیب سے ایک پلاس نکالا اور مُشکل ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی خان کی ہتھکڑی اور بیڑیاں کٹ کر زمین پر گر پڑی تھیں۔

دوسرے سمت والی ہارڈ بورڈ کی دیوار اُس نے اتنی پھُرتی اور تیزی سے اُکھاڑی تھی کہ خود خان بھی حیران رہ گیا۔

"چلو"۔۔۔ اُس نے خان کا بازو پکڑا۔

دونوں دس منٹ بعد وہاں سے غائب ہو چکے تھے اور جب تک ہوٹل والوں کو

بے ہوش سپاہیوں کا سُراغ ملتا دونوں پٹھانکوٹ سے نکل چکے تھے۔

○

دونوں منوہر لال ہی کی بنائی ہوئی ایک "آرام گاہ" میں فروکش تھے۔

منوہر لال کو خان کی کہانی نہیں بتائی گئی تھی لیکن وہ اس کے کارناموں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خان نے کتنی ہی مرتبہ اپنی جان پر کھیل کر بہت اہم راز اس لیے حاصل کیے تھے کہ اُس کا پاکستان سلامت رہے۔ اُس نے منوہر لال کو بتایا تھا کہ اُس کا وجود سارے پاکستان پر پھیلا ہُوا ہے۔۔۔! آج وہ دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔۔۔!!

منوہر لال محسوس کر سکتا تھا کہ عابد خان جو بظاہر زندہ نظر آ رہا ہے۔۔۔ دراصل اندر سے مر چکا ہے۔!!

دوسری طرف خان بھی اُس کا دُکھ جان گیا تھا۔ اُس نے اِس پناہ گاہ میں تین روز گزارنے کے بعد یہ محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان کے دولخت ہونے کے سانحے نے منوہر لال کی رگوں سے خون نچوڑ کر اُسے نیم مردہ کر دیا ہے۔۔۔!!

منوہر لال نے اُسے یہاں اس لیے رکھا ہُوا تھا کہ خان کم از کم جسمانی طور پر سفر کے قابل ہو جائے۔۔۔!! لیکن خان کے لیے اَب یہاں ایک ایک سانس بوجھل ہو رہی تھی۔۔۔!

اُسے اِس زمین پر ہر طرف شبنم کے مقدّس خون کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔۔۔!

وہ زہر باد جسے اُس نے جیل میں اپنے اندر دبائے رکھا تھا اب پھوٹ پڑا تھا اور خان کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔

شبنم مر کر اُس کے اندر زندہ ہو گئی تھی۔

اُس روز جب منوہر لال اُس کے سامنے بھارت کا نقشہ پھیلائے سرحد عبور کرنے سے متعلق گفتگو کر رہا تھا تو خان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس لمحے اُڑ کر اس نقشے پر پھیلی

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

تمام لکیریں پھلانگ جائے۔

"منوہرلال! میں زندہ تو اب بھی نہیں ہوں۔ لیکن ایک ہی خواہش ہے دل میں کہ آخری سانس اپنی زمین پر نکلے!"

"چپ کرو خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ تم تو مجھے بھی مار ڈالو گے۔ میرے دوست میں مر گیا تو اور بات ہے اپنی زندگی میں انشاء اللہ تمہیں اپنے وطن تک ضرور پہنچاؤں گا۔ اور ہاں ـــــ اب کے بعد مجھے منوہرلال کبھی نہ کہنا۔ اب جب ہم آخری مرتبہ مل رہے ہیں تو مجھے اپنے چہرے سے نقاب اُتار دینے دو ـــــ" میرا نام شاہد ہے ـــــ شاہد علی ـــــ"

"شاہد میرے دوست! کیا منہ لے کر جاؤں گا اب پاکستان میں ـــــ میرے پاس زندہ رہنے کا اب کیا ڈھکوسلا باقی رہ گیا ہے ـــــ کچھ بھی تو نہیں۔ مجھ سے تو سب ہی کچھ چھن گیا ہے ـــــ اور پھر اب مقصد ہی کیا رہ گیا ہے زندگی میں ـــــ جس کام کو آئے تھے وہ تو کر نہ سکے۔!"

"نہیں عابد ـــــ" شاہد علی نے تڑپ کر اُس کی بات کاٹ دی ـــــ" خدا کی قسم تم نے اپنا کام مکمل اور بساط سے بڑھ کر کیا ـــــ خیر چھوڑو ان باتوں کو ـــــ ہم نے ابھی تک تمہارے دوست کمار کو اپنے قبضے میں رکھا ہے ـــــ خاصا کام کا آدمی ہے۔ تین چار بڑے اچھے کام کر دیئے ہیں۔ اس مرتبہ اُس نے بضد ہو کر کہا تھا کہ پنڈت جی سے ملاقات ضرور ہونی چاہیئے ـــــ اور میرے خیال سے اِس مرتبہ اُس سے ملاقات کر ہی لیں ـــــ عابد خان ہم نے سرحد کمار کی مدد سے اور راجستھان سیکٹر سے عبور کرنی ہے ـــــ" اُس نے گفتگو کا رُخ حقائق کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی" ـــــ عابد خان نے کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

تیسرے روز جب دونوں اُس محفوظ پناہ گاہ سے نکل کر ابوہر کی طرف جا رہے تھے۔ تو خود خان کو اپنی شکل شیشے میں دیکھ کر عابد خان ہونے کا یقین نہیں ہو رہا تھا ـــــ اُس کا حلیہ شاہد نے اس کامیابی سے بدلا تھا کہ خود وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔

ابوہر تک کا سفر اُنہوں نے پسنجر ٹرین سے کیا اور بحفاظت وہاں تک پہنچ گئے۔

خان کو ایک مرتبہ پھر تمام بھولی بسری کہانیاں یاد آ گئی تھیں۔ اُس نے اِس سرحدی علاقے میں زندگی اور موت کا جو طویل معرکہ لڑا تھا اُس کی ایک ایک تفصیل زندہ ہو کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ـــــ سوچنے لگا۔ آج پھر اُس محاذ پر وہ زندگی سے دو دو ہاتھ کرنے جا رہا ہے کیا آج بھی فتح اس کی ہو گی؟ ـــــ اس خیال سے ـــــ اُسے ایک مرتبہ تو جھرجھری سی آ گئی۔

شاہد علی نے سکھ کا روپ دھار رکھا تھا اور پال سنگھ کے نام سے اُس کے ہمرکاب تھا۔ اُس نے روانگی سے پہلے ہی ایک لوڈڈ پستول اُس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ دونوں اسٹیشن کے باہر بنے ایک چائے کے سٹال پر بیٹھے تھے۔

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیئے" ـــــ خان نے چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہاں! ہاں ضرور" ـــــ پال سنگھ بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

لاری اڈے تک کا سفر اُنہوں نے آبادی سے بچ بچا کر ہی طے کیا تھا اور راستے میں کسی بھی چیکنگ پوسٹ سے اُن کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مکسر کی طرف جانے والی لاری کے چلنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے اور بھارت میں پندرہ بیس منٹوں کا مطلب خان بخوبی سمجھ چکا تھا! وہ جانتا تھا جب تک لاری مکمل ٹک نہ ہو جائے چلے گی نہیں۔ اس لیے دو ٹکٹ خرید کر دونوں بکنگ والی کھڑکی کے بالکل سامنے چائے کے ایک

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

کھوکھے میں آن بیٹھے تھے۔

خان کو اصولی طور پر اس وقت کھانا کھانا چاہیئے تھا لیکن اُس کی تو بھوک کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اُس کے ساتھی کا بھی یہی عالم تھا لیکن خان نے احتیاطاً چائے کے ساتھ کچھ اُبلے ہوئے انڈے منگوا لیے تھے۔ دونوں نے زبردستی چائے کے ساتھ انڈے زہر مار کیے تھے۔

بس روانہ ہونے سے بمشکل دو تین منٹ پہلے ہی وہ اُس میں سوار ہوئے۔ اس دوران خان نے اُس گول آنکھوں اور کلین شیو والے درمیانی عمر کے ہندو کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ جو اُن کے برابر والی سیٹ کے ایک کونے میں آ کر بیٹھا تھا۔ خان نے جان بوجھ کر پال سنگھ کو کھڑکی کی طرف بٹھا دیا تھا۔ اور خود سیٹ کے کونے پر بیٹھا تھا تاکہ کلین شیو والے ہندو پال سنگھ سے گفتگو کا موقعہ ہی نہ مل سکے اور اگر اُس کی "حس سیکورٹی" پھڑکنے بھی لگے تو خان خود اُسے مطمئن کر دے ـــــ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے جوبن پر لوٹ آیا تھا۔

○

"کیا شبھ نام ہے آپ کا؟" ـــــ بس چلنے کے بمشکل پانچ چھ منٹ بعد ہی اُس سیکورٹی والے ہندو نے اُس سے سوال داغ دیا۔

"شریمان جی! کیا میں شکل سے پاگل لگتا ہوں؟" خان نے اُس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اُلٹا سوال داغ کر اُسے بوکھلا دیا۔

"مم میں سمجھا نہیں" ـــــ سیکورٹی والا واقعی بوکھلا گیا تھا کیونکہ خان نے یہ بات اتنے زور سے کہی تھی کہ اُس کے ساتھ والی تین چار سواریاں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ سب مسکراتے ہوئے خان اور سیکورٹی والے کو گھور رہے تھے اور سیکورٹی والا ہندو لالہ خوامخواہ خود کو شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر وہ سنبھل گیا۔

"آپ تو بُرا مان گئے۔" اُس نے سنبھالا لے کر خان سے بڑی شائستگی سے کہا "میں

نے سوچا سفر کاٹنے کے لیے کسی سے باتیں ہی کرتا جاؤں۔"

"پچھلے ایک ہفتے سے دس انٹرویو دے چکا ہوں۔ ہر کوئی یہی سوال پوچھتا ہے۔ پھر دوسرے سوال اور آخر میں "شما کیجیے ہمارے پاس کوئی جگہ آپ کے لائق نہیں" کہہ کر چلتا کر دیتا ہے۔ میرا تو مہاراج جی! اب یہ جی چاہتا ہے کہ ایسا سوال پوچھنے والے کا گلہ ہی گھونٹ دوں۔" یہ فقرہ اُس نے ہندو لالہ کی طرف جھکتے ہوئے بڑی آہستگی سے کہا۔

اُس کا انداز گفتگو ایسا ہی تھا کہ وہ سیکورٹی والے کو حالات سے بری طرح فرسٹریٹڈ نظر آیا۔ اُسے اب لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ خان اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

"اب یہی دیکھ لو۔ کل ایک کلرک کی آسامی کے لیے درخواست گزاری تھی اور آج دہلی سے مکر جا رہا ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ بھرتی کرنے والے افسر کی نھیال یہاں ہے۔ اُس کی بیوی کا ایک رشتہ دار ڈھونڈا ہے۔ سالا! دیکھوں گا اپنی بیوی کا حکم کیسے ٹالے گا۔"

خان بولتا چلا گیا۔ سیکورٹی والے کو اُس سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔

اُس نے اپنی گفتگو میں دو چار اور سواریوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ پھر وہ سب تو آپس میں بحث کرنے اور حکومت کو باجماعت گالیاں دینے میں مصروف ہو گئے اور خان منہ پھلا کر سامنے دیکھنے لگا۔ سیکورٹی والے کو دوسرے لوگوں سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔

پال سنگھ "بظاہر تو اس گفتگو سے بالکل لاتعلق کھڑکی سے باہر اندھیرے کی چادر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن درحقیقت اُس کے کان اُسی طرف لگے ہوئے تھے۔ اس صورت حال سے وہ خاصا محظوظ ہو رہا تھا اور دل ہی دل میں خان کو اب تک کئی مرتبہ داد دے چکا تھا۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ واقعی اُس کا ساتھی کوئی غیر معمولی صلاحیت کا مالک ہے۔

خدا جانے سیکورٹی والے نے جانا کہاں تھا لیکن مکسر شہر میں لاری داخل ہونے سے بہت پہلے ہی وہ ایک گاؤں کے نزدیک اُتر گیا۔

Scanned by azam@ @UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

"ونڈرفل" خان کا ساتھی زیرِلب مسکرایا۔

"شکریہ" ــــ خان نے اُس کی داد قبول کرتے ہوئے کہا۔

○

مکسر بس سٹاپ سے پہلے ہی دونوں اُتر گئے۔ وہ کسی مزید تفتیش کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ اُن کے استقبال کے لیے لاری اڈے پر کوئی موجود نہ ہو۔ جیسے سے لدھیانہ میں گفتگو کے بعد اُسے "پال سنگھ" کی زبانی حالات کی سنگینی کا احساس ہُوا تھا وہ حد سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

اس علاقے میں ایک لمبی لڑائی حالات سے لڑنے کے بعد اُسے کم از کم اِس بات کا علم ضرور ہو گیا تھا کہ کون سے راستوں پر عموماً فوج زیادہ تر مورچہ بند رہتی تھی۔ اُسے اپنی "نیوی گیشن" پر مکمل اعتماد تھا۔ راستے ہاتھ کی لکیروں کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے پھیلتے چلے گئے تھے۔ وہ ایک مرتبہ جس راستے سے گزر جاتا ناممکن تھا کہ دوبارہ اُسے بھلا سکتا۔ اُس نے بلا کی قوتِ اندازہ پائی تھی۔

رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا جب وہ پال سنگھ کو ٹیوب ویل کے نزدیکی کھیت میں چھپا کر خود اُس دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اُس نے اِس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے لیکن وہ کون ہے؟ اِس کا اندازہ ابھی اُسے نہیں تھا۔

دستک دینے کا انداز خاصا شریفانہ تھا۔ اندر موجود شخص نے دروازہ کھولنے سے پہلے لالٹین روشن کرنا ضروری سمجھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اُس نے خدا کا شکر گزار کر اُس کا سامنا کمار ہی سے ہوا تھا۔ اتنی رات گئے کمار اچانک پنڈت جی مہاراج کو سامنے دیکھ کر پہلے تو گڑبڑا گیا تھا لیکن جلد ہی وہ کھِل اٹھا۔

"مہاراج جی!" کہہ کر وہ بے اختیار خان سے لپٹ گیا ــــ "آپ نے تو داس

کو بھلا ہی دیا تھا۔ کوئی خیر خبر ہی نہ دی۔"

"ہم کسی دوست کو نہیں بھلایا کرتے کمار جی! یورپ سے جیسے ہی واپس آئے ملنے آ گئے۔"

"میرا سوبھاگیہ ہے مہاراج" اُس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے دروازہ کھولا۔

پانچ منٹ بعد ہی خان اُس کا تعارف ایک بڑے سمگلر کی حیثیت سے "پال سنگھ" سے کروا چکا تھا۔ خان نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ سردار جی لاکھوں روپے کی ہُنڈی لے کر سرحد پار جائیں گے اور اُدھر سے مال اِدھر آئے گا۔ "سردار جی" کو وہ تعارف کے بعد وہیں لے آیا تھا۔ خان نے احتیاطاً سو سو کے پانچ نوٹ کمار کو آتے ہی تھما دیئے تھے۔ کیونکہ سردار جی نے ابھی اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارنا تھا۔

کمار کی مٹھی گرم ہو چکی تھی۔ نوٹ خان کی مٹھی سے کمار کی جیب میں اور کمار کا دِل خان کی مٹھی میں آ چکا تھا۔ وہ تو اُسی لمحے سردار صاحب کی سیوا کے لیے کچھ "جل بھوجن" کا بندوبست کرنے جا رہا تھا لیکن خان نے منع کر دیا۔ اُس نے کمار سے کہا تھا کہ وہ اِن دونوں کی آمد سے کسی کو گاؤں میں مطلع بھی نہ کرے۔ کمار کے بستر کی چادر اُس نے زمین پر بچھی خشک گھاس پر بچھا لی اور دونوں اُس پر لیٹ گئے۔

رات کے آخری پہر دونوں کی چند منٹ کے لیے آنکھ لگ گئی لیکن پو پھٹنے سے پہلے ہی وہ بیدار ہو گئے۔ کمار ابھی تک گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ خان نے اُسے جگایا اور کمار تھوڑی ہی دیر بعد اُن کے لیے گھر سے بڑا تگڑا ناشتہ بنا کر لے آیا۔ شاہد علی کی زبانی اِس بات کا علم خان کو ہو چکا تھا کہ وہ ابوہر کے تمام سرحدی علاقے سے بخوبی واقف ہے۔ خان جان سکتا تھا کہ یہ واقفیت کس نوعیت کی ہو گی۔ کچھ بھی تھا اُسے کمار سے ایک اہم کام لینا تھا۔ گو کہ اُس کے ساتھی پہلے بھی اُس کے حوالے سے کمار سے کام لے چکے تھے لیکن آج کی مہم بہت اہم تھی۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

○

انہوں نے اپنے سفر کا آغاز علی الصباح ہی کیا۔ دونوں کمار کی ہمراہی میں ابوہر کے ایک نواحی قصبے "گیدڑ بہا" پہنچ چکے تھے۔ اسی علاقے کو کمار نے سرحد عبور کروانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ جب وہ دونوں کو شہر سے دیہاتی علاقے کی طرف لے جا رہا تھا تو دونوں محسوس کر رہے تھے کہ ان کا واسطہ ایک انتہائی محتاط اور ہوشیار آدمی سے ہے۔ دوسری طرف کمار یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پنڈت جی کے سامنے آج اپنی مکمل صلاحیتوں کا مظاہرہ ضرور کر کے دکھائے گا۔

وہ دونوں کو ایک سرحدی گاؤں میں لے آیا تھا ـــــ جس گھر میں انہوں نے قیام کیا تھا وہ کمار کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق اس کی بہن کا گھر تھا۔ دونوں کو اپنے ساتھ لے کر مکان کی چھت پر آ گیا تھا۔ اس گھر کی چھت سے انگلی کے اشارے سے وہ دونوں کو پاکستانی سرحد دکھا رہا تھا۔ سرحد یہاں سے دو ڈھائی فرلانگ دور تھی۔ خان نے اسے سمجھایا تھا کہ اس نے "پال سنگھ" کو سرحد پار لے جانا ہے جہاں سے پال سنگھ نے تو آگے نکل جانا تھا لیکن کمار نے مال کا نمونہ لے کر واپس آ جانا تھا۔ اس ڈرامے کو منطقی انجام تک پہنچانے کا پورا بندوبست دوسری طرف موجود تھا۔ جیسے ہی پال سنگھ سرحد پار پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرتا۔ سمگلروں کے بھیس میں موجود اس کے ساتھی کمار کے لیے افیون کا بندوبست کر دیتے۔

اس طرح سمگلنگ کا یہ ڈرامہ حقیقت کا روپ دھار جاتا۔

○

اس گاؤں میں وہ دوپہر ڈھلنے کے بعد پہنچے تھے۔ کمار کی بہن شاید پہلے سے تربیت یافتہ تھی اور کمار کے مہمانوں کو بھی پہلے سے جانتی تھی۔ اس کا رویہ بالکل اجنبیوں والا نہیں تھا اور وہ اپنے کام کی خاصی ماہر نظر آتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کمار کی بہن کا گھر کمار کا کوئی خفیہ اڈہ تھا۔ خان نے احتیاطاً اسے بچوں کی مٹھائی کے لیے دو سو روپے دیئے تھے جس کے بعد سے رکمنی کا رویہ پہلے سے بھی زیادہ شریفانہ اور ہمدردانہ ہو گیا تھا۔

"پنڈت جی! آج سے دو ڈھائی سال پہلے میں نے یہاں بہت کام کیا ہے۔ وہ سامنے والی پوسٹ ہے ناں!" اس نے انگلی سے گاؤں کے باہر بنی بارڈر سیکورٹی فورس کی ایک پوسٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے بمشکل پچاس گز دور سے ہم مال اٹھا کر لایا کرتے تھے۔ جب سے اوتار سنگھ کو گولی لگی میرا تو اس طرف آنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن آپ نے تو مہاراج مجھے پھر سے جوان کر دیا ہے۔"

"کمار جی! ہم تمہاری قسمت بنا دیں گے ـــــ تمہارے سارے خواب پورے ہو جائیں گے" ـــــ خان نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

"میرے خیال سے پہلے پہر سرحد عبور کریں گے۔" کمار نے تجویز پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔" خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

رکمنی نے ان کے لیے بڑا پرتکلف کھانا تیار کیا تھا لیکن کمار کے سوا کسی نے بھی کھانا رغبت سے نہیں کھایا تھا۔ اس بات کا تو کمار کو علم ہی تھا کہ پنڈت جی مہاراج ویشنو ہیں اور ان کو سبزی دال کے علاوہ اور کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔

گاؤں پر شام ڈھلنے کے ساتھ ہی نحوست منڈلانے لگی تھی۔ مشرق کی سمت سے ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے اس طرف آ رہے تھے ـــــ گو کہ ہوا چلنے سے ٹھنڈک میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن خان کو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ ہوائیں اس کے ملک سے اس سمت کو آ رہی تھیں۔ وہ بڑا مودب ہو کر ان ہواؤں کے دامن سے لپٹی ان یادوں کا استقبال کر رہا تھا جو اسے کشاں کشاں اپنے ماضی کی طرف کھینچے لے جا رہی تھیں۔ اسے

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

اپنا وطن، اپنا شہر اور پھر اپنا گھر یاد آگیا اُسے یاد آگیا کہ وہ کسی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ تین بہنوں کا اکیلا بھائی۔ جانے اُس کی ماں اور بہنیں کس حال میں ہوں گی؟ باپ تو بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب وہی تو تھا اُن کا خدا کے سوا روئے زمین پر واحد سہارا، اور آج وہ اُنہیں بے سہارا چھوڑ کر یہاں زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہا تھا۔

لیکن نہیں ——— اُس نے سوچا۔ اُس زمین پر جس کو چھُو کر یہ ہوائیں اُس تک پہنچ رہی ہیں۔ ایسی کروڑوں مائیں اور بہنیں اور بھی تو موجود ہیں۔ اُن سے بھی تو اُس کا کوئی رشتہ ہے؟ اسی رشتے کے تقدس کی لاج رکھنے کے لیے تو وہ یہاں آیا تھا۔ اُس نے سوچا شاہد علی بھی تو کسی ایسی ہی ماں کا بیٹا، کسی ایسی ہی بہن کا بھائی ہو گا۔ وہ بھی تو کسی کے جگر کے ٹکڑے ہوں گے جن سے اُس کی ملاقات ہوتی رہتی ہو گی۔ جانے وہ کب سے اپنے پیاروں کو اکیلا چھوڑ کر یہاں اپنی پہچان بدل کر اپنے وطن کے لیے جی رہے تھے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ جب تینوں اپنے گھر سے باہر نکلے۔

گاؤں پر سکوت طاری تھا۔ یہ بھی خدا کا شکر تھا کہ یہاں کُتے نہیں تھے۔ ورنہ اُن کے لیے اور مصیبت پیدا ہو جاتی۔ ریوالور خان نے اپنا پاس رکھا ہُوا تھا۔ دونوں کے پیچھے کچھ فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا۔ سب سے آگے کمار تھا اور اُس کے پیچھے پال سنگھ۔ دونوں نے یہاں سے سرحد تک کا راستہ گویا حفظ کر لیا تھا۔ کمار نے اُنہیں اردگرد کی تفصیلات اتنی توجہ سے سنائی تھیں کہ اب دونوں اُس کی مدد کے بغیر بھی یہ ڈھائی فرلانگ کا فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ لیکن اس ڈرامے میں مرکزی کردار چونکہ کمار ہی نے ادا کرنا تھا اس لیے اُس کا ساتھ رکھنا بھی ضروری تھا۔

کمار بظاہر اتنا لاپرواہی سے چلا جا رہا تھا جیسے بین الاقوامی سرحد کے بجائے بین الصوبائی سرحد عبور کرنے جا رہا ہو۔ گاؤں سے قریبی کھیتوں تک کا فاصلہ بخیر و خوبی کٹ گیا تھا۔ کھیتوں میں وہ پھُونک پھُونک کر قدم دھرتے ہوئے منزل کی جانب گامزن تھے کہ اچانک ہی فضا "ہالٹ" ——— "ہالٹ" کی آوازوں سے دہل گئی۔

تینوں کھیتوں کے سرکنڈوں کے سلسلے میں داخل ہو رہے تھے۔ خان کی چھٹی حس نے فوراً ہی احساس دلا دیا تھا کہ وہ کسی "ناکے" میں پھنس گئے ہیں۔ ایسے "ناکے" عموماً سرحدی محافظ سمگلروں یا جاسوسوں کی متوقع آمد کی اطلاعات کے پیشِ نظر لگایا کرتے تھے۔ خان کو یہ علم نہیں تھا کہ یہ سرحد کتنی زیادہ مصروف رہتی ہے؛ وہ لوگ تو سب کچھ اندازے سے کر رہے تھے۔

کمار اور شاہد علی دونوں اچانک ہی واپس پلٹے تھے۔ خان کے ہاتھ کی انگلی ریوالور کے ٹریگر پر جم کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اگلا کوئی قدم اُٹھاتا اچانک ہی "تڑتڑ" کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ شاید "ناکے" والوں نے احساس کر لیا تھا کہ اُن کے شکار بھاگنے کی فکر میں ہیں۔ اُس نے کمار کو گھوم کر گرتے دیکھا اس کے ساتھ ہی اُس کی چیخ بلند ہوئی۔ اُسے تین چار گولیاں اکٹھی ہی لگی تھیں۔ یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں تھی کہ "پال سنگھ" ابھی تک محفوظ تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ بوکھلا کر کوئی اور قدم اُٹھائے خان اپنی جگہ سے اُچھلا اور اُس پہ آن پڑا، کیونکہ دوسری طرف سے اندھا دُھند فائرنگ ہو رہی تھی اور اگر شاہد علی کو خان زمین پر گرانے میں چند لمحات کی بھی تاخیر کر دیتا تو یہاں ایک کی بجائے دو لاشیں پڑی ہوتیں ——— اس بات کا تو اُسے یقین تھا کہ کمار مر چکا ہے کیونکہ ایک چیخ کے بعد اُس کا زندہ بچ رہنا ناممکن تھا۔

"ہوش کرو" ——— خان نے اُس کو گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ اور شاہد علی کے حواس واقعی اس وارننگ سے واپس لوٹ آئے۔

Scanned by aazamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

"میرے پیچھے پیچھے آؤ" خان نے اُسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

دونوں کہنیوں کے بل رینگ رہے تھے جب خان سے بمشکل چند گز کے فاصلے پر ٹارچ روشن ہوئی۔ ٹارچ روشن کرنے والے اور خان، دونوں کی اُنگلیاں ایک ساتھ حرکت میں آئی تھیں۔ اُدھر ٹارچ روشن ہوئی اور اِدھر اُس کے ریوالور نے شعلہ اُگلا۔ گولی ٹارچ کے شیشے کو توڑتی ہوئی ٹارچ بردار کو لگی تھی کیونکہ اُس نے بڑی زوردار آواز میں "ہائے" کہا تھا۔

اِس کے ساتھ ہی اُسے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اُن کے نزدیک موجود "ناکہ بردار" اچانک ہی بوکھلا گئے تھے خان جانتا تھا کہ اب کم از کم کوئی اُن کے نزدیک آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ وہ لوگ یا تو اُنہیں گھیرے میں لے کر مارنے کی کوشش کریں گے یا پھر گرفتار کرنے کی! اُس نے گردن موڑ کر شاہد علی کی طرف دیکھا اور اُسے اشارہ کر کے کہنیوں ہی کے بل واپس گھسٹنا شروع کر دیا۔ یہی عمل جواب میں شاہد علی نے دُہرایا۔

کمار کے بے حس و حرکت جسم کے پاس وہ ایک لمحے کے لیے رُکا۔ خان نے اُس کی نبضیں ٹٹولیں پھر دِل کی دھڑکنیں سُننا چاہیں لیکن اُس کا "دوست" مر چُکا تھا۔ شاید قدرت نے اُن کے لیے اُس سے اتنا ہی کام لینا تھا۔

خان کے دِل میں اُس کے لیے ہمدردی کے جذبات تھوڑی دیر کے لیے ضرور پیدا ہوئے لیکن جلد ہی اُسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو گیا اور اُس نے واپس پلٹنا شروع کر دیا۔

فائرنگ کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ خان نے ابھی تک دوسرا فائر کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ ایک ایک گولی سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ جانے کب صورتحال کیا رُخ اختیار کر جائے۔ دونوں جس راستے سے کھیت میں داخل ہوئے تھے اُسی راستے سے باہر نکل آئے۔ فائرنگ جاری تھی۔ خان سمجھ سکتا تھا کہ وہ لوگ کھیتوں کے اِس سلسلے

کو گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گے اور کافی دیر تک یہیں مغز ماری کرتے رہیں گے۔

اب وہ جُھک کر چلنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ خان نے کمانڈ خود سنبھال لی تھی وہ آگے آگے چل رہا تھا اور شاہد علی اُس کے پیچھے پیچھے ـــــ دن کے اُجالے میں دیکھا ہُوا راستہ اُس کے ذہن میں اُجاگر ہونے لگا تھا اور وہ اپنی یادداشت ہی کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ فائرنگ اُن کے عقب میں جاری تھی۔

○

آدھ گھنٹے کی جان لیوا اور اعصاب شکن جنگ کے بعد وہ بالآخر دُشمن کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ خان کے لیے یہ کھیل نیا نہیں تھا۔

کمار کی موت نے اُس پر تھوڑی دیر کے لیے پژمردگی ضرور طاری کی تھی لیکن دُشمن کے چُنگل سے بچ آنے اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی خوشی کا احساس اُس جذبہ پر غالب آنے لگا تھا۔

دونوں اُس وقت سرحد سے بمشکل ایک فرلانگ دُور تھے جب اچانک اُن کے چاروں اطراف روشنی کا ایک طوفان اُمڈ پڑا۔ دُشمن نے اس مرتبہ ہالٹ پکارنے کی بجائے "روشنی راؤنڈ" فائر کرنے شروع کر دیئے تھے ـــــ صحرا کی وہ رات جیسے یکدم انگڑائی لے کر جاگ اٹھی ہو ـــــ

دونوں نے پناہ لینے کے لیے نزدیکی جھاڑی میں چھلانگ لگا دی، لیکن اب دیر ہو چکی تھی ـــــ کسی بی۔ ایس۔ ایف کے جوان کی سٹین گن سے نکلی تین چار گولیاں اچانک ہی خان کے دائیں پہلو میں داخل ہو گئی تھیں ـــــ اُسے ایک آلاؤ اپنے اندر دھکتا ہوا محسوس ہوا اور وہ لڑکھڑا کر شاہد علی پر گر پڑا۔

○

شاہد علی کو بہت جلد حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

"میرے خدایا!" اُس کے دِل سے آہ نکلی ـــــ "کیا میری ساری محنت اکارت گئی۔ میں عابد خان کو اُس مٹی کا بوسہ بھی نہ دلا سکا جس کے لیے اُس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا"۔۔۔ وہ بچّوں کی طرح سسک پڑا۔ پھر اچانک ہی چونکا شاید عابد خان نے کراہتے ہوئے اُس کو پکارا تھا۔

"ہاں! کہو! کہو! خدا کے لیے کچھ کہو"ـــــ اُس نے روہانسی آواز میں اُسے قریباً جھنجوڑ ڈالا۔ کیونکہ عابد خان کو زبان ہلانے کے لیے بھی بڑا زور صرف کرنا پڑا تھا۔

"شاہد! میرے بھائی! جس طرح بھی ممکن ہو مجھے پاکستان کی سرزمین پر پہنچا دینا ـــ" اُس نے کراہتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔

"تم پاکستان ضرور پہنچو گے عابد خان ـــــ چاہے کچھ بھی ہو جائے"۔ اُس لمحے اچانک ہی اُس کی آواز میں ایک قہر سا جاگ اٹھا تھا۔

دم توڑتے عابد خان کو یہ تسلّی ضرور ہو گئی تھی کہ جتنے اعتماد سے شاہد علی نے یہ بات کہی ہے وہ ضرور اسے پورا کر کے دکھائے گا۔

روشنی راؤنڈ دم توڑ چکے تھے۔

اُس کے چاروں اطراف گولیاں انگاروں کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ لیکن نتائج سے بالکل بے نیاز اُس نے عابد خان کے نیم مردہ جسم کو کندھے پر لادا اور اپنی سرحد کی سمت دوڑ لگا دی۔

○

رینجرز کی وردی پہنے بوڑھا صوبیدار میجر بڑی بے چینی سے سرحد کی جانب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک فائرنگ کی آوازوں نے اُسے چونکا دیا ـــــ! اُس کا دِل دہل کر رہ گیا۔

رائفل ہاتھ میں پکڑے اُس نے سرحد کی طرف دوڑ لگا دی۔ پکٹ پر موجود باقی جوان

بھی اُس کے تعاقب میں باہر کو لپکے ـــــ سرحدی لکیر پر بیٹھ کر اُنہوں نے دوسری سمت ہوا میں فائرنگ کر کے اپنی دانست میں دُشمن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی تھی۔

ـــــ عابد خان کے انسٹرکٹر بوڑھے صوبیدار میجر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ان دیکھی قوت نے اُس کا دِل مُٹھی میں لے کر زور سے مَسل ڈالا ہو ـــــ اندھیرے میں اُس کی بوڑھی آنکھیں چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔

ایک جوان نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی داہنی سمت کسی ہیولے کی طرف اشارہ کیا۔ اُس کے باقی ساتھیوں نے چوکس ہو کر رائفلیں چھتیا لیں۔ بوڑھا صوبیدار میجر فوراً اُس سمت آگے بڑھا۔

اُس نے بمشکل پندرہ بیس گز کے فاصلے سے شاہد علی کو پہچان لیا۔ اب اُس کے کندھے پر لدے اُس کے ساتھی کی شناخت اُس کے لیے مُشکل نہیں رہی تھی ـــــ صوبیدار کا دِل دھک سے رہ گیا۔

"سَر! سَر!"ـــــ اُس کے نزدیک آنے پر شاہد علی سسک پڑا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اب اُسے اپنی ٹانگیں بے دم ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

عین اُن لمحات میں جب وہ عابد خان سمیت لڑکھڑا کر گرنے والا تھا۔ صوبیدار کے عقب سے نمودار ہونے والے چار تنومند ہاتھوں نے اُسے تھام لیا۔

"جلدی کرو۔ فوراً لے چلو اسے"ـــــ بوڑھے صوبیدار نے عابد خان کے خون میں لت پت جسم پر نظر پڑتے ہی اُنہیں چلّا کر حکم دیا۔

مستعد رینجرز نے صورتحال کی نزاکت جاننے میں ایک لمحے کی غفلت بھی نہیں دکھائی تھی۔ وہ عابد خان کو اپنے ہاتھوں پر پھولوں کی طرح تولتے ہوئے پکٹ تک پہنچے تھے۔ پکٹ پر موجود ایک جوان پہلے ہی فسٹ ایڈ باکس تیار کر چکا تھا ـــــ لیکن اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ فیلڈ پٹّی عابد خان کے جسم کے کس حصّے پر رکھے ـــــ!!

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

چارپائی پر لیٹے لیٹے نیم بے ہوش عابد خان کی نظریں جیسے ہی اپنی سمت جھکے بوڑھے چہرے پر پڑیں۔ ایک کرب انگیز مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر جاگ اُٹھی۔

○

"سر! ــــ پاکستان آگیا۔"

"ہاں! میرے بچے! تم اپنے مُلک میں ہو۔" صوبیدار کی آواز بھرّا گئی۔

"سر! م..... مجھے افسوس ہے..... ہم پاکستان کو..... لوٹ..... لوٹنے سے.... بچا نہیں سکے....."

"اوہ" ــــ اُس کے کسی زخم میں اچانک ٹیس اُٹھی تھی: اللہ باقی مُلک کو سلامت رکھے" آمین کہہ کر وہ نڈھال ہو گیا ــــ

"میرے بچے! جو قربانی تم نے دی، وہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے ــــ خدا کی قسم تم ہی وہ گمنام جیالے ہو جو چُپ چاپ اپنی جان، اپنا آج اور اپنا مستقبل ہماری زندگیوں، ہمارے کل اور ہمارے مستقبل کے لیے قربان کر دیتے ہو۔" بوڑھے صوبیدار میجر کی آواز بھرّانے لگی۔

"میرے بچے! تاریخ کبھی بھی یہ نہ جان سکے گی کہ ــــ تم لوگ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور کیا کیا گرانقدر کارنامے انجام دیتے رہے، لیکن ــــ

ــــ ہمارے سینوں میں رقم ہونے والی داستان لہو رنگ آنے والی نسلوں کو چلّا چلّا کر تم لوگوں کی عظمت کی کہانیاں سُناتی رہے گی۔"

"سر!" عابد خان نے کراہتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔ "جس دُشمن سے ہمیں واسطہ پڑا ہے، ہم نے تو اُسے بھلا دیا ہو گا لیکن تقسیم ہند اور آزاد مملکت حاصل کر لینے کے ہمارے گناہ کو اُس نے ابھی تک نہیں بھلایا۔ مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کے بعد اُس کی نظریں اَب اِدھر اُٹھنے لگی ہیں ــــ ہماری آزادی کو اُس نے اپنی جان کا روگ

Very thought Provoking (1)

بنا لیا ہے۔

وہ اِس ــــ لا الٰہ الا اللہ کو پابند سلاسل کرنا چاہتا ہے اور ــــ ہماری یہ کتنی بدنصیبی ہے کہ ہم فضا اُس کے لیے مسلسل سازگار کرتے چلے آئے ہیں۔"

بوڑھا صوبیدار بے بسی سے اپنے جوان شاگرد کی جانب دیکھ رہا تھا اُس کی آواز اب رُک رُک کر آ رہی تھی، وہ صرف یہ سُن سکا:

"سر!" اِس بچے کھچے پاکستان میں ہم صوبہ پرستی کی لعنت کو جنم دے رہے ہیں! کیا اس طرح ایک پاکستان کے ہم کئی ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں؟

ــــ کیا ایک ایک ٹکڑا کر کے ہم اِسے بھی اُسی طرح اغیار کی نذر کرنا چاہتے ہیں جس طرح کہ ہسپانیہ کے مسلمانوں نے آٹھ سو برس کی حکومت کے بعد کیا؟

ــــ کیا آج ہم وہی تاریخ دُہرانا چاہتے ہیں: جب اسپین کی اسلامی سلطنت صرف غرناطہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی؟

"سر!" اُس کی نبضیں ڈوبنے لگیں" ــــ ممکن ہو تو ایک دم توڑتے سپاہی کا پیغام اُس کی قوم تک پہنچا دیں ــــ "خدا کے لیے..... پاکستان کے مزید ٹکڑے نہ کرنا..... ہماری بقا ایک اور مضبوط پاکستان میں ہے ــــ پاکستان کی مٹی کو میرا اسلام ..... لا الٰہ الا اللہ۔"

اُس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

شاہد اور صوبیدار دونوں دیوانہ وار اُس پر جُھک کر اُسے مخاطب کرنے لگے، لیکن عابد خان اُنکی کسی بات کا جواب دینے کے لائق نہیں رہا تھا ــــ وہ قرآنی آیات بڑبڑا رہا تھا ــــ اُس کی یہ حالت دیکھ کر اُس کے سرہانے کھڑے رینجرز کے ایک بوڑھے حوالدار نے سورۃ یٰسین کا ورد شروع کر دیا۔

عین اُن لمحات میں جب وہ اللہ کی طرف سے اپنی راہ پر مرمٹنے والوں کو اجرِ عظیم کی

Scanned by azamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

خوشخبری سُنا رہا تھا۔ عابد خان نے اپنی جان جانِ آفریں کو سونپ دی ـــــ اُس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی ـــــ مسکراہٹ جوں کی توں اُس کے ہونٹوں پر زندہ تھی۔

اچانک ہی آسمان پر ایک خوفناک دھاڑ گونجی۔ جانے کب اچانک بادلوں نے آسمان پر بسیرا جما لیا ـــــ مہموت شاہد علی نے جُھک کر اپنے ساتھی کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اُس کی کھلی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اور بچّوں کی طرح سسکیاں لینے لگا۔

بادل پھر زور سے گرجا۔ آسمان کا کلیجہ جیسے شق ہو گیا ہو۔ ایک زوردار کڑکے کی آواز کے ساتھ بجلی کوندی اور آسمان رونے لگا ـــ!!

بُوڑھے صوبیدار میجر نے اُس لمحے بڑی شدّت سے موت کی آرزو کی پھر اُس کی آنکھ بھی بارش کا ساتھ دینے لگیں۔ پکٹ پر بنی اُس کوٹھڑی میں موجود باقی رینجرز بھی آستینوں سے اپنی آنکھیں پونچھتے باہر نکل آئے۔

○

آدھ گھنٹہ تک آسمان اس جوان مرد کی لاش پر دھاڑیں مار کر روتا رہا ـــ صبح دم بارش رُک گئی ـــ سسکیاں بھرتا آسمان نکھر گیا۔ پکٹ کے ایک کونے میں بنی مسجد کے صحن سے "اللہ اکبر" کی صدا بلند ہوئی ـــ دونوں نیم مردہ انسان عابد خان کو اکیلا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔

مولوی صاحب نے سسکیاں لیتے ہوئے قرآن کی وہ آیات تلاوت کیں جن میں اللہ کی راہ میں شہادت پانے والوں کو ابدی زندگی کا پیغام سُنایا گیا تھا ـــ!

صبح دم بُوڑھے صوبیدار میجر نے عابد خان کا جوان لاشہ جیپ میں رکھا اور کمپنی ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے ـــ جیپ وہ خود چلا رہا تھا۔ شاہد علی اُس کے ساتھ بیٹھا تھا اور عابد خان کے جسدِ خاکی کے ساتھ دو رینجرز بھی سلام عقیدت گزارنے کمپنی ہیڈ کوارٹر تک آئے تھے۔

دمِ رُخصت اُسے رینجرز نے آخری سلیوٹ بھی پیش کیا تھا ـــ اتنی جوان اور دلیرانہ موت پر اُن کے دِل خون کے آنسو بہا رہے تھے۔

○

پاکستان کے ایک دیہات کے اُس قبرستان میں لوگوں کا ایک جمِ غفیر اُمنڈ آیا تھا ـــ یہ لوگ وطن کے شہید کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔

اُنہوں نے اُسے قدرے اونچی جگہ دفن کیا تھا اور جب اُس جوان شہید کے جسدِ خاکی پر مٹّی ڈالنے کے بعد واپس مُڑنے لگے تو ایک گونجدار آواز نے اُن کے قدم تھام لیے:

"پاکستان کے شہریو!"

لوگ رُکے تو اُنہوں نے دیکھا: بُوڑھے صوبیدار نے جُھک کر زمین پر سے بِکھری مٹّی کو مُٹھی میں بھر کر ہوا میں اُچھالا اور قریباً روتے ہوئے بولا:

"وطن کی مٹّی گواہ رہنا! عابد خان نے کسی ایک صوبے کے لیے نہیں ـــ سارے پاکستان کی سلامتی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔"

اس کے بعد اُس کے لیے بولنا دوبھر ہو گیا ـــ وہ اُسی سمت میں واپس پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا قبرستان کے باہر کھڑی جیپ کی طرف چل دیا ـــ شاہد علی اُس کے تعاقب میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

سورج مغرب کی سمت بنی درختوں کی قطار کے اوپر سفر کرتا اب آہستہ آہستہ اُن کے سروں پر آ گیا تھا ـــ ہوا سرسراتے ہوئے نوحہ الاپنے لگی تھی۔

جیپ کے نزدیک رُک کر اُس نے شاہد علی کو قریب آنے دیا۔ شاہد علی اُس کے نزدیک آ کر رُک گیا۔ صوبیدار میجر نے جو اپنی حالت پر قدرے قابو پا چکا تھا۔ دِل گرفتہ شاہد علی کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا ـــ "بیٹا! عابد خان کی شہادت کے ساتھ ہم منزل کی سمت ایک

Scanned by aazamm@UrduFanz.com

aazzamm@yahoo.com

قدم اور آگے بڑھے ہیں ـــــ لیکن ہماری منزل ابھی بہت دُور ہے ـــــ مَیں اب بہت بُوڑھا ہو گیا ہوں ـــــ میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔ چند دنوں کے بعد ریٹائر ہو جاؤں گا ـــــ تم ابھی جوان ہو ـــــ اس سفر کو رُکنے نہ دینا ـــــ جاری رکھنا ـــــ شہید کی روح کو تسکین پہنچانے کا شاید یہی بہترین راستہ ہے ـــــ"

شاہد علی نے اپنی سرخ اور بوجھل آنکھیں اُس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ آنسو کسی بھی لمحے ٹوٹ پڑنے کو تیار تھے۔ صوبیدار نے تڑپ کر اُسے اپنے سینے میں سما لیا۔

یکم فروری ۱۹۸۶ء

لاہور

Scanned by azamm@Urdufanz.com

Azam & Ali

aazzamm@yahoo.com

aleeraza@hotmail.com